

# اخلاقِ نبوی

مقالاتِ مذاکرۃِ ملی اخلاقِ نبوی

کراچی ۱۴۰۲ ہجری

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

مرتبہ حکیم محمد سعید

بمطالعہ دانش پور

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

**PDF** کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 library@mohaddis.com

4161

جملہ حقوق محفوظ

مرتب : \_\_\_\_\_ حکیم محمد سعید

ناشر : \_\_\_\_\_ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس  
ہمدرد سنٹر، کراچی ۱۵

طابع : \_\_\_\_\_ نوید پرنٹنگ پریس، ناطم آباد، کراچی

تاریخ اشاعت : \_\_\_\_\_ ۱۹۸۲ عیسوی

پہلا ایڈیشن : \_\_\_\_\_ ایک ہزار

قیمت : \_\_\_\_\_ ۴۵/۰۰ روپے

✱

www.kitabosunnat.com

## ترتیب

۶	مسعود احمد برکاتی	پیش لفظ
۷	حکیم محمد سعید	خطبہ آغاز و استقبال
۲۳	جناب مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، لاہور	نظام معاشرت
۲۹	جناب مولانا محمد سعید ایڈیٹر ورلڈ اسلامک ٹائمز	نظام تہمتن و مدیریت
۳۸	جناب ڈاکٹر سید محمد حیدر اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد	اسلامی نظام عدل و احسان
۴۵	جناب ڈاکٹر خالد علوی شعبہ اسلامیات، جامعہ پنجاب	تربیت فرد کا بنیوی طریق
۵۹	جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ڈائریکٹر علما اکیڈمی، لاہور	عہدہ نبوی کا نظام تعلیم و تربیت
۷۴	جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بھا	اسوہ رحمۃ اللعالمین : خلق عظیم
۸۱	جناب مولانا سید محمد شمسین ہاشمی دیال سنگھ لائبریری، لاہور	اسلامی نظام عدل کا نفاذ — مشکلات اور ان کا حل
۱۰۴	جناب مولانا عبدالقدوس قاسمی جامعہ پشاور	محنت کا ضابطہ (اخلاق سیرت نبوی کی روشنی میں)
۱۱۴	جناب پروفیسر اسماعیل سیٹھی	اسلامی تعلیمات اور تربیت اساتذہ
۱۲۲	جناب ڈاکٹر سید معصوم علی ترمذی شیخ الجامعہ، جامعہ کراچی	نظام تعلیم و تربیت (اخلاق نبوی کی روشنی میں)
۱۳۱	جناب مولانا محمد طاہر مجلس علمی، کراچی	سیرت محمدیہ کا معاشی پہلو
۱۵۵	جناب مولانا عبدالقدوس ہاشمی	رسول اللہ کی معاشی اصلاحات

- ۱۶۵ جناب الحاج کفایت اللہ  
ڈاکٹر اسکول ایجوکیشن، پشاور
- ۱۷۲ جناب پروفیسر رحیم بخش شاہین  
گورنمنٹ کالج راولپنڈی
- ۱۸۵ جناب ڈاکٹر امان اللہ خاں  
صدر اسلامیات، جامعہ پنجاب
- ۱۹۱ جناب پروفیسر حافظ احمد یار  
سابق صدر اسلامیات، جامعہ پنجاب
- ۲۰۸ جناب ڈاکٹر سید معین الحق  
جنرل سکریٹری، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی
- ۲۱۴ جناب بریگیڈیئر گلزار احمد  
جناب ڈاکٹر احمد محی الدین
- ۲۲۳ شیخ الجامعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی  
جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی
- ۲۳۲ جامعہ پنجاب
- ۲۴۶ جناب ڈاکٹر ایس۔ ایم ذماں  
سابق شیخ الجامعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
- ۲۵۸ جناب پروفیسر اکرام الرحمن  
پرنسپل، اردو سائنس کالج، کراچی
- ۲۶۵ جناب قادی الدین احمد  
سابق چیف جسٹس عدالت عالیہ، مغربی پاکستان
- ۲۷۶ جناب ایس۔ ایم۔ ظفر  
سابق وزیر قانون
- ۲۸۵ جناب محمد افضل چیمہ  
سابق صدر اسلامی مشاورتی کونسل
- تربیت اخلاق میں تعلیم و تربیت کا مقام
- اخلاقی تحریک۔ کیوں اور کیسے؟
- عدل اجتماعی۔ تصور و نفاذ
- اخلاق: نبوت سے اکتساب فیض  
کی شرط اور علامت
- اجتماعی عدل
- میدان جنگ اور اخلاقیات نبوی
- معلم اور تعمیر کردار،  
سیرت طیبہ کی روشنی میں
- اخلاقیات نبوی
- دعوت و تبلیغ: رسول اکرم کا  
عزم و استقامت
- اخلاقی تعلیمات رسول اکرم
- محکومی اور آزادی
- اخلاق نبوی کی روشنی میں  
اسلام کا سیاسی مزاج
- اسلام کا نظام عدل

- ۲۹۸ جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی  
شعبہ اسلامیات، جامعہ پنجاب
- ۳۰۷ جناب مولانا محمد حنیف ندوی  
ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
- ۳۱۸ جناب قاضی مجیب الرحمن  
صدر اسلامیات، جامعہ پشاور
- ۳۳۱ جناب ڈاکٹر جان ایل۔ اسپوزیٹو  
ہارورڈ یونیورسٹی
- ۳۳۶ جناب محمد صلاح الدین  
مدیر تجارت کراچی
- ۳۴۷ جناب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی  
ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ اکیڈمی - جید آباد سندھ
- آجر و اجیر - اخلاقیات نبوی  
کی روشنی میں روابط  
عدل اجتماعی اور اسلام
- اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات
- آنحضرتؐ اور مسلمانوں کا طرز زندگی
- حضور اکرمؐ کا عطا کردہ  
نظام تعلیم و تربیت  
اخلاقی انحرافات کا حقیقی سبب

## حرفِ اوّل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہر دور میں بصیرت افروز اور حیات بخش رہی ہے۔ موجودہ سخت اور پیچیدہ دور میں بھی سیرت کو، خصوصاً اس سے مستفید ہونے والی اخلاقیات کو مختلف انداز سے اور مختلف سطحوں پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے نوی پیمانے پر سالانہ سیرت کا نفرنسوں کا آغاز اسی جذبے سے کیا ہے۔ ربیع الاول ۱۴۰۲ ہجری میں ہمدرد کی سیرت کا نفرنس کا موضوع اخلاقیات نبوی تھا۔ اس میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے اہل علم و قلم نے مقالات پڑھے تھے۔ ان مقالات کی افادیت کو دوام بخشنے کے لیے جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب نے "مذکرۃ ملی اخلاقیات نبوی" کے دوران ہی اعلان فرمایا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ چنانچہ سوائے ان چند مقالات کے جو مقالہ نگار حضرات نے عنایت نہیں کیے، تمام مقالات کا یہ خوب صورت مجموعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔

اس کتاب "اخلاقیات نبوی" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملک کے ممتاز علما، ماہرین تعلیم، اساتذہ، ماہرین قانون اور اصحاب قلم نے تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، عدل، انصاف، معاش اور معاشی نظام، سرمایہ و محنت کے روابط، امن و جنگ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بحث کی ہے۔

کتاب میں مقالات اسی ترتیب سے پیش کیے جا رہے ہیں جس ترتیب سے مذاکرے میں پڑھے گئے تھے۔ ہم فاضل مقالہ نگار حضرات کے ممنون ہیں۔

۱۴۰۳ ہجری میں جناب حکیم محمد سعید نے ہمدرد سیرت کا نفرنس کا موضوع تعلیمات نبوی کے ضمن میں خودی کا خصوصی مطالعہ منتخب کیا ہے۔ اس کے مقالات بھی انشاء اللہ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کتابی شکل میں شائع کرے گا۔

مسعود احمد برکاتی

ناظم مجلس تحقیق و تصنیف ہمدرد

## خطبہ آغاز و استقبال

عزیزانِ محترم، دانشورانِ معظم، شرکاءِ مذہب، متعلمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ سبحانہ و تعالیٰ، نور السلوک والارض، اول و آخر، الباقی، تجارہ و قدر اور اللہ رحمن و رحیم کا فضل و کرم ہے کہ ہم سب یہاں فضائے اخلاص و اخلاق اور ماحولِ مطہر و مقدس اور حالاتِ خلوص و انس میں جمع ہوئے ہیں اور یہاں موجود و شریک و ذکور و اناث کا مقصد وحید اور مشترک و منشائے واحد یہ ہے کہ ہم سب حمد باری تعالیٰ کریں، اور ہر وہی سنتِ رسولی صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ راہِ علم و عمل اختیار کریں کہ جس پر مراطِ مستقیم کی تعریف صادق آ سکے، وہ مراطِ مستقیم کہ جس کے لیے دعا سورۃ فاتحہ میں تعلیم کی گئی ہے اور اسی کی تعمیل میں ہم اپنی نمازوں کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی استدعا کرتے ہیں اور رہنمائی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

علمائے دین، صاحبانِ قسط و قلم!

میں اپنی جانب سے اور اپنے رفقاءِ مستعد و منظم اور بنیانِ تحریک ”آوازِ اخلاق“ کی طرف سے قلوب کی گہرائیوں اور رُوح کی حرارتوں کے ساتھ آپ کا پُر خلوص اور پُر جوش استقبال کرتا ہوں اور خوش آمدید کہتا ہوں۔

اللہ ذوالجلال والاکرام کا شکر گزار ہوں کہ اس ذاتِ اقدس نے مجھے اور میرے رفقاء سے محترم کو توفیق عطا فرمائی کہ ہم اس مذاکرۂ علمی اخلاقیات نبوی میں، کہ جو اپنی نوعیت کا اولین اجتماعِ ملی ہے، آپ کو دعوتِ شرکت دیں۔ اور اب میں یہ خلوص و احترام اور یہ صمیم قلب مندوبینِ ذوی اعتدال اور شرکائے واجب الاحترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت الی الخیر کو قبول فرمایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

حاضرینِ محترم و خواہینِ مکرم!

آج بوجہ ہمارے اس اجتماعِ ملی و دینی کا مقصد وحید اور منشائے ملی یہ ہے کہ ہم اسلامی مملکت پاکستان میں اخلاقِ ملت کا ایک حقیقت پسندانہ اور دیانت دارانہ جائزہ لینے کی خدمت سرانجام دیں۔ اور اس مذاکرۂ علمی اخلاقیات نبوی کا اشتہارِ معصوم بلا خوف و دلا تا مل یہ فرض ادا کرنا ہے کہ آج اس مملکت اسلامیہ کے ہر شعبہ زندگی میں انخطاطِ طاقتِ اخلاق اور اس کی کیفیات و کمیات اور اس کے اسباب کا جائزہ لے کر اس کا علاج تجویز کیا جائے اور یہ علاج جامع و



مانع ہو اور کلیتہً اور لفظاً معنایاً آیات قرآن کا آئینہ دار ہو اور سنت نبوی کا عکاس ہو اور ایسا صلہ ہو کہ اس سے ملت کا ہر فرد فیض حاصل کر سکے۔ اس سے فزوقِ جرات نہ عالم کر سکے اور نہ پائل۔ مختار ہو کہ مجبور، ہر فرد بشر اس کا پابند ہو۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ملتِ پاکستانیہ حیثیتِ مجموعی اخطا طِ اخلاق کی شدید و آہنی گرفت میں ہے۔ میں فی الوقت اس سے بحث نہیں کروں گا کہ اس صورتِ حال کے اسباب و علل کیا ہیں اور وہ ملت کہ قیامِ پاکستان کے وقت اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک ایثار و قربانی اور پابندیِ احکامِ ربانی کا نمونہ بنی رہی، اور تعمیرِ وطن کے جذباتِ مقدسہ سے سرشار اور تحفہ ملی کی تحریک کے لیے مستعد و متحرک اور طرزِ اسلامی کے لیے جان نثار، وہ رفتہ رفتہ کیسے اسلامی اخلاق کو خراب و کمزور گئی اور ذوالِ اخلاق کو کیسے اس نے اپنا لیا اور فرائضِ ملی سے وہ کیسے غافل ہو گئی، اور نظریہٴ حیاتِ ملی سے کیوں کنناہ کش ہو گئی؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ داستان طویل ہے اور بڑی تلخ۔ اس صورتِ حال کے اسباب میں نہ ہم نظامِ تعلیم کی ہر جہتِ خرابیوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم اربابِ بست و کشاد کی واضح و صریح کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر سکیں۔ اسبابِ فاسدہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ایک عظیم و شیعہ ملت کو جو سرِ بلندیِ اسلام اور سرِ فرازیِ مسلمین کے لیے عزمِ بلند اور قصدِ قوی کے ساتھ میدانِ عمل میں اتری تھی وہ پسپا ہو کر تکبیت و ناکامی کے قعرِ مذلت میں جا گری، اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنے اس حال پر شرمِ سادہ سے نہ شرمندہ و آزرده۔ اسے نہ یہ رونما ہے کہ حالات نے اور اس کے منفی طرزِ فکر نے اس سے اس کا مقامِ بلند چھین لیا ہے اور نہ اسے یہ فکر دامن گیر ہے کہ اس کے انتشارِ ذہنی و فکری اور اس کے لازمی نتیجے میں انتشارِ ذاتِ فراقِ ملی نے اس سے فکری آزادی چھین لی ہے۔ اور تو ملی آزادی کے لیے شدید خطرات پیدا کر دیے ہیں اور صفِ اقوام و مللِ عالم میں پاکستان کا مقامِ غیر متعین کر دیا ہے اور غیر شخص۔ صاحبانِ فکر و نظر اس کے شاہد ہیں اور گواہ، اور عام افرادِ ملت بھی واقف کہ میں اس صورتِ حال کو عرضِ دراز سے اور بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن سے درخواست کرتا رہا ہوں کہ ان مرضِ شناسانِ ملت کو چارہ گری کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور دینیہ مرض کا سامان کرنا چاہیے۔ اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قلم کو حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور پوری گہرائی اور گہرائی کے ساتھ حماسہ کر کے فکر و نظریہٴ پوری توانائیوں کے ساتھ اور قلم کی پوری طاقت کے ساتھ اس عظیم ملت کو قعرِ مذلت سے اور تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہیے اور نور آشنا کرنا چاہیے۔

حالات ہیں کہ دُشمنِ بدلتِ خراب ہو رہے ہیں، اخلاقی مسائل ہیں کہ روز بروز بدل کر شدت اختیار کر رہے ہیں۔ بدی کی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں اور فزوانِ سامان کے ساتھ اخلاقِ ملت کے تار و پود بکھیر دینے کا فہم نہ کر چکی ہیں بہت

سے قلم اپنی عصمتوں کو پامال اور فروخت کر چکے ہیں اور بہت سے اذہان کا سر عام بیلا ہو چکا ہے۔ دنیا سے علم و ادب مٹوٹا رہا ہے، ادب ہو رہی ہے اور میدان صحافت میں باغیانہ اور غیر دانش مندانہ اور سو قیاذہ انداز دیکھے جا رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ میں منفی مظاہر صاف طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ پاکستانی مدارس میں ایک دو نہیں متعدد دکتیاں ہیں، اردو ہی میں نہیں، ملک کی ہر زبان میں خلاف شرع و اسلام اور خلاف نظریہ حیات مقلی سالہا سال سے پڑھائی جاتی رہی ہے۔ یہ کتنا بیکھنے والے کون تھے یا کون ہیں؟ ان کو داخل نصاب کرنے والے کون تھے یا کون ہیں؟

کیا اخلاقی محاسبے اور تجربے کا اصل و صحیح میدان اس کے سوا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں، اور میں یقین محکم رکھتا ہوں اور آپ بھی کہ محاسبے کا یہ فرض صرف وہی ارباب فکر و نظر ادا کر سکتے ہیں کہ جو نظریہ حیات مقلی پر یقین محکم اور ایمان کمال کے ساتھ قائم ہیں۔ اور یہ محاسبہ وہی قلم کر سکتا ہے جس کو ہاتھ میں رکھنے والا پاکستان کا دوست ہو اور اسلام کا بے خوف۔ اور بہادر سپاہی ہو اور یہ محاسبہ ہر وہ فرد ملت کر سکتا ہے کہ جو حرف اللہ سے ڈرتا ہو اور پھر دنیا کی ہر طاقت کا باغی ہو۔ اور یہ محاسبہ وہی اہل دل اور صاحبان ایمان کر سکتے ہیں کہ جو سر بلندی اسلام اور سر فرازی مسلمان کے جذبات مقدس سے سرشار ہیں۔

من حیث المجموع ملت طاؤس در باب اول و آخر کی قائل نظر آتی ہے۔ اندرون ملک جو سیاسی خلفشار اور جو مقلی انتشار ہے اور جو ذاتی اختلافات ہیں اُس پر مشرود وہ بدیہی خطرات ہیں کہ جو پاکستان کی سرحدوں کے چاروں طرف سراٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ سیاسی و نظریاتی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت کی ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

پاکستان میں خیر کی طاقتیں ہیں مگر خفہ و خوابیدہ ہیں۔ باور کرنا چاہیے کہ رُخوشی اور گراں خوابی کا یہ وقت نہیں ہے بلکہ خیر کی ہر طاقت کو عقل و ذہن و فکر، طاقتوں کے ساتھ اور فکر و نظر کی پوری بالیدگی کے ساتھ اور قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ سرسبز عمل ہو جانا چاہیے۔ میں اسلام و سیاست کو جدا نہیں کرتا، مگر جو سیاست اخلاق سے عاری ہو اور کردار سے محروم، میرے نزدیک وہ سیاست نہیں ہے، کثافت ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ گزشتہ ۳۵ سالوں سے سیاست پاکستان کے مرض کی دوا بن سکی اور وہ سیاست بھی بُری طرح مالت کھا گئی ہے کہ جو اقتدار اور اسلام کا ہم معنی بنانے پر معرزی ہے، اور وہ سیاست بھی پٹ چمکے ہے کہ جو مذہبی فرقہ بندیوں پر پروان چڑھتی تھی۔ اس سیاست کا بھی تیا یا نچا چشم فلک نے دیکھ لیا ہے کہ جو نظریہ حیات مقلی کے پرچھے اٹاؤ بننے کے درپے تھی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہر سیاسی بازی گری نامکام ہو چکی ہے اور اب تقاضائے وقت یہ ہے کہ عاری از ذکر و سیاسی بازی گری کو خیر باد کہہ دیا جائے اور سلامت ردی کو اختیار کیا جائے اور دیانت و امانت کی حکمرانی کو اپنایا جائے۔ اور تعمیر وطن اور تعمیر اذہان اہل وطن پر توجہات اور توانائیاں

مرکوز کی جاتیں۔

یہ بنیادی نکتہ تو یہ ہے کہ پاکستان کو لازماً ایک مملکت اسلامیہ رہنا چاہیے اور ایسی مملکت اسلامیہ کہ جس کا دستور قرآن ہو اور جس کا اصول سنت رسول ہو۔ حاکمیت بس اللہ کی ہو اور اس کرۂ ارض کی ہر شے کو اللہ کی ملک تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کے ہر فرد بشر کو اسلامی زندگی گزارنی ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق اپنے اعمال و کردار کو ڈھانسا ہے۔ اخلاق کو سب سے بڑا مقام پاکستان کی زندگی میں حاصل ہونا چاہیے۔ جو افراد ملت اس راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ان کو راہ راست اور مراد مستقیم پر لانے کا فرض بھی اور اگر نیلوا ہے اس مستمر و قطعی غیر اخلاقی اصول کی روشنی میں اور پاکستان میں شدید زوال اخلاق کے پیش نظر ملت کے ہر فرد کو فکر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اس کے فرائض کیا ہیں؟

خیانت و کذب اور حرص و حسد، غرور و نخوت، نفاق و غیبت، بدگمانی اور عیب جوئی جیسے آلام و امراض نعمت کا علاج کیا ہے۔ میرا ملی فرض مجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ میں ان آلام پر انحصار کے ساتھ غلہ دار بنے کروں۔ اور یہ بتاؤں کہ جب اخلاقی امراض کسی فرد یا کسی جماعت میں پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کے اثرات و نتائج کیا نکلتے ہیں اور ان سے فرد و معاشرہ کس کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے بعد میں توقع رکھتا ہوں کہ صاحبانِ نظر یہ فیصلہ خود خود فرمائیں گے کہ ان امراض کی موجودگی میں پاکستان معاشرہ کن خطرات سے دوچار ہے۔

## چند اخلاقی امراض

### خیانت

آج کے معاشرے کے انحطاط اخلاقی اور انتشار و پرالگندگی کے اسباب و محرکات کی فہرست میں خیانت سب سے حد اہم سبب ہے، یہ انسانی روح کو مکمل زور و فکر کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشری اور اجتماعی قوانین کی مہارت کو منہدم کر دیتی ہے۔ تعاون اور حقوق باہمی کی نگہداشت سے حسن معاشرت ابھرتا ہے۔ اجتماعی نظام کی بنیاد حقوق اور فرد و جماعت کے رابطہ باہم پر ہے۔ خیانت کرنے والا ان سارے حقوق کو پامال کرتا ہے اور معاشری قوانین کی خلاف ورزی کر کے اپنے غیر تربیت یافتہ ہونے کا اعلان کر لیتا ہے۔ نفاق، زلت، رسوائی اور سچی کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایک تاجر خیانت کی راہ سے ذلت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ مزدور و ملازم خیانت کی دھڑ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ ذمہ داریوں کے احساس کے بغیر عظمت اور سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری اہم ترین ذمہ داری محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ دیانت ہے اور خیانت اس کی ضد!

## کذب

سچائی کی طرح جھوٹ کے بھی مختلف روپ ہیں۔ اگر انسان کی دُورِ اس گندگی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے فضل و کمال کا تناؤ در درخت بے برگ و ثمر ہو جاتا ہے، اس کے اخلاق کی ساری پتیاں اس کی شخصیت کے شجر سے اس طرح گر کر کبھ جاتی ہیں جیسے موجِ خزاں سے تخریبِ چین ہوتی ہے۔

جھوٹ تنہا ایک بُرائی نہیں ہے، بلکہ بہت سی دوسری برائیاں بھی اس کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔ بیشتر اخلاقی برائیوں کے بے شمار نام دراصل جھوٹ ہی کے مختلف روپ ہیں۔ خیانت جھوٹ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کذب سے ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے، محبت و یگانگت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور نفاق کے زہریلے ناگ چاروں طرف پھینکارنے لگتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والے سچائی اور سادگی کو مغلوب کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے، خوش نما لفظ، چرب زبان اور مصنوعی شیریں سیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ سادگی اور حقیقت کو اپنے سحرانگیز اسلوب سے مغلوب کرنا چاہتے ہیں، حال آنکہ سادگی کا جمالِ ابدی ہے۔

جھوٹ بولنے والا اپنے انجامِ کار پر غور نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے پُرفتن ہونے کی خبر کسی کو نہیں، حال آنکہ اپنی باتوں کے تضاد اور اپنی دروغ بانی کی وجہ سے رسوائی، ندامت، اور عبرت انگیز ذلت کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔

## حرص و طمع

جس دن سے انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع اور طویل ہوتا جاتا ہے بعض ضرورتیں تو ایسی ہیں کہ اُن کا تعلق بقا اور زندگی کے تحفظ سے ہے، انھیں فطری ضروریات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جاسکتی، لیکن بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی تکمیل کی کوئی منزل نہیں، ان کی دُکوتی حد ہے نہ غلیظت۔ ان کو خواہش ہے جیسے جاکنا چاہیے۔ انسانی تاریخ بتانے سے قاصر ہے کہ کب تک کسی کی ایسی ساری خواہشات پوری ہوتی ہوں۔ اسی آرزو سے نہایت کوحرص کہتے ہیں، تشنگی اس کا انجام اور ناآسودگی اس کی تقدیر ہے۔ دنیا کے کسی بلند ہام پر اس کا کوئی آئینہ نہیں۔

حرص انسان اور حرصِ معاشرہ مادی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو ہمال کرتا ہوا دیوانہ وار دلچسپا گستا چلا جاتا ہے۔ اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ فلاح و کامرانی یہ نہیں ہے کہ ایک فرد دوسرے پر یا ایک معاشرہ دوسرے معاشرے پر مادی اعتبار سے سبقت حاصل کرے، تاریخی فلاح یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کی سلامتی کا ضامن بن جاتے اور حرص و طمع سے بلند ہو کر اجتماعی مفاد کا پاسبان بن جاتے۔

### حسد

حسد ایسا بدترین جذبہ ہے کہ اس کے اثرات کا جائزہ لینا دشوار ہے۔ معاشرے کے اسی فی صد جرائم کا محرک ہی سیاح جذبہ جس کو حسد کہتے ہیں، اگر آپ غور کریں تو قلب انسانی کی مثال صحرا میں ایک ایسے چھوٹے شہر کی سی ہے جس کے گرد کوئی فصیل یا قلعہ نہیں، نیکیوں کا رہزن اپنی غارتگری سے اس شہر کو چشم زدن میں تاراج کر سکتا ہے۔ شہر دل کی رونق کے اور جمال کے دشمنوں میں حسد سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے دھجے دل و زبان و تباہ ہو جاتا ہے، عمل کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ ناکامی و محرومی کی آتش سوزاں حسد کی تقدیر بن جاتی ہے۔

### غزور و نخوت

انسانی اخلاق کا مذموم پہلو غزور و نخوت ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں ہوتا ہے کبھی کبھی افراد ہی نہیں پورا معاشرہ نشتر نخوت سے سرشار ہوتا ہے۔ عام طور پر غزور و نخوت کے مرض میں وہ لوگ گرفتار ہوتے ہیں جن کی پرورش و پرداخت تنگ و تاریک ماحول، اور غیر اخلاقی روایات کے گہوارے میں ہوتی ہے۔ وہ جب باہر کی دنیا میں، صاف پتھر سے جھول اور پاکیزہ اخلاقی فضا میں آتے ہیں تو انھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ وہ اپنی اس محرومی کے لیے اپنی سیرت و کردار کی مناسب تعمیر کے بجائے غلط طور پر اپنے شرف و برتری کا پردہ پیٹھا کرتے ہیں۔ حال آں کہ جسے واقعی فضل و شرف حاصل ہے، اُسے اس کے اعلان و اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غزور کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ معدوم کو موجود سمجھیں۔ صحت مند ذہن کی علامت یہ ہے کہ وہ خیالی حدود و قیود سے آزاد ہو، خواہشات اور توقعات کا سیر نہ ہو، اس لیے کہ یہی راستے کبر و غرور کی طرف جاتے ہیں۔

### نفاق

ہمارا معاشرہ دیا اور نمائش کے ہلکے مرض میں گرفتار ہے اور یہ نفاق ہی کا ایک پہلو ہے، اس لیے کہ ظاہر و باطن میں جب مطابقت نہیں ہوتی تو قول و عمل اور فکر و کردار میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ نفاق کی دیکھ جب نظام اجتماعی کے ستونوں کو چاٹنے لگتی ہے تو ساری عمارت منہدم ہو کر نمونہ عبرت بن جاتی ہے۔ افراد کا افراد سے تضاد، اقوام کا اقوام سے تضاد، یہ جنگ و پیکار اور رست و شیر سب کچھ نفاق ہی کا نتیجہ ہے۔ نفاق کوئوں کے لیے پیام مرگ ہے۔

### غیبت

غیبت انسانی خوبیوں کی عمارت منہدم کر دیتی ہے، اور اخلاق کے سارے ستونوں کو خشک کر دیتی ہے معاشرے پر اس کے ہولناک اثرات ہیں یہ بھی ہے کہ افراد کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور کبھی کبھی اس

کے شعلے سارے معاشرے اور بسا اوقات پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں، غیبت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، حسد، مکر، سوئے ظن کی دہی ہوئی جنگاری غیبت پر ابھارتی ہے، لیکن ترغیب کرنے والا شاید نہیں جانتا کہ اس کا ہر لفظ خود اس کی شخصیت اور اس کے شیعہ عفت کے لیے تیشہ ثابت ہوتا ہے اور وہ لوگوں کی نظروں میں خفیف ہوتا ہے۔

### عیب جوئی

جس طرح حین ظن ایمان کی شاخ ہے، تجسس نفاق کی شاخ ہے۔ منافق کو اپنے بھائیوں کے رنج و غم کی پروا نہیں ہوتی اور دُردار انسان اپنے بھائیوں کے ساتھ حین ظن رکھتا ہے اور ان کے مفاد کی نگراں کرتا ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا منافق یہ نہیں جانتا کہ اس طرح وہ اپنے عیوب سے صرف نظر کر رہا ہے، اپنے دل کو اندھا اور جسم کو خستہ و مضمل کر رہا ہے سب سے کم زور انسان وہ ہے جو دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے اور اپنی اخلاقی برائیوں کو چھپانے کا ایک بہانہ تراشتا ہے۔ وہ انسان بدترین ہے جو دوسرے افراد کی سیرت و کردار کی تہوں میں جھانکنے اور عیب نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

### بدگوئی

بعض افراد با اختیار شخصیتوں کے سامنے دوسروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ ان کی بدگوئی کا مقصد اس با اختیار شخصیت کو منحرف کرنا اور دوسروں کو اس کی نظروں میں حقیر درسا کرنا ہوتا ہے۔ یہ باتیں پہلے تو لطف مجلس کے طور پر شروع ہوتی ہیں، لیکن آگے چل کر بہت سے فسادات کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ بدگوئی اخلاقی پستی اور انحطاط کے دور سے کوگز رہا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک اخلاقی انحطاط اس با اختیار شخص کا ہے، جو چغل خوردی کی باتیں سُنتا ہے اور بدگوئیوں کو اذنِ باریابی عطا کرتا ہے۔

### بدگمانی

ہر انسان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، آنکھوں سے وحشت اور رفتارِ گفتار سے سراپگی نمایاں ہے۔ زمینِ اعتدال سے غالی، شیعہ قلب سوئے ظن سے مکدر۔ اپنے سائے سے ڈرنے والا انسان، شاید اپنی کم زوریوں کے تجزیہ سے قاصر ہے، اسے اعتراف نہیں کہ اپنے ذہنی و فکری انتشار کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ ہر شخص سے بدگمان ہو کر اپنی متاعِ حیات لٹا بیٹھا ہے، اب اس کی شخصیت اور قامت نامکمل رہے گی اور نشاد و مرستہ کے جذبے سے اس کا دل کبھی آشنا نہ ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ پھول حین ظن اور اعتماد کی شاخِ رعنا پر کھلتے ہیں۔ بدگمانی اور سوئے ظن کے

ریگستانوں میں تو چنگاریوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انتشارِ شخصیت نئی تہذیب کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ ہے، مگر کھن کر یہ نہیں کہا جا رہا کہ یہ انتشار اس بدگمانی اور اعتمادِ باہمی کے فقدان کا نتیجہ ہے جو جدید عالمی تہذیب کا بدترین مرض ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے اور دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہو جا رہا ہے، وہ اپنے عدم تحفظ کے احساس کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ زمانہ برسرِ پیکار ہے، حال آں کہ دوسروں سے بدگمانی خود اس کی جارحیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

جسدِ ملت کو گھٹن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر دینے والی یہ اخلاقی بیماریاں جن میں سے بعض کا ذکر میں نے کیا ہے۔ انھوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جو جو اور جس جس طرح نقصانات پہنچاتے ہیں اور ان نقصانات کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ تو سب اہل دانش پر عیاں ہیں اور سب ہی ان کا احساس رکھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی بیماریوں نے ایک مجموعہ بن کر جو ایک عام مرضی کیفیت ہمارے معاشرے پر طاری کر دی ہے اور ایک بیمار فضا ہم پر عادی ہو گئی ہے وہ ہے انتشار و افتراق کی۔ ایک ملت کے افراد ہونے کے باوجود ہم منتشر ہیں، جب کہ اس ملت کا مقصد وجود یہ بتایا گیا ہے کہ سارے عالمِ انسانیت کی شیرازہ بندی کرے گی۔ اپنے مقصدِ حیات سے حیثیتِ مجموعی ملت کے اور انفرادی طور پر افرادِ ملت کے دور ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملت گرد ہوں، بٹ گئی ہے اور ہر گروہ بلکہ ہر فرد خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ ملت کہ جو سیدہ پلائی ہوئی دیواری کا مندرجہ جاتی تھی اس کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا ہے کہ اس کا ہر فرد شدید احساسِ تنہائی کی گرفت میں ہے۔ تنہائی کا احساس ایک نفسیاتی مرض ہے جو طرح طرح کے اخلاقی اور سماجی مسائل پیدا کرتا ہے، اور آج ہم مسائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

تنہائی ایک اہم معاشرتی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی بد نصیبی ہے کہ اس بھری دنیا میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے، لیکن انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فرد کا گلشنِ اخلاق جب ویران ہوتا ہے تو محبت، وفاداری اور اعتماد کی ساری شاخیں بے برگ و ثمر ہو جاتی ہیں اور گلشن کی تباہی اور تاراجی کا اعلان کرنے لگتی ہیں۔ آسمانوں پر کچھ نہ ہونے والے انسان کو قوت اور عجز و درنا مندی کا مغموم سمجھنا چاہیے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اُس شخص سے زیادہ عاجز اور بے بس کوئی نہیں جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ یہ انسان کے سوتے خلق کی علامت ہے اور اخلاق کی بھیناک تباہی یہ ہے کہ وہ دوست کو یا کر ضائع کر دے۔

حاضرینِ کرام!

میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابتدائیں پاکستان کا جو لفظ اخلاق پیش کیا اس کا یہی تقاضا یہی تھا کہ میں

احتیاط و اختصار کے ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کروں کہ جو پاکستان میں انخطاط اخلاق کے ذمہ دار ہیں، اور یہ بتاؤں کہ ان عوامل نے جن پاکستان کو کس طرح خزاں رسیدہ کیا ہے۔ اہل دل کے سامنے میں نے حال دل کہنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ میرے مخاطب فقط وہی نہیں ہیں کہ جو یہاں موجود ہیں، میں ان زعمائے بھی مخاطب ہوں کہ جن کو دعوتے رہنمائی ملت ہے اور میرا خطاب اس گروہ سے بھی ہے کہ جس نے اس وطن پاک میں بار بار بیت اقتدار کو روپ دھارا ہے اور اس مملکت پاک میں خرمین امن و راحت کو تاراج کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں چشم فلک زندگی کی جگہ سکوت و سلامتی کی جگہ اضطراب، لغز نشاط کی جگہ شور و ماتم، زمرہ سخی کی جگہ نوح خوانی دیکھ رہی ہے۔

تمہیں بد وقت کی بہشت اور علم و حلم کے مرغلز معدوم ہوتے ہیں۔ اور پھر قیامت یہ برپا ہوتی کہ ہم نے افراد ملت کو تہذیب کے راستے پر ڈال دیا، شک میں مبتلا کر دیا اور بد عملی کے جال میں پھنسا دیا۔ یہ تین دھاری انوکھا سفر اُس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ثابت ہوا جس کے گھاؤ کی کہانیاں ہم سننے رہتے ہیں۔ حالات ایسے پیدا ہوتے کہ ذوق سے فرار اور سنت سے انغماض معمولاتِ حیات میں شمار ہوتے۔ فکری آزادیاں سلب ہوتیں اور قومی آزادی کے لیے ہزار خطرات پیدا ہوتے۔ صحت و حرمت کو چُن چُن کر برباد کیا تو اس کا نام بہت شکنجہ کھا گیا۔ انسان سوزی کا نام حیاتِ نو قرار پایا۔ جیسا سوزی کا عنوان عصمتِ وطن پڑا۔ آزادی کا تصور مسخ ہو گیا اور عز و شرفِ انسان معدوم ہوا۔ مسجدوں کے مینار جھک کر سوال کرنے لگے کہ اے اہل پاکستان اور اہل اسلام! تم نے اپنے تاریخ کے صفحات کو کمان گرم کر دیا ہے؟ مہملانِ حرم! کیا تم نے پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ تم اس قلعہ اسلام کو اپنے ہی ہاتھوں سدا کر دو؟

### آوازِ حق

ایسے سخت حالات میں ایک ایسی آوازِ اخلاق کی ضرورت ہے کہ جو ہم نیند کے ماتوں کو جگا دے اور آواز دے:

اے مسلمانانِ پاکستان!

تمہارے لیے منزل ایک ہی ہے، راہ بھی ایک ہی ہے۔ یہی راہ تم کو نذر نشوں سے بچا سکتی ہے، یہی راہ چشمِ نگران کا کام کر سکتی ہے۔ جب کبھی تمہارے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے چھینے لگیں اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں تو اس چشمِ نگران کا تصور کرو۔ بصیرت کی آنکھیں کھولو اور یاد کرو انسانیت کے اُس قافلہ عظیم کو جو عرب کے بے آب و گیاہ وادی سے چلا تھا، جس نے بد اخلاق کے گھٹا ٹاپ اندھیرے میں ایمان کی شمعیں جلائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کو صداقت کی روشنی سے منور کر دیا۔ مسلمان جب بھی مصائب و آلام کا شکار ہوتا ہے قرآن کی یہ صدا اس کی سماعت کو سکون و سرور بخشتی ہے:



امن یجیب المفسر اذا دعاه ویكشف السور ویجعلكم خلفاء الارض

اللہ مع اللہ قلیلا ما تنکرون اتن یہیں یکم فی نظامات الس

والبحر ومن یرسل الریاح بشرا بن یری رحمتہ اللہ مع اللہ

یعنی: کون ہے کہ جب ایک مفسر اور بے قرار روح اس کو پکارتی ہے تو اس کی فریاد سنتا ہے، اور

اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے؟

کون ہے کہ جس نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا اور اس کی وراثت بخشی؟

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟

پھر بتاؤ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے اور بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں

کو شدت کے لیے بھیج دیتا ہے۔

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟

اس دار فانی میں جب کبھی کسی بنی آدم نے اصلاحِ حیات کی کوئی منزل طے کی ہے تو صرف اس ہاتھ کی رہنمائی

سے اور جو اس کی رہنمائی میں آگیا پھر اس کے لیے گمراہی نہیں۔

فمن یرد اللہ ان یرس یہہ یرشح صدرہ للاسلام فہو علی نور من

ربہ فویل للقاسیۃ قلوبہم من ذکر اللہ ۵

یعنی: ”اللہ جب کسی شخص کو راہِ راست پر چلانا چاہتا ہے تو اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور

جس کا دل کھول دیا گیا تو پھر وہ اپنے پروردگار کی روشنی کی ہوتی شعلِ ہدایت اپنے سامنے پاتا ہے۔ مگر

افسوس ان لوگوں پر جن کے دل ذکرِ الہی سے غافل ہو کر سخت ہو گئے ہیں۔“

پاکستان میں زندگی کے مدد و سال انتہائی کشمکش میں گزارنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد

جن کام میں نے ابھی اوپر حوالہ دیا ہے اگر آج امید کی کوئی کرن پھوٹی ہے اور انقلابِ فکر اور تبدیلی کے آثار

نظر آتے ہیں تو ان پر احتیاط کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اسلام کے لیے جو تبدیلیاں لانی جا رہی ہیں ان کے ساتھ چل کر

دیکھنا چاہیے۔ بے شک ستارے ٹوٹ گئے ہیں مگر سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لینی چاہیں اور ان کو

اندھیری راتوں میں بچھا دینا چاہیے۔

میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہم ہمارے امتداد کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں اور کاسرٹیفکیٹ کی زندگی اختیار کریں۔ مگر کچھ اچھے نقش و نگار نظر آ رہے ہیں۔ اگر نفاذ شریعت اسلامی کا آج غلغلہ بلند ہوا ہے تو اس کی حقیقتوں کا دیانت دارانہ جائزہ لینا چاہیے اور قافلے کو صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اخوانِ عزیز!

ہمیں آج ایک عہد کرنا چاہیے کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وطنِ پاک کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر اچھوڑے نہیں گئے۔ میں آپ کو یاد دلانا ہوں کہ آج ہم زلزلوں سے ڈرتے ہیں، مگر کبھی ہم خود زلزلے تھے۔ ہم آج اندھیروں سے کانپ رہے ہیں مگر کبھی ہم اجالا تھے۔ آج ہم بھیٹ جانے کے خدشے سے احتیاطیں برت رہے ہیں، ہم یہی تھے کہ سمندر میں اتر گئے تھے پہاڑوں کی چھاتیوں کو ہم ہی نے روند ڈالا تھا، بجلیاں جب آتیں تو ہم ان پر مسکراتے۔ بادلوں کی گرج کا قہقہوں سے ہم نے جواب دیا تھا۔ صحرانظر کو اس کا رخ پھیر دیا۔ زلزلے تو کیجیے کہ یہ ایمان کی کیسی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریباؤں سے کھینچنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار فروخت کر رہے ہیں! اور اللہ سے اس درجہ غافل کہ جیسے اُس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

### تلاشِ حق

باعمل، فعال اور تعمیری ذہن رکھنے والی شخصیتیں لایحی اور غیر مفید کاموں میں اپنی قوت ضائع نہیں کرتیں، انھیں اپنی غفلت کا خود بھی شعور ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ کون سا کام ان کے شایانِ شان ہے اور کون سا کام ان کے مقام و مرتبہ سے فرورتر۔ ان کی تنقیدوں میں متانت ہوتی ہے، وہ دوسروں کا مذاق نہیں اڑاتیں، انھیں معلوم ہے کہ تشنہِ ایجابی طرزِ عمل نہیں، بلکہ منفی انداز ہے، مثبت طرزِ عمل غلطیوں کی دردمندانہ اصلاح ہے۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنے والی شخصیت ایجابی کسی جاتی ہے مگر ہمارے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مثبت طرزِ فکر اور ایجابی طرزِ عمل کے مقابلے میں منفی طریق کار، اور منفی نقطہ نظر رکھنے والی شخصیتیں ہی زیادہ حاوی ہیں، یہ ذرا کا نہیں بلکہ معاشرے کا ذہنی افلاس ہے۔ ہمیں اس صورتِ حال کا مدد کرنا چاہیے۔

اس ہنگامہ ہستی میں انسان کو سکونِ قلب کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جس کے بغیر محرکِ حیات سر کرنے کی کوششِ ذلت انگیز شکست کے سوا کچھ نہیں، آج انسان اپنے ذہنی خوفان کی موجِ مضطرب میں اسیر ہو کر دیوانہ وار چرخ رہا ہے کہ مجھے بچاؤ۔ سکون و طمانیت کے چمن کی جستجو ہر انسان کی ضرورت بن چکی ہے مگر اسے گلستانِ

امن تک رسائی نہ دولت و ثروت سے ہو سکتی ہے نہ شہرت و اختیار سے، بلکہ صرف اخلاقی اور انسانی خوبیوں سے۔ سکون کا مرچہ اخلاق ہی ہے اور اس کے انحطاط نے تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود ہمارے دل کا قرار چھین لیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ انسان اپنے طرز حیات پر ناقہ نہ نظر ڈالے اور یہ سوچے کہ اُس نے کیا کھویا، اور کیا پایا؟

صدقت اور خلوص روح و قلب کا جگمگائی دنیا کی بڑی دل کش شے اعلیٰ ہیں اور جو شخصیت اپنے دامن میں ان پھولوں کی دھک رکھتی ہے وہ بے حد مجاذب ہوتی ہے۔

کسی فرد کی سچائی اور اس کا خلوص کسی دیرانے میں کھٹنے والا پھول نہیں ہے بلکہ چمنستانِ عالم کا وہ پھول ہے جس کی شگفتگی اور رعنائی سب کے لیے جنت لگاہ ہوتی ہے۔ صدق و صفا سے صلح کی فضا پیدا ہوتی ہے، باہمی اتحاد پیدا ہوتا ہے اور اس اخلاقی صفت کی بنا پر ساری قوم ایسی ناقابلِ تسخیر و تسلیم بن جاتی ہے کہ وہاں کسی سوچ بلا کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

ہر فرد کے لیے یہ فردی ہے کہ وہ اصول اخلاق کو اپنی عملی زندگی پر منطبق کرے، کیوں کہ اخلاق کے بغیر نہ کسی فرد کو معاشرے میں رہنے کا حق حاصل ہے نہ کسی معاشرے کے تحفظ کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ جو شخص دولتِ اخلاق سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کی شخصی و انفرادی سطح بلند ہوتی ہے، اس کا دائرہ سعی و عمل وسیع و لامتناہی ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے اخلاق کی بنا پر زندگی کے سارے وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ہر دروازہ اس کے لیے باپ مفتوح ہوتا ہے۔

عقل، فطرت اور مذہب نے انسان زندگی کے فرائض کا تعین کیا ہے، معاشرتی زندگی تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے، لیکن فرد و جماعت کی وابستگی کے پہلے ہی مرتبے پر فرائض کے ساتھ حقوق کا بھی تعین ہوتا ہے، فرائض و حقوق کے اس مجموعے کو اخلاق کہتے ہیں۔ معاشرے اور افراد کے درمیان اس کے بغیر ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اخلاق کے بغیر بڑے سے بڑا شخص خرافہ ریزہ ہے اور معاشرہ ایک خزاںِ رسیدہ چمن۔

یہ انسان کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ سکون وطمینانیت کے لیے دولت، شہرت، اقتدار اور مادی ترقی کے حصول کی جہد مسلسل میں دیوانہ وار معروف رہے، حال اُن کہ ان میں سے ہر چیز ایک نئی تشنگی اور نئی بے قراری پیدا کرتی ہے۔ یہ سعی و کوشش ایسی ہے، جیسے آپکی جستجو میں سراب کے پیچھے دوڑنا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی جستجو انسان کر رہا ہے اس کا وجود خارج کی دنیا میں نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا باطن

سکون و طمانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، اس لیے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے باطن ہی سے ہے۔

### قرآن اور اخلاق

کوئی قوم اور کوئی جماعت ترقی کرنا تو بڑی بات ہے اپنے وجود کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر وہ اخلاق کے کم سے کم معیار کو ملحوظ نہ رکھے۔ افراد کے مجموعے کو قومی شخصیت بخشنے والی طاقت اور جوڑنے والی قوت اخلاق ہی کی قوت ہے۔ اخلاقی اقدار کے پاس دلخاف کے بغیر افراد کے مجموعے کو بھیر منو کہا جاسکتا ہے قوم یا ملت نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو قومیں اپنے اخلاق کو معیار سے گرا لیتی ہیں اور اپنے افکار و اعمال میں اخلاقی قدروں کو ملحوظ نہیں رکھتیں، ان کو تاریخ کا مظلوم سمندر بہکولے دیتا ہے اور اگر پھر بھی وہ عبرت حاصل نہیں کرتیں تو بالآخر مذلت کے بحر حقیق میں تر نشین ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معقول نظام حیات اخلاقی اقدار پر سب سے پہلے متوجہ ہوتا ہے اور ان کے استحکام کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اخلاق کی آب یاری کے بغیر کوئی نظام کوئی معاشرہ بقا و ترقی کے مراحل سے نہیں گزر سکتا۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور جس قسم کی سیرتیں اس کو مطلوب ہیں اس کے لیے نیک و بد اور خوب و ناخوب کا ایک مکمل نظام اقدار فراہم کرتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں ایمان کے ساتھ عملی صالح کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور صالح اعمال کی وضاحت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی ہے عمل کے صالح ہونے کا پیمانہ اخلاق ہے، اخلاق ایک جزو ہے تقویٰ کا۔ اسلام نے انسان کی بڑائی اور عظمت کا جو واحد معیار مقرر کیا ہے وہ تقویٰ ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ

”بلاشبہ تم میں سب سے مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“

قرآن حکیم کے ان چند الفاظ کی جامعیت پر آپ جتنا غور فرمائیں گے ان کی اہمیت اور معنویت آشکارا ہوتی جائے گی۔ دولت، شہرت، حکومت، قابلیت کسی چیز کو معیار نہیں بتایا گیا۔ برتری، احترام اور بلند ی کا حرف ایک ہی پیمانہ رکھا گیا ہے اور وہ ہے اخلاقی عالیہ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرے میں برتری کا معیار نیکی ہو تو اس معاشرے میں نیکیاں ہی فروغ پائیں گی اور نیکیوں کو ہی اقتدار حاصل ہوگا۔ اخلاق کی اہمیت اس سے زیادہ اور کس طرح ظاہر کی جاسکتی ہے کہ رحمتِ عالم سرور کو نبین نور مجسم نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسد کی تشکیل کروں؟

اور یہ بھی شائع اسلام ہی کا ارشاد ہے کہ ”مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں“ اور ایک بار فرمایا کہ ”تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں؟“

غرض اخلاق اور محاسن اخلاق کے سلسلے میں ہمیں قرآن حکیم اور احادیث و سیرت پاک سے متکل روشنی اور رہنمائی ملتی ہے اور ہمیں اس باب میں کسی دوسری طرف دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم مطالعہ قرآن حکیم کرتے ہیں اور حیاتِ سرور کائنات کو سامنے رکھتے ہیں تو بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تعلیماتِ اسلام کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے اور اس میں اس درجہ وضاحت و صراحت ہے کہ ہمیں اسلام اور اخلاق ہم جتنی ملتے ہیں۔ قرآن اور اخلاق، اخلاق اور حیاتِ فخریہ موجودات اور اسلام و اخلاق ہمہ وجہ اور بہ طور ہم معنی ہیں۔

### مذکرہ ملی اخلاقیاتِ نبوی

پاکستان اسلام کے نام و عنوان پر عالمِ وجود میں آیا تھا۔ یہ ملک مندر شہود پر اس لیے جلوہ گر ہوا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنے دینی فرض سے عہدہ برآ ہونے کے آرزو مند تھے اور انھوں نے بے اندازہ قربانیاں دے کرے ایک اسلامی مملکت قائم کر دی کہ جہاں وہ قرینہ اسلامی کے مطابق زندہ رہیں گے اور دنیا کے لیے وہ نمونہ حیات پیش کریں گے کہ جو ایک مسلمان کا فخر و امتیاز ہے اور جو قرآن و سنت کا عکاس و آئینہ دار ہے۔ اگر یہ منشائے حقیقی نہ ہوتا تو آرزوئے دلی مسلم اور تمنتائے قلبِ مسلم ہیں وہ درد و سوز پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ شانِ کبریائی جوش میں آتی اور ایک ریاستِ اسلامی کا مجرہ استغول وجود ممکن ہوتا۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پاکستان اسلام سے عبارت ہے اور اس کے بغیر اس کا وجود و قیام ممکن نہیں ہے۔ ماضی کے تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ وہ دین ہے کہ جس نے تمام اقوامِ عالم کو اپنی روشنی سے متور کیا ہے اور تمام تاریکیوں کو ابھلا بخشا ہے۔ ہم اس دینِ متین کے نام لیوا و حامل اور پرہیزگار ہیں۔ مگر کیا اس سے بڑی غفلت بھی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ہمیں اس مقام کا احساس نہ رہے۔

میرے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما داغ اور دھبہ نہیں ہو سکتا کہ آج انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ عقیدہ مسلم یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات اپنی ذات و صفات میں وحدہ لا شریک ہے، کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح قرآنِ کریم اپنی جامعیت اور کمال میں وحدہ لا شریک ہے اور بالکل اسی طرح اس کا لائے والا رسول کمالِ انسانیت و تعبد اور قواعدِ نبوت و اصلاح میں بھی وحدہ لا شریک ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ جو امت اس خدائے واحد، اس قرآن و واحد اور اس رسولِ واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو وہ بھی اپنے اندر شانِ وحدت و یکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمالِ زندگی کی ہر شاخ میں بے مثال ہو اور شان

وحدت کی حاصل ہو۔ اس کے اعمال و اخلاق غلط انداز عالم ہوں۔ اقوام و ملل عالم اس کے اعمال کا اتباع کریں۔ زندگی کے ہر حسن و جمال میں اس کے خط و خال مرقع عالم کے لیے نمونہ بنیں۔ وکنز الک جعلنک کرامۃ فی سطرکے یہی معنی ہیں اور اسی لیے مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا

”مسلمانو! اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے شقی بن جاؤ گے تو وہ تمہارے لیے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دے گا۔“

اخوانِ پاکستان!

ذرا غور کیجیے کہ جس قوم کو اس صدائے الہی نے مخاطب بنایا ہو اس کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بد بختی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لیے نمونہ بننے کی جگہ خود دوسروں کو اپنا کتبہ مقصود اور قبلہ بنانے کی غلطی کرے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان میں ہم نے تعلیم و صحت، اخلاق، معاشرت و معیشت، سیاست یہاں تک کہ مدنی زندگی کے ہر شعبے میں دوسری قوموں کے اعمال کو نمونہ بنایا، تہذیب و تمدن میں یورپ کی شاگردی کی۔

یہی وہ بنیادی نگرانی ہے کہ جس نے تعمیر ملت کے ستونوں کو منہدم کر دیا ہے اور سب سے بڑا خسران یہ ہے کہ من حیث المجموع ملت طاقت اطلاق سے محروم ہو چکی ہے اور بد اخلاق کی دوا دیں میں گمراہ ہو چکی ہے۔

پس اخلاق کی جس صورت حال پر میں نے روشنی ڈالی ہے اس کا مقصد کسی خاص گروہ، کسی خاص طبقے، کسی خاص جماعت کی تنقید یا اس پر تنقید ہرگز نہیں ہے، بلکہ ملت کے ایک ذرہ کی حیثیت سے جائزہ لینا ہے۔ اسے آپ خود تنقید ہی بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عاجز بھی اسی ملت کا ایک فرد ہے اور جو صورت حال ہو اس کی ذمہ داری میں ہم سب شریک ہیں۔ ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے اس کے سیاہ و سفید میں ہم سب شامل ہیں اور خرابی احوال میں کہ دبیش شرکت سب ہی کی ہے۔ میری گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ خرابی چاہے کسی میدان میں ہو اس کی جڑ اخلاقی انحطاط میں ہے۔ سیاست ہو کہ معیشت، معاشرت ہو کہ تجارت، صحت ہو کہ تعلیم، لگاؤ جہاں بھی پیدا ہو رہا ہے، جس حد تک بھی ہو رہا ہے، اس کی وجہ اخلاق کا فقدان ہے۔ جب افراد کے اخلاق میں کمزوری در آئے تو زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے ہر شعبہ حیات کے افراد اپنے پست اخلاق کی وجہ سے اس شعبے میں اپنی صلاحیت و صلاحیت سے بہرہ لانے کے بجائے اس کو خزاں رسیدہ کر دیتے ہیں، ان فرض خرابی جب بھی ہوئی ہو جس نے بھی کی ہو اس کی پشت پر اخلاقی اضمحلال ہی کا فرمانار ہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنی ذہنی وابستگیوں اور ذائقہ، گمراہی اور

جامعۂ نظر سے بلند ہو کر اس صورت حال پر غور کریں اور کسی ایک فرد، گروہ یا جماعت کو بدھنہ بنانے کے بجائے اخلاق کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے کی سعی کریں، کیوں کہ جب سیلاب آتا ہے تو وہ اپنے پرانے کی تفریق نہیں کرتا سیلاب اندھا ہوتا ہے اور وہ سب کو ہار کر لے جاتا ہے  
فجائن گرائی!

اس سیلاب پر بند باندھنا چاہیے، فوری باندھنا چاہیے اور ہم سب کو مل کر باندھنا چاہیے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لیے ہمارے پاس طاقت موجود ہے اور وہ طاقت ہے اخلاق نبوی کی۔ اخلاق نبوی کی بروری ہی ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جانے سے بچا سکتی ہے۔ سرکارِ دو عالم، نبی کریم، نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ظہور فرمایا تھا تو دنیا کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ آپ کے نسخہ کیمنی نے ایک ایک مرض کا علاج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیات اجتماعی کا بیمار ڈھانچہ مضبوط اخلاقی بنیادوں پر کھڑا ہو گیا اور دنیا میں ایک بے مثال انقلاب کا باعث بنا۔ ضرورت ہے کہ آج بھی ہم اسی نسخہ کیمنی سے اپنے امراض کا علاج کریں اور شفا حاصل کریں۔ یہی وہ ضرورت ہے کہ جو ”مذاکرہ ملی اخلاقیات نبوی“ کی محرک ہوئی اور ہم نے ماہِ ربیع الاول کو اس آوازِ اخلاق کو بلند کرنے کے لیے اس میں منتخب کیا ہے کہ یہ ماہ مبارک مسلمانینِ عالم کے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے اور اس لیے ہے کہ اس عظیمینے اللہ کا وہ فرمانِ رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمان کا موسم بدل دیا۔ ظلم و فتنان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ اللہ اور اُس کے بندوں کا لوٹا ہوا رشتہ جو گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنوں کو نابود کر دیا اور کلیمہ کفر و ضلالت کی جگہ کلمہ حق و عدالت کی حکم رانی کا اعلان عام ہوا۔

آخر میں آئیے دستِ دعا دراز کریں۔

اے باری تعالیٰ! اہم اخلاقی زوال کی جس دلدل میں پھنس گئے ہیں، اس سے ہمیں صرف اور صرف تیرے حبیبِ پاک کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی نکال سکتی ہے، تو ہمیں اِشتم و عفو دان کے بھنور سے بچا اور افعالِ حسنیٰ کو توفیق عطا فرما۔ اس ذکرِ جمیل کو قبول فرما جو یہاں ہوا ہے اور ہوگا۔ اور اس کے خفیل ہمیں اخلاقی نبوی سے قریب کر دے۔  
اے خالقِ کائنات! اہم گنہگار سہی، مگر تیرے بندے ہیں، تیرے رسول کے نام لیا ہوا ہیں، جس نے ہمیں اخوت و اتحاد کا سبق دیا اور تیری یہ آیت و ہدایت سنائی کہ ”وَ اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا“۔

مگر ہم نے تیری رسی کو چھوڑ دیا اور شیرازہٴ ملت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں اتنی طاقت عطا فرما کہ ہم بحبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں اور ایک دل، ایک جان ہو کر تعمر چہاں کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ آمین، ثم آمین



# نظام معاشرت

جناب محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على خير خلقه  
سيدنا ومولانا محمد وآله واصحابه اجمعين۔

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين  
كله وكفى بالله شهيدا محمد رسول الله والذين معه اشداء على  
الكفار رجا بينهم تراثهم كعاصم لا يستغنون فضلا من الله  
ورضوانا۔ سيما هم في وجوههم من اشرا السجود

صدق الله العظيم

مذکرہ ملی اخلاقیات نبوی کے سلسلے میں اس وقت موضوع بیان نظام معاشرت ہے۔  
اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آیات جو تلاوت کی گئیں اگرچہ سرور کائنات جناب رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ جس دین حق و ہدایت کو لے کر مبعوث ہوئے اُس کا بیان ہیں۔  
اور آپ کے صحابہ کی ایمانی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا ذکر ہے جن کے اخلاق و معاشرت کی  
طہارت و عظمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ مگر آیات مبارکہ کے اس  
اصل موضوع پر اجمالی نظر ڈالتے ہی سے نظام معاشرت کے بنیادی اصول سمجھ میں آسکتے ہیں، کیوں کہ  
یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی حیات اور مقاصد حیات کی تکمیل اور رشد و فلاح کی منازل طے کرنا ہدایت اور  
حق کا محتاج ہے۔ بغیر ہدایت انسان گمراہی میں پڑے گا، اور حق کے بغیر باطل نظام کی تباہ کاریاں عالم  
انسانیت کے سارے نظام کو درہم برہم کر ڈالیں گی۔ تو سب سے پہلے تعلیمات نبویہ کی بنیاد حق و ہدایت  
ہوئی۔ اور اس حق و ہدایت کی بنیاد پر قائم ہونے والی عملی عمارت، اخلاق و معاشرت کی جملہ خوبیوں پر  
مشتمل ہونے کے باعث اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ آپ کے صحابہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم کا  
منظر کمال بن کر دنیا کے سامنے رونما ہوئے۔



شدت و رحمت یعنی سختی و نرمی ہی ایسی دو قوتیں ہیں جو نظام کو چلاتی ہیں، اور سعادت و شقاوت کی منزل پر پہنچانے والی بھی یہی دو طاقتیں ہیں۔ اگر ان کا رُخ صحیح ہے تو انسانی حیات اخلاق و معاشرت کی ہر خوبی کو حاصل کرے گی۔ اور اگر رُخ غلط ہے تو تباہی اور بربادی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

اس کی وضاحت کے لیے میں آپ کی توجہ تخلیق آدم کے ارادہ تکوینی پر فرشتوں کے ایک اشکال اور اُس کے جواب کی جانب مبذول کر دوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے جب یہ فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہٖ کیں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا یا تعالیٰ فیتہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء کہ اے پروردگار! کیا آپ ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو زمین میں فساد پھیلانے اور خون ریزی کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں معاشرت کے بگاڑ اور تباہی کی باعث ہیں۔

حضرت مفسرین نے فرشتوں کے اس اشکال کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ امام رازیؒ ان وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے اصل سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ فرشتوں نے یہ بات انسان کے اجزائے ترکیبیہ پر نظر کرتے ہوئے کہی، کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ تخلیق انسان میں جو اجزا ہیں یعنی پانی، مٹی، آگ اور ہوا، یقیناً اُن کے آثار اُس کی عملی زندگی میں رونما ہوں گے۔

ہر نسخہ مرکب اپنے اجزا کی تاثیر اور اُس کے خواص پر مشتمل ہوتا ہے تو پانی سے حرص و لالچ جیسی خصلتیں پیدا ہوں گی، اور مٹی کی خاصیت جذب و انقباض ہے تو اُس سے بخل پیدا ہوگا، اور آگ کی تاثیر و خاصہ حرارت و اشتعال ہے تو اس سے برا فز و خشکی اور غصہ ہوگا اور ہوا کا خاصہ بلندی و اُبھار ہے تو نخوت و غرور اور سرکشی جیسی چیزیں واقع ہوں گی۔ اور یہ جملہ چیزیں عالم میں فساد و خون ریزی کا سبب بنیں گی۔ حق تعالیٰ نے جواب اپنی شانِ عظمت کے مناسب یہ دیا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جس سے فرشتوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تم نے انسانی قوائے عملیہ کا ایک رُخ دیکھ کر ایسا اندازہ کیا، لیکن اس حقیقت کو اب واضح کر دیا جائے گا کہ یہی قوتیں جو انسانی معاشرے کو تباہ کر دینے والی ہیں اگر ان کا رُخ صحیح کر دیا جائے گا تو یہ جائے فساد معاشرہ کے صلاح و کمال کی علامتوں پر انسانی زندگی پہنچ جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ اَنْ حَضَرْتُ صَلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَنْ اَعْطٰی اللّٰہَ وَمَنَعَ اللّٰہَ وَاحَبَ اللّٰہَ وَابْغَضَ اللّٰہَ یعنی جس نے جو عطا و سخاوت کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ بخل و تنگی کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ محبوب رکھا وہ بھی اللہ کے لیے اور جس چیز سے بُغض و

نفرت کی وہ بھی اللہ کے لیے، تو بے شک ایسے شخص نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی حیات میں سخاوت و بخل اور محبت و نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عملی زندگی میں ناپید ہو جائے، لیکن یہی وصف سخاوت اگر خیر کے کاموں میں ہو تو ایثار و ہمدردی اور خدمتِ خلق کی صورت میں رُونا ہوگا۔ اور یہ وصف اگر برائیوں میں ہو تو اسراف اور فضول خرچی اور تعیش جیسی مذموم خصلت بن کر سامنے آئے گا۔

علیٰ بن ابی القیاس بخل و تنگی اگر برائیوں سے ہو تو معاشرے کو بہتر بنانے کا سامان ہوگا اور اگر خیر اور بھلائیوں میں ہو تو محدودی اور بد نصیبی میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ شوق و محبت کے جذبات خیر میں ہوں تو معاشرہ محاسن اعمال و اخلاق کا مظہر بن جائے گا، اور اگر یہ جذبات نفس کے تقاضوں کے تابع ہو جائیں تو شر و فساد اور بے حیائی کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح بغض و نفرت اگر اپنوں سے ہو تو دنیا میں انسان درندوں کی شکل میں نظر آئے لگیں گے اور یہ بغض دشمنوں سے ہو اور بُری باتوں سے ہو تو قوم کے لیے بقا و سلامتی اور عزت و عافیت کا سامان ہوگا اور عفت و پاک دامنی اور تقویٰ سے معاشرہ مزین ہوگا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ رب العزت نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ نے آدمؑ میں ایک چیز رُوح پیدا کی اور ایک چیز نفس بھی اس میں پیدا کیا۔

تو اب انسانی زندگی میں عفت و تقویٰ، ایثار و سخاوت اور ہر فلاح و سعادت کی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ رُوح سے ہے، کیونکہ وہ ملکہِ اعلیٰ سے ہے اور امرِ رب ہے۔ اور جو چیز بھی شر اور بُرائی کی انسان میں ظاہر ہو وہ اس کے نفس سے ہے۔ آپ کے اس ارشادِ مبارک نے انسان کی عملی قوتوں کے دو رخ ظاہر کر دیے اور یہ بتا دیا کہ خیر کے محرکات رُوح سے ہیں اور شر کے محرکات نفس سے ہیں۔

امام بیہقی نے ابویہ رحمہ اللہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب عقل پیدا فرمائی تو اُس سے فرمایا اَقْبِلْ فَاَقْبِلْ ثُمَّ قَالَ اَدْبِسْ فَاَدْبِسْ ثُمَّ قَالَ قُمْ فَمَقَامُكُمْ قَالَ اُقْعِدْ فَقْعِدْ کہ اے عقل تُو آگے آتو وہ آگے ہو گئی۔ اُس سے فرمایا کہ تُو پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اُس سے فرمایا تُو اٹھ کھڑی ہو وہ کھڑی ہو گئی۔ اُس سے فرمایا تُو بیٹھ جا وہ بیٹھ گئی۔ بدو تخلیق میں عقل کے ان احوال کو مقتدر فرما کر یہ ظاہر کر دیا گیا کہ انسان کی زندگی میں یہ عملی پہلو ودیعت کر دیے گئے کہ کسی کام کی رغبت تو کسی سے نفرت، کسی کی طرف دوڑ اور مسابقت تو کسی سے پرہیز اور بُعْد اور عقل ہی مدبر اور حاکمِ بدن ہے۔ اگر اس عقل کی حکم رانی اپنے اعضاء سے بدتیر پر نفس کی

تحریک سے ہے تو نتیجہ شر و فساد اور اگر روح کی تحریک پر ہے تو صلاح و خیر۔

امام ربانی شیخ محمد الفیثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: کمال ایمان یہ ہے کہ بندہ اپنی قوت غضبیہ کو اور قوت شہویہ کو احکام خداوندی کے تابع کر دے اور اس مقام تک پہنچ جائے کہ مقتضائے طبیعت مقتضائے شریعت بن جائے۔ اسی حقیقت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واضح کر رہا ہے۔ الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت اذ اصلحت صلح الجسد کلاہ و اذا فسدت فسد الجسد کلاہ الا وہی القلب: یعنی آگاہ ہو جاؤ انسانی جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ وہ اگر درست ہو تو تمام بدن درست ہوگا۔ اور وہ اگر بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جائے گا۔ خیر و شر ہو جاؤ وہ قلب ہے۔ گویا قلب انسانی اور قالب دونوں اس طرح مربوط ہیں کہ صلاح و خیر اور فساد و شر میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

تو عقل النماں جو اپنے بدن پر قوت حاکم ہے اگر دجی الہی اور تعلیم ربانی سے نور حاصل کرے گی تو اپنے جسم کو خیر میں مصروف کرے گی۔ اور اگر اس نور الہی سے محروم رہتے ہوئے ظلمت و تاریکی میں پڑی رہی تو شر و فساد اور گمراہی کی تاریکیوں ہی میں اپنی مملکت برباد کر ڈالے گی۔

یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: المعدة حوض البدن ومنہا تصدر العروق بالصحة والمرض، یعنی معدہ بدن کے لیے ایک حوض ہے وہیں رگیں تمام بدن انسانی کی طرف تن درستی و بیماری لے کر لوٹتی ہیں۔

الغرض معاشرہ اور انسان کی غلی زندگی میں اگر نفس کے محرکات ہوں تو نتیجہ شر و فساد اور قتل و خون ریزی ہی ہوگا جیسے کہ فرشتوں کو اشکال ہوا تھا چنانچہ ایسے انسان کا طرز زندگی قرآن حکیم نے بیان فرمایا: واذ التولی سعی فی الارض لیفسد فیہا و یحملک الحجر والنسل واللہ لا یحب الفساد، یعنی کہ جب بھی وہ پیٹھ پھیر کر واپس جائے تو زمین میں فساد برپا کرتا ہوا اور کھیتوں اور نسل کو تباہ و برباد ہی کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور نفس کی تباہ کاریاں اُس کو ایسا مغرور و بدست بنادیتی ہیں کہ واذ اقبل لہ الحق اللہ اخذہ العنق بالاثم فحسبہ جہنم۔ یعنی جب اس کو کہا جائے کہ خدا سے ڈر تو غرور و تکبر اُس کو اور گناہ و سرکشی پر آمادہ کرتا ہے، لیکن روح کے محرکات اُس کی قوت غضبیہ کا رخ مجرمین کی سرکوبی کی طرف پھیر دیتے ہیں اور وہ مجرمین پر قہر خداوندی بن کر برستار ہے۔ اور جذب و شوق کی طاقتیں اُس کو تقویٰ اور طاعت کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔ اب اس کو عبادت اور محاسن اعمال و اخلاق اس قدر لذیذ و مرغوب معلوم ہونے لگتے ہیں کہ اس سے زائد کوئی چیز زندگی میں مرغوب نہیں رہتی پہلا رخ معاشرے کے فساد کا تھا تو یہ رخ معاشرے کی صلاح و فلاح کا ہوا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ**  
**ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ**، یعنی انسانوں میں بہت سے وہ ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو فروخت کر دیتے ہیں  
 اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے۔ یعنی اپنے نفس کے تقاضوں کو مٹانے کے لیے روح کے تابع کر لیتے ہیں۔  
 نفس اپنی ذات اور قدرت سے امارۃ بالسوء برائیوں پر آمادہ کرنے والا ہے۔ ضرورت  
 ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کے زہر کو مٹ کر کے اس کو نشہ بنالیا جائے۔ اگر نفس امارہ کو  
 تعلیمات نبویہ سے مٹ کر لیا گیا تو پھر یہ نفس امارہ اور تواضع کے بجائے نفس مطمئن بن جائے گا۔ اور  
 روح کے لیے ایک شکاری کتے کی طرح بڑے قیمتی اعمال و افعال اور خصائل کا شکار لالاکر انسانی حیات کو  
 سودمند و منتفع کرنے لگے گا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں احوالِ قلب پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ بدن  
 انسانی کو ایک شہر یا ملک کی طرح سمجھ لینا چاہیے اور عقل کو بہ منزلۂ حاکم کے۔ اور اُس کے وزراء و قدرتی  
 خواہ خواہ اس ظاہرہ میں سے ہوں یا باطن سے اس کے اہوان و مددگار اور لشکر ہیں۔ اور اس کے اعضا سے  
 بدنیہ گویا اس کی رعیت ہیں۔ اور نفس امارہ بالسوء جو اُس کے جذباتِ شہوت و غضب ہیں اس کا  
 دشمن ہے جو اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہے اور اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے اور اس کی رعیت  
 کو ہلاک کرنے پر تیار ہوا ہے تو اب اگر اس ملک کا بادشاہ اس دشمن کے ساتھ مقابلہ و جہاد کر کے اس  
 کو شکست دے دے گا تو اپنی سلطنت بھی محفوظ رکھ سکے گا اور اپنی رعیت کو بھی ہلاکت سے بچالے گا۔  
 یعنی اس کی زندگی نجات و کامیابی حاصل کر لے گی۔ اور وہ اپنے وجود کو دنیوی ذلت اور اخروی عذاب  
 سے بھی بچالے گا۔ دنیا میں کوئی بادشاہ اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے کے لیے خالی نہیں چھوڑا کرتا۔

اس مقالے کی محدود گنتائش ان نکات کی توضیح کی اجازت نہیں دیتی جن کی طرف اشارہ کیا  
 گیا۔ البتہ صرف ایک حدیث کا مضمون محض حوالے کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے بخوبی  
 یہ بات ظاہر ہو سکے گی کہ تعلیماتِ نبویہ نے دنیا کے انسانوں کے لیے کیسا پاکیزہ نظامِ معاشرت عطا فرمایا؛  
 امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیحین میں حدیثِ تخریج فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ  
 وسلم نے ارشاد فرمایا: **سَبْعَةُ يَظْلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ** یعنی سات آدمی ایسے ہیں جن  
 کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص سایہ رحمت میں جگہ دے گا اُس روز جب کہ کوئی سایہ اُس کے سائے کے  
 علاوہ نہ ہوگا۔ فرمایا: ایک عدل و انصاف قائم کرنے والا حاکم۔ دوسرا وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں  
 سرشار و مست ہوا اور اسی میں نشوونما پاتا رہا۔ تیسرے وہ دو شخص جو باہمی محبت صرف اللہ کے لیے  
 رکھتے ہوں، اُسی پر جمع ہوتے ہیں اور اُسی پر جُدا ہوتے ہیں۔ چوتھا وہ شخص جو مسجد سے فارغ ہو کر

نکلا، لیکن اُس کا دل مسجد ہی میں اٹکا ہوا ہے تا وقتہ کہ وہ پھر مسجد میں آجائے۔ پانچواں وہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور خشیت و تقویٰ سے اُس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ چھٹا وہ جس کو کسی نے نفس کی شہوتوں کی دعوت دی اور اُس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا اِنِّیْ اَخَافُ اللہَ کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ساتواں وہ شخص جو اس طرح کسی کو حد ذکر تپا ہے کہ باتیں باتھ کہ بھی خبر نہ ہو کہ باتیں باتھ نے کیا دیا۔ تو اس حدیث میں نظامِ حیات کو ہر خبر و سعادت سے آراستہ کرنے کے تمام پہلو واضح فرما دیے گئے یعنی حاکمِ عدل و انصاف قائم کر س، باہمی معاشرت ایسے اخلاص اور پائیدار جذباتِ محبت پر قائم ہو کہ اسی پر ملنا ہو اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوں، غیبت و حضور کا فرق نہ رہے۔ ذوقِ عبادت اس قدر قوی ہو کہ وہ جوانی کا دور جس میں طبعی خواہشات اور لہو و لعب انسان کو غافل و لاپرواہانہ رکھتا ہے، وہ نوجوان عبادتِ خداوندی ہی میں مست رہے۔ خوفِ خدا اس قدر ہو کہ تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے روتا ہو۔ عفت و پاک دامنی کا یہ مقام ہو کہ نفس کے بڑے سے بڑے دواعیٰ اور تقاضوں کو ٹھکرا دے۔ اشار اور خدمت کا یہ رنگ ہو اور ایسے اخلاص و تواضع کے ساتھ ہو کہ گویا باتیں باتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ باتیں باتھ نے کیا کیا ہے۔ یہ سات شعبے ہیں جو تمام نظامِ حیات پر محیط ہیں۔ ان کی تکمیل و تحمیل کی یہ تعلیم بتا رہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے دونوں رُخ نہایت اعلا و مکمل فرمائے۔ زندگی کا وہ رُخ جو خالق کی طرف ہے وہ ایسا اعلا و اکمل ہو کہ ایمان و تقویٰ کا یہ سرگرم بنا ہوا ہو۔ اور مخلوق کی طرف جو رُخ ہے وہ ایسا پاکیزہ ہو کہ اخلاص، اشار و محبت اور اعانت و خدمت کا مجسم ہو کر ہمارا ہے۔

بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ یہی وہ نظامِ حیات ہے جو انسانوں کو مادی کثافتوں سے پاک کر کے ملائکہ مقربین کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے، بلکہ اُس عالی مقام پر پہنچاتا ہے کہ فرشتوں کو اُن پر رشک ہوتا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں اُن کے اعمال پیش کرنے میں فخر کرتے ہیں۔ خداوندِ عالم تعلیماتِ نبویہ سے ہمیں ایسے ہی نظامِ حیات سے آراستہ و مزین فرمائے اور دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہم کٹا رہ جائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

# نظام تمدن و مدنیت

جناب محترم مولانا محمد سعید

جسے بنی نوع انسان میں ظلم و عدوان اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے اپنے بٹنے ہوئے جال ہر جنبش تازہ کے ساتھ اُس کی کھال میں گھستے چلے جاتے ہیں اور جس مقصد کے لیے تخلیق آدم ہوئی، اولادِ آدم اُس سے دُور پٹی چلی جاتی ہے تو اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی خاص بندے کو منتخب کرتا ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے ہجومِ خلق کو پھر سیدھی راہ پر لے آئے۔

ایک ایسی زندگی جب حرا کی تنہائیوں میں سے نکل کر تاریخ کے دھارے میں قدم رکھتی ہے اور وہ لمحہ یاد رکھیے تاریخِ انسانی کے لیے بڑی خوش بختی کا ہوتا ہے تو اس کے پیشِ نظر ذاتی علو یا منفعتیں نہیں ہوتیں بلکہ دوسروں کو اپنے روپ میں ڈھالنے کی تمنا ہوتی ہے۔

پیغمبرانِ زندگی ہر شاہکار کی طرح خونِ جگر کی طالب ہوتی ہے۔ اس میں دردِ کرب، حزن و یاس، بیم ورجا، کوششِ پیہم، شبِ بیداری اور نالائیم شبی سبھی کچھ ہوتے ہیں یہ زندگیِ خدائی کا دردِ سر نہیں ہوتی، بندگی کا دردِ جگر ہوتی ہے۔ اور بندگی ہی کو انسان کی تقدیر بنایا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ط الذاریات ۵۶

”جن و انس کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا گیا ہے“

جب زندگی کا مقصد اولیٰ ہی ٹھہرایا گیا ہو پھر زندگی کا ہر بندھن اس مقصد کا تابع ہو جاتا ہے۔ رہن سہن، لین دین کا تمام کار بار، تعلقاتِ باہمی کا پورا اتانا بانا، محبت و نفرت کی پوری دنیا۔ غرض یہ کہ پورا تمدن ایک ہی جذبے کے تحت ہو گیا اور وہ جذبہ ہے خدا کی بندگی کا اور اس کے لیے بہترین نمونہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی مقدر ہوئی اور پھر نبی نے زندگی کو سنوارنے کے کام میں محض دو چار باتیں ہی ہمیں کہیں کسی چھوٹی بڑی تفصیل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ایک اچھا مصوٰر صرف قد و قامت یا دست و بازو کے حسنِ تناسب ہی کو کاغذی پیرہن نہیں پہنا بلکہ برو و شر کا ٹیک کا ہر ہال اُس کے موئے قلم کے پیچ و خم کی رعنائی کا منظر ہوتا ہے۔ یہی دھڑ ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ، نگاہِ نبوی سے اوجھل نہیں رہا۔

اچھا تمہیں ہے کیا چیز؟ انھیں جزئیات کی نگہ داری۔ معاشرتی زندگی ہر بہرہ قدم پر دوسروں کی احتیاج اور ان سے تعاون کا نام ہے۔ ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اور کوئی قدم بغیر تعاون کے ممکن نہیں۔

دیکھا جائے تو انسان، اپنی پیدائش سے موت تک، محتاجیوں کے ایک طویل سلسلے میں سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو لبقائے حیات کے لیے ماں کے دودھ کا محتاج ہوتا ہے، آگے بڑھتا ہے تو باپ کے کمانے ہوئے رزق کا محتاج، علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اساتذہ کے علم کا محتاج، بیمار ہو تو طبیب کے دستِ شفا بخش کا محتاج، اور جب کارِ بارِ حیات میں اُترتا ہے تو پھر تو اُس کی محتاجیوں کا کیا پوچھنا! پھر احتیاج کم اور ہوس زیادہ۔ الغرض، بچے کو پچھے، بلی گلی رسوا ہوتا پھرتا ہے۔ تا اُن کر اُس کے قلب و ذہن پر خواہشاتِ نفسانی کے اندھیرے چھانے لگتے ہیں، اور وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوصف شجرِ دجر کے سامنے سرافگندہ ہو جاتا ہے۔

ایسے میں ایک آواز گونجتی ہے۔ کہو!

إِيَّاكَ لَتُعْبَىٰ ۖ وَإِيَّاكَ لَتَسْتَعِينُ ۝ الفاتحہ: ۴

کیا کر رہے ہو؟ مانا احتیاج ہے۔ پھر بھی حاجت روا تو ہم ہیں۔ حاجتیں ہم پوری کریں گے۔ تمہیں ہر بہرہ قدم پر جوشِ بندگی میں خدا تراشنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے کرنے کا کام البتہ باہمی تعاون ہے اور تعاون بھی نیکی اور خدا خوفی پر، ذکرِ بُرائی اور عصیان پر۔

لَتَعَاوَنَ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنَ عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۝ المائدہ: ۲

اب تعاون کا انحصار کس شے پر ہے؟ یاد رکھیے تعاون سے زیادہ نازک اور کوئی معاملہ نہیں۔ یہ جذبہ دودھ کی طرح ہے جب تک خالص ہے، جب تک برتن صاف ہے، جب تک گندے ہاتھوں سے محفوظ ہے یہ زندگی بخش اجزاء کا بے مثال مجموعہ ہے جو رگ دیے کو تر تازہ کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جوں ہی اس میں کھٹائی پڑی یہ پھٹ گیا۔ چنانچہ تعاون کے شہِ جان بخش کو کھٹائی سے بچانے کی بہترین صورت وہ ہے جس کا حکم یوں قرآنِ کریم میں دیا گیا ہے۔

إِنَّ الشَّيْءَ أَمْرَكُمْ أَنْ تَوَدُّوا الْأَمَانَةَ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۝ النساء: ۵۸

”امانتیں حق داروں کو لوٹا دیا کرو“

میرے علم میں مدینت کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے اس سے زیادہ جامع اور کوئی حکم یا نصیحت انسان کے پورے علمی سرمایے میں نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس حکم کے تحت ہم سب کے اعزاز میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے امانت دار مقررہائے گئے ہیں۔ آپ کی

کچھ امانتیں مجھے ادا کرنا ہیں اور میری کچھ امانتیں آپ کے ذمے ہیں، ہم میں کا ہر شخص معاذ اللہ امانت ہے۔ گویا ہر سچ کی دگ، ہر قاضی کا عمامہ، ہر محکم کی مسند، ہر تاجر کا ترازو، ہر سرمایہ دار کی تجوری، ہر مزدور کا کمال، ہر کسان کا آب، ہر سپاہی کی تیغ، ہر قلم کار کا قلم، ہر خطیب کا لُطُف، ہر طبیب کی میخانسی، ہر شوہر کی وفاداری، ہر بی بی کی عصمت، ہر باپ کا جذبہ پروری اور ہر فرزند کے آدابِ فرزندگی، اسی امانت کے مختلف روپ ہیں جو ہمیں، جہاں کہیں ہم ہیں، متواتر ادا کرتے رہنا ہے۔ یہ امانتیں ادا ہوتی رہتی ہیں تو معاشرتی نظام چلتا رہتا ہے۔ تمدن نمودیر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں نیتوں میں فتور آیا، وہیں فساد کی صورت پیدا ہو گئی۔

اب ذرا حضورؐ کے زمانے کو پیش نظر رکھیے۔ مکی زندگی میں اسلام یوں رونما ہو رہا تھا کہ جیسے خشک سالی کے بعد رحمتِ خداوندی کا چھینٹا۔ مکے کی سنگلاخ وادیوں میں دُور و نزدیک اکا دکا پھول کھل اٹھے۔ ان کی بھارا اپنی جگہ، ان کی باصرہ نوازی اپنے مقام پر لا جواب، لیکن جس بستی کو دامنِ باغ بان بننا تھا وہ یثرب کی بستی تھی جہاں سب کے پھول ایک ہی دامن میں بھر گئے اور ان میں گلِ سرسبز حضورؐ کا اپنا گھرانہ تھا اور یہی وہ سرچشمہ تھا جہاں سے تمدنِ اسلام کے سوتے پھوٹنے والے تھے۔ یہیں سے امت کی شیرازہ بندی جو ناقصی اور یہی مقام اسلام کی پوری کائنات تھا۔ ادا نے امانت کے سب آداب یہاں سکھائے جانے والے تھے۔

اب ذرا گردِ پیش کے معاشرہ پر بھی نظر ڈالیے۔ انسان تمدن کی زندگی کئی صدیوں سے گزار رہا تھا۔ مشرقِ بعید میں دیوار چین، ہندستان میں ایچنٹا کے غار، افریقہ میں ابراہم مصری، بابل و نینوا میں قہر شیریں۔ اور انہار کا سلسلہ اور ان سے قبل، سرزمینِ پاکستان پر موہنجو ڈرو اور ٹیکسلا سب انسان کے تمدن کی دلیل تھیں۔ فکری اور روحانی دنیا میں ہومر کا ایلیڈ، کالی داس کے ڈرامے، زرتشت کے ملفوظات، بدھ کی تعلیمات، منو کی سمرتیاں، افلاطون اور ارسطو ایلز کے رشحاتِ قلم سب انسانی تمدن کے شاہکار تھے، لیکن ان سب کو یکے بعد دیگرے کھنگال جاتیے اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کے خیال کی حد یا ذاتِ شاہ تھی یا سنگِ صنم۔ یا نمرود و فرعون کی طرح بادشاہ تھے۔ یا ہندو اور اولمپیا پر بسنے والے کھلندرے دیوتا۔ اور ان کے درمیان انسانیت جو اشرف و درزاں میں منقسم تھی برابر پس رہی تھی۔

افلاطون، یونان کا نام و فلسفی، اور منو، ہندستان کا نام و رشتن۔ انسانوں کو تہ در تہ بانٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افلاطون کا عمرانی فلسفہ تو مدت ہوئی ختم ہو گیا، لیکن منو کے پیچھے آج بھی سوادِ ہند میں انسانی شرف کو ترس رہے ہیں۔



چنانچہ اسلام کے تمدن کی بنیاد، دو چیزوں پر رکھی گئی۔ خداوندِ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اُس کے بندوں کی تکریم پر۔ اپنے بارے میں ذاتِ خداوندی نے کہا ”لا الہ الاہو“ اور اس کا اعلانِ کامل ہوا اُس روز جب کعبہ بتوں سے پاک کیا گیا۔ اور بندوں کے بارے میں کہا ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ الْاِمْرَادَ ۝۷۰ تَكْرِيمَ آدَمَ کی تکمیل جب ہوئی جب جیلِ رحمت کی بلندیوں پر سے ہر بلند دست کو برابر کر دیا گیا۔ گورے کالے، عربی عجمی کی تفریق مٹادی گئی۔

ہر کیفیتِ حاکمیتِ حق اور تکریمِ آدم دو ایسے بنیادی اصول تھے کہ جن پر اسلامی تمدن کی عمارت اُٹھاتی گئی۔ شخصی جواب دہی، اور قومی مشورت کا پورا نظام اسی بنیادی فلسفے کی ایک جھلک ہے۔

تکریمِ آدم کی ضمناً ایک بات یاد آگئی ہے آج متمدن دنیا میں اگرچہ نسلی تفاخر کے مٹنے کے نعرے لگ رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ کو خلقِ خدا کے سامنے مساواتِ بشر کے عملی نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تاہم اقوامِ غالب کی تجربہ گاہوں میں کچھ اور ہی نوع کے علوم ایجاد ہو رہے ہیں۔ جہاں کل تک کتابوں کی دکانوں کے شیٹوں میں GENETIC. ENGINEERING کی دو چار کتابوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا آج دباں الماریوں پر الماریاں اس علم کی کتابوں سے بھری جا رہی ہیں۔ اور یہ علم ہے کیا؟ سادہ الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انسانی جسم سے بیماری خارج کرنے کے بہانے انسانیت کو ابدی آقاؤں اور ابدی غلاموں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ۔ خدشہ ہے کہ اقبال کا شاہین تو منقار زیر پر رہ جائے گا اور نیٹیشے کا سپر مین کیلے فورنیا کی لیبارٹریوں میں تیار ہو جائے گا۔

آج کو خشش ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی ساخت میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ ایک نسل کے اندر آقاؤں کی بلند نگاہی، اور دوسروں میں غلاموں کی خاک بھری بھر دی جائے۔ کچھ لوگ مستقل آقا ہوں اور کچھ مستقل غلام۔ جب سرشت بدل گئی۔ جبرِ تعلیم سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت سے تو پھر تسخیرِ آدم کا کام مکمل ہو گیا۔ خدائے کعبہ نے تکریمِ آدم کی بشارت دی۔ اور خداوندانِ مغرب نے تسخیرِ آدم کی۔

اب پھر آئیے ارضِ مدینہ کی جانب حضورؐ کے مدینہ منورہ تشریف لانے پر جب اسلام کو ایک خطہٴ ارضی میسر آگیا اور لفظِ مدینہ خود مدینت کا ضامن ہے تو اس کی ہئیت کا تعین ان ہی دو جہذلوں کے تحت کیا گیا۔ عربستان کا قبائلی معاشرہ چند خوبیوں کے ساتھ ساتھ جس سب سے بڑی لعنت میں گرفتار تھا وہ ان کی خود دوسری تھی۔ لاقانونیت۔ چند رسمیں اور ردایات ضرور قائم تھیں، لیکن سب کی سب ان کی خواہشات کے تابع۔ یہاں تک کہ جب لوٹ مار منظور ہوتی یا دشمن سے انتقام

لینا ہوتا تو مقدس زمینوں کو آگے پیچھے کر دیتے۔ خود سری کا یہ عالم تھا کہ جب قبیلے کا بت کر جس کے سامنے شب و روز سجدہ ریز رہتے ان کی منشا کے مطابق فال نہ نکالتا تو تیروں کا مٹھا اُس کے منہ پر دے مارتے۔ بھائی بھائی کا دشمن۔

مدینے کے اندر یہود اپنے سرمایہ داری نظام کے تحت بس رہے تھے۔ بختِ اُمّ کی گرفت سے بھاگے ہوئے تھے۔ انھیں جب تخلصانِ یثرب میں پناہ ملی تو ان کی ریشہ دوانیاں پھر سے جاگ اُٹھیں۔ اوس و خزرج مدینے کے دو مشہور قبیلے یمن کے ماربِ بند کے بے قابو پانیوں سے پرج کر یہاں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ یہ سب عناصر باہم بس تو رہے تھے، لیکن ان کے اندر ایک ترقی یافتہ تمدن کا قصور قطعی نہیں تھا۔

چنانچہ ان کی وحشت پسندی اتنی رُسوا ہو چکی تھی کہ جب عرب سے نکل کر پرجِ اسلام ایران کی سرحدوں کی جانب بڑھا تو فردوسی کی زبان میں دباں کے باشندے پُرانے تعصبات کی بنا پر پکار اٹھے۔ عے تقویر تو اے چرخ گرداں تقو۔  
ایسے معاشرے کو متمدن کرنے کے لیے دو باتوں کا اہتمام کیا گیا۔

## امن اور تعلیم

امن کے لیے حضورؐ نے اوس و خزرج کے صدیوں پُرانے بیر ختم کرا دیے اور یہود سے وہ مشہور نام معاہدہ کیا جسے تاریخِ تمدنِ میناشقِ مدینہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو نمونہ بنا بعد میں آنے والے تمام بین الاقوامی معاہدات کا۔ اس معاہدے کے تحت یہود کو مذہبی آزادی اور جان و مال کی حفاظت دی گئی۔

- (i) مدینے پر حملے کی صورت میں دفاع کے لیے یہود اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ تجویز ہوا۔
- (ii) اگر جنگِ مدینے سے باہر ہو تو یہود کو لشکرِ اسلام کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
- (iii) ہر فریق کی خواتین کی عفت و عصمت کی حفاظت کی جائے گی۔
- (iv) اور جب کوئی تنازعہ پیدا ہو تو وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے احکام کے مطابق طے ہوگا۔

تعلیم کے لیے مسجدِ نبویؐ سرگزینی۔ اور یہ مقام محض عبادت گاہ نہیں تھا اسے ایک چانسری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہیں سے دفود باہر بھیجے جاتے۔ یہیں سے شاہانِ وقت سے نامہ و پیام ہوتا۔ یہیں لشکروں کی ترتیب طے پاتی۔ اور یہیں باطن کے وہ پردے چاک ہوتے جن کا دور کرنا اسلامی تصوف کا مطمح نظر تھا۔ اسی مسجد کا گارا، بالآخر مغرب میں جامعہ قرطبہ اور مشرق میں جامعہ شاہ جہان

کا غاڑہ بنا۔ مسجد نبویؐ کو یا محمدؐ اسلام کا اولین گمراہ بنا۔ خدا کی قدرت ملاحظہ ہو کہ جس سرزمین کو اسکندر کی ہوس ملک گیری نے اپنے لیے سزاوارانہ سمجھا ہوا اور وہ اس سے دامن بچا کے نکل گیا ہو وہیں سے شاہانِ وقت کے نام پیغامِ ہدایت جاری ہوئے۔ یہ مکتوبات ایک بشارت تھی کہ ایک نیا دین، ایک نیا تمدن، ہدایتِ خداوندی پر مبنی، اُبھرنے والا ہے۔ جس کے دائرۂ اثر و نفوذ میں محض قبائلی حد بندیاں ہی نہیں ہوں گی قیصر و کسریٰ کی ملکیتیں بھی ہوں گی۔

چنانچہ بعید نہیں تھا کہ مخالفت اور دشمنی کے جھگڑے بھی اغیار ایسے مثالی گھر کے سقف و بام کو اڑانے کے لیے چلائیں۔ اس بستی کے یہودیوں یا منافقین۔ اس کے پڑوس کے ردّساہوں یا فرماں روا سب کی نگاہیں کا شائد نبوت پر مرکوز تھیں اس لیے کہ یہاں سے ادائے امانت کی جو روشنی پھوٹ رہی تھی وہ ان اندھیروں کو لپسا کرنے والی تھی جو ان مفادات نے اپنے گرد و پیش اس غرض سے پھیلا رکھے تھے کہ وہ ان کے اندر انسانوں کے ضمیر و دل کا بے باکانہ شکار کرتے رہیں یا مانتیں غصب ہوتی رہیں اور شرفِ انسانیت یا مال ہوتا رہے۔ بقاء کے لیے ضروری تھا کہ ان اندھیروں کو شکست دی جائے اور اپنی شمع کی حفاظت کی جائے۔ اس کے لیے معاشرتی نظام میں ایک اور پہلو کا از خود اضافہ ہو گیا اور وہ مستعدی اور عسکریت کا پہلو تھا۔

آج کل اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُننے گئے ہیں کہ ہم مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے اندر اور باہر ہم پر فکری اور شیش ہو رہی ہیں اور عسکری یورشوں کی دھمکیاں برابر چلی آرہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اسلام کو کب دھمکیاں نہیں دی جاتی رہیں۔ تھکے میں طوفانِ سب و قتم تھا۔ مدینے میں سازشیں تھیں۔ پھر قیصر و کسریٰ کے عساکر کا ہجوم۔ پھر اندرونی خلفشار۔ پھر حروبِ صلیب۔ پھر فتنہ تاتار۔ پھر مغربی استعمار۔ غرض یہ کہ ہمارے چہرے کو کھل کرنے کے لیے کیا کیا آندھیاں نہیں اٹھائی گئیں۔

ان پلے بے پلے اُبھرنے والی آندھیوں کا مقابلہ ناممکن ہو جاتا اگر امت کے روبرو حضورؐ کا اسوۂ حسنہ نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف انسان کے دل میں جستجوئے حق کا جذبہ ہے تو دوسری طرف اسی دل کے اندر جستجوئے عافیت بھی ہے بلکہ عامۃ الناس کی اکثریت دوسری نوع کی جستجو کی جانب زیادہ رغبت رکھتی ہے اور جب بھی حق جوئی اور عافیت کوشی کے تقاضوں میں تصادم ہوا ہم میں سے اکثر نے گوشۂ عافیت کو ترجیح دی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو جب بھی کسی معاشرے نے عافیت کوشی کو اپنا مطمح نظر بنایا اسے عافیت کمین میسر نہ آتی۔

مدنی معاشرے کی پہلی صفت چنانچہ یہ مقرر کی گئی کہ وہ ہمہ وقت مستعد رہے۔ نفسیاتی طور

پر بھی اور بدنی طور پر بھی۔ نفسیاتی طور پر اندرونی ریشہ دو انہوں اور وسوسوں کے خلاف اور بدنی طور پر خارجی جارحیت کے خلاف۔ جنگِ احزاب، میں سمجھتا ہوں، اسلام کا شدید ترین موکر تھا۔ اس سے بدروا اُحد کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں جب اصحابِ بدر کے مدارج کی گواہ خود ذاتِ خداوندی ہو اُس کی اہمیت کیوں کم کر کہ ہو سکتی ہے؟ میں افواج کی تعداد، حالات کی ناسازگاری اور کفر کی آخری بڑی کوشش کے پیش نظر جنگِ احزاب کو شدید ترین موکر کہہ رہا ہوں۔ افواج کی تعداد پر خود لفظ ”احزاب“ گواہ ہے۔ محاصرہ، سردی کا موسم، یہودی کی اندرونی فتنہ انگیزیاں، مسلمانوں کی بے سرو سامانی، ان سب نے مل کر جو کیفیت پیدا کر دی تھی وہ خود قرآنِ حکیم کی زبان میں یوں بیان ہوئی ہے۔ ”جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے اور جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھر آگئیں۔ کیجئے نہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والوں کا خوب امتحان ہوا۔ بڑی ابتلا میں ڈالے گئے اور بڑی طرح بلا مارے گئے“ (۱۰۹، ۸۰: ۳۳)

جب حالت یہ تھی تو اس وقت ارشادِ خداوندی ہوا کہ نبیؐ کے اسوہ کو پیشِ نظر رکھو۔ تمہاری تقلید کی دہ شے۔ دیکھتے نہیں کہ نفسیاتی طور پر وہ یقین و ثبات کا پھاڑ ہیں اور بدنی طور پر ہر دشوار چٹان اُن کی ضرب کے تحت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ پُر امید اتنے کہ سنگ و آہن کے تصادم سے بکھرنے والی چنگاریوں کے درمیان قیصر و کسریٰ کے در و بام کو ز میں بوس ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، پُر بہت اتنے کہ پورے شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے کہ دشمن کسی ناکے سے نقب نہ لگا سکے۔ مسلمان معاشرہ گویا ایک امانت تھی جس کی نگہداشت اُن کا فرض تھا۔ رُوحانی طور پر بھی، جس امت کے لیے وہ دعائے نیم شبی میں آنسو بہاتے ہوں اُس پر دشمن کا شب خون پڑنا ہوا کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ کیا جنگِ احزاب سے بڑی دشواریاں آج ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں؟ معاف کیجیے گا، دشواریاں بڑی نہیں۔ بہتیں پست ہیں۔

اخلاقِ نبویؐ پیشِ نگاہ نہیں۔ یاد رکھیے اخلاقِ نبیؐ کا ایک اہم جزو، عسکریت تھی۔ آج ”جنگِ ہمہ گیر“ (TOTAL WAR) کا تصور عام مُسنے میں آتا ہے کہ کس طرح قوم کا ہر فرد اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں شریکِ حرب و ضرب ہوتا ہے۔ بتائیے کہ ابتدائی دور میں اسلام کی کون سی جنگ ہمہ گیر نہیں تھی۔ کیا بچے اور عورتیں گھروں کی زینت بنے رہے؟ کیا نبیؐ کے پتے گھرنے کی خواہشیں پیش نہیں تھیں؟

کہتے ہیں کہ نیپولین کے خلاف وائٹر لوکی جنگ ایٹن اور تیرہ کے کرکٹ کے میدانوں میں جیتی گئی یعنی جو ڈسپلن ان درس گاہوں کے کھیل کے میدانوں میں سیکھا گیا وہ ضبط و نظم جنگ کے میدان میں کام آیا۔ تو کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بدر و احزاب کے معرکے، مسجد نبویؐ میں جیتنے گئے کہ وہاں کی تربیت، مسلم معاشرے کو اتنا مستحکم و مربوط بنا گئی کہ پھر کوئی معرکہ ناقابل تغیر نہ رہا؟ معاشرہ جتنا مربوط ہوگا اُس کی ضرب اتنی کاری ہوگی۔ مربوط معاشرے سے مراد تنگ و محبوس معاشرہ نہیں۔ تنگی اور حبس نشوونما کی دشمن ہوتی ہے مربوط سے مراد ایک قدم و یک منزل ہونا ہے ”قبیلے کے خیمے خواہ مجھدا مجھدا ہوں دل یکجا ہوں“ دونوں کو یک جا کرنے کی منزل اور کے ایک سبیل اسلام نے جو پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ خلق کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ انفرادی خلق اور اجتماعی خلق۔

انفرادی خلق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان، زندگی کو عطیہ خداوندی سمجھے۔ زندگی کا احترام کرے۔ اس کی حفاظت کرے کہ بھی اور اسے کسی ارفع و اعلا مقصد پر قربان کر کے بھی۔ اور چوں کہ یہ بات اٹل ہے کہ زندگی ہوگی تو مقصد حاصل ہوگا، اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ جسم کی حفاظت اور اس کی تربیت کرے تاکہ فعال زندگی بسر کر سکے۔ مختلف علتوں کا شکار ہو کہ صحت تباہ کرنے کو اسلام نے سخت ناگواری سے دیکھا ہے۔ اسی طرح غار و کوہ کی زندگی اختیار کرنے کو منع کیا ہے، اس لیے یہ دونوں طرح کی زندگیاں ادائے امانت سے فرار ہیں۔ انسان اگر کیلاش پربت پر سادھی لگا کے بیٹھ جائے اور خود گیان دھیان کا اندا اٹھا آ رہے تو یہ خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا شخص نیچے میدانوں میں ریٹکے والی دُکھی مخلوق کے کسی کام کا نہیں۔ ایسا شخص بظاہر اپنی اغراض سے قطع تعلق کیے ہوتا ہے، لیکن یہی شخص جو بیوی بچوں کے تعلق کو موہ مایا سمجھتا ہے صرف اپنی ہی جیو کی ملتی کے لوبھ میں پھنسا ہوتا ہے۔

اجتماعی خلق سے رہنہ ضبط و نظم و ہم آہنگی آتی ہے اور یہ صفات پیدا ہوتی ہیں مساوات سے، اسلام فی الواقع فرد کے کمال کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا کمال بھی چاہتا ہے، کیوں کہ اسے ایک ہمہ گیر اور عالمی مشن لے کے آگے بڑھنا ہے اور یہ کام جمعی انجام پاسکتا ہے جب انسان جماعت کا رکن ہو۔ اور یہ رکنیت ایمان پر مبنی ہو۔

ایمان ابریت کے البعاد (DIMENSIONS) کو پھیلا دیتا ہے اور جماعت کے ساتھ ایمان کی بہ دولت جو نسبت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ انسان کو ایک ہمہ گیر پیغام کی رو میں شامل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایمان انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے خلق کا بنیادی عنصر بن کر مختلف نوع کے

انسانوں کو ایک معاشرے میں پروتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ایمان چوں کہ خود ناقابل تقسیم ہوتا ہے، اس لیے اس کے احاطے میں داخلہ نیم دلائل نہیں ہوتا، چنانچہ مکمل طور پر ایمان لانے کا حکم ہے اس معاشرتی نظام کی جو اخلاقی بنیادی روشنی میں تشکیل پاتا ہے چند خصوصیات یہ ہیں۔

(i) ہر شخص عہدیت کا سیکر ہوتا ہے۔

(ii) اس کا دائرہ محبت پوری نوع انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ ہر کافر کو بھی ہونے والا مسلم سمجھتا ہے۔

(iii) ہر شخص خود کو امین سمجھتا ہے اور اداۓ امانت میں ہمہ وقت کوشاں ہوتا ہے۔ اس میں حضور کا امین کا لقب پانا، دلیل راہ ہے۔

پھر حضور کی ہجرت کی رات اور اُن کا عہد کا دن کسے یاد نہیں۔ علی المرتضیٰؑ سے فرمایا کہ بھائی یہ امانتیں ادا کرتے آنا۔ امانتیں ایسے لوگوں کی جنہوں نے ترک وطن پر مجبور کیا اور جو خون کے پیاسے تھے۔ یہ ایفائے عہد کی لاثانی مثال ہے، لیکن ایک بات اور ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔ درست ہے کہ حضورؐ، چاندی اور سونے کے کچھ سکوں کو اُن کے حق داروں تک پہنچانے کا حکم دے آئے تھے، لیکن خود سب سے بڑی امانت ادا کر کے تشریف لے جا رہے تھے، اور وہ امانت تھی پیغامِ خداوندی کی ترسیل، اس لیے کہ جب دس برس بعد عرفات کے میدان میں ایک جہمِ غفرے پوچھا کہ کیا میں نے امانت ادا کر دی ہے تو لوگوں نے گواہی دی کہ ہاں حضورؐ کر دی ہے۔ اس کے بعد اللہ کو گواہ بنایا۔

سُبْحَانَ اللَّهِ اداۓ امانت میں یہ ذمہ داری، یہ لگن، یہ اضطراب، ان میں سے ہر جذبے کا یوں حسین ہونا کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جالہ نجاست۔

اداۓ امانت کے عمل میں ہر شخص یوں مستعد ہوتا ہے کہ بدنِ ملت کی امانت ہوتا ہے اور یوں جاں سپار کہ جانِ مہولی کی امانت ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان جان سے بھی گزر جائے تو یہ کہتا ہوا جائے۔

جان دی، دی ہوئی اُمی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

غرض یہ کہ، اسلامی تمدن تمام تر ایک ہی نکتے کی تفسیر ہے۔ اداۓ امانت کی۔

# اسلامی نظامِ عدل و احسان

جناب محترم ڈاکٹر سید محمد حیدر

اسلامی نظریہٴ عدل کا افہام اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خالق و مخلوق اور حیات و ممات کا ادراک نہ کیا جائے۔ اسلامی فلسفے نے صحیح اور جامع طور پر ان رشتوں کا تجزیہ کیا ہے جو بعد و معبود کا ثنات و افراد کو مربوط کرتے ہیں۔ اس فلسفے سے ان رشتوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو ہر مملکت کے شہریوں کے آپس کے تعلقات اور بین الاقوامی تنظیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان رشتوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی نظریہٴ عدل میں ویسی ہی جامعیت اور وضاحت موجود ہے جو فلسفہٴ اسلام کے تحت تمام زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

اسلامی نظامِ عدل زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے۔ یہ محض اقتصادی امور کو زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ اس کے دائرہٴ کار میں وہ خیالات اور احساسات و رجحانات بھی شامل ہیں جو بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ و رتبہ دے کر ممتاز کرتے ہیں۔ دراصل اسلامی نظامِ عدل مختلف اقدار کے امتزاج سے معرضِ وجود میں آیا ہے جو دنیوی و دینی زندگی، روحانیت و مادیت، اخلاقیات و معاشیات کو مربوط کرتا ہے۔ اسلامی تصورات کے تابع انسانی زندگی حقیقی معنوں میں ایک وحدت ہے جس میں حیوانی خواہشات و روحانی ضروریات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ ان کو کسی صورت میں علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نقطہٴ نظر سے محبت و یگانگت، تعاون و اشتراک کے خیالات و رجحانات انسانی زندگی کی اساس ہیں۔ اسلامی فلسفہٴ انفرادی و اجتماعی مفادات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ انسانی آرزوؤں، تمناؤں اور حوصلوں کے ساتھ ساتھ فلاحِ عامہ کی منصوبہ بندی اسلامی سماج میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اسلامی اعتقادات نہ تو افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اپنی حرص و طمع سے سماجی زندگی کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیں نہ سماج کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انفرادی قابلیت و قابلیت، ذکاوت و ذہانت کو کچل کر ان کی شخصیات کو غیر موثر بنا دیا جائے۔

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، دنیا اور آخرت اور زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔ اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض و قوانین، ہدایات و حدود کی راہیں ابھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزاء ترکیبی و اصولی اسی اصل میں پنہاں ہیں۔

اسلامی نظام عدل مساوات کا نام ہے جس میں تمام اقدار حیات کی متوازن اور ہم آہنگ تحصیل عمل میں آتی ہے۔ البتہ فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ بعض افراد جسمانی و دماغی صحت، قوت برداشت اور جسمانی و ذہنی معراج حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ لاغر و نحیف کمزور و بیمار پیدا ہوتے ہیں۔ تمام صلاحیتوں اور ہر طرح کی استعداد کو مساوی کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

غیر معمولی بلند اور اعلیٰ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے وجود سے انکار بے معنی ہے۔ اسلام ان کی پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ لہذا غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے افراد کو مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ اپنے ثمرات بروئے کار لائیں۔ ان ثمرات میں سے اجتماعی مفادات کی خاطر جن اشیاء کی ضرورت ہو انہیں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام اطباء حکیم محمد سعید بنیں بن سکتے، البتہ بن اطباء میں حکیم سعید بن جلنے کی خواہش مضمر ہو انہیں تقویت اور سازگار ماحول بہم پہنچایا جاسکتا ہے تاکہ وہ فلاح عامہ کے لیے زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں۔ اسلامی نقطہ نظر نے سنی پیہم اور جدوجہد کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ البتہ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ ترقیاں و کامرانیاں حاصل کرنے کی یہ پرواز اس طور پر جاری رہے کہ انسان غیر متقی نہ بننے پائے، کیونکہ اللہ ان ہی کو بلند مراتب سے سرفراز فرماتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ یہ مالی اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی منگنا مآرائی ہیں۔ اللہ کے نزدیک باقی رہ جانے والی نیکیاں و تقویٰ ہی بہتر ہیں اور انہیں سے معقول امیدیں و البتہ کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی نظام عدل کی لازمی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔ کسی شخص کی راہ میں حسب و نسب، رنگ و نسل، ذات و جماعت سے متعلق خیالات رکاوٹیں پیدا نہ کریں۔ عنبر انسانی کو خالص مادی و معاشی اقدار کی خلاف عقل پیروی سے آزاد کر دیا جائے



مال و دولت کو قدر اعلیٰ یا قدر کل کی صورت میں پیش کرنے کی اجازت نہیں زندگی محض روٹی پر نہیں اور مکان کے گرد طواف نہیں کرتی۔ انسانی زندگی کا نصب العین معاشی ذمہ دار لیوں کو قبول کرتے ہوئے کسی بالا تر منزل کی جانب گامزن ہونے کی رہبری کرتا ہے۔

اسلام دولت کے سلسلے میں مالداروں پر غریبوں کا ایک حق واجب کر دیتا ہے۔ اس حق کا تعین سوسائٹی کے مفادات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سماج میں عدل قائم ہو۔ ایک مدت تک مساوات کے قیام کے لیے فضا سازگار ہو۔ ترقی کی نئی شاہراہیں کھلیں۔ اس طور پر اسلام مادی و معنوی، دینی و دنیوی تمام پہلوؤں کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔

اسلام دنیا میں مکمل طور پر نظام عدل قائم کرنے کا آرزو مند ہے لہذا کسی نوبت پر محض اقتصادی عدل کو فوقیت نہیں دی گئی، اور یہ بھی مناسب تصور نہیں کیا گیا ہے کہ قانونی ذمہ داری ہی اس عدل کے قیام کا واحد ذریعہ بنے۔ چنانچہ اسلام نے اس نظام عدل کو ایک وسیع اور سمجہ گیر انسانی نظام عدل کی شکل دی۔ فرد کی سطح پر انسانی ضمیر اور سماج کی سطح پر قانونی ضابطہ بندی، اسلامی نظام عدل نے دونوں کو مربوط کیا اور ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو وہ آدمی کے وجدان میں راسخ تاثرات اور جذبات کو ابھارتا ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی غافل نہیں رہتا۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو ہدایت کی ہے کہ جس طرح اللہ نے ان کے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کریں۔ والدین سے نیک تہاؤ و قربت داروں، مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین قرآن حکیم میں مندرج ہے۔ ہمایوں سے، رشتہ داروں سے اور مسافروں سے احسان کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ جو کج نیتی کرے اور دوسروں کو کبھی کج نیتی کی ہدایت کرے۔ حکم ربی ہے کہ:

”تم میں جن لوگوں کو مال اور مالی فراخی فہیب ہے ان کے لیے مناسب

نہیں کہ قربت داروں، مسکینوں اور راہِ خلا میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ

کرنے کی قسم کھا بیٹھیں۔“ (النور: ۲۲)

اسلام انسانی شعور کو عدل کے علاوہ احسان کے اعتبار سے بھی ایک بلند سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ شعور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کے عز و شرف کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ احسان کے تصور میں بھی بلندی پیدا کرتا ہے اور اسے خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ ص ۱۰۶۔ کہ لیے ایسے آداب مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ صاحب مال کی طرف سے غریب پر تفوق و برتری کا اظہار نہیں بننے پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صدقہ کے محرکات پست ہوں اور جو شخص صدقہ تبدیل کرے اس کو احسان کا احساس دلایا جائے تو صدقہ بے معنی بن کر اپنے نیک اثرات زائل کر دیتا ہے۔ اسلام، دینے والوں اور لینے والوں دونوں کی طبیعت میں علو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ رب العزت قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے: (ترجمہ) ”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالین نکلیں اور ہربالی میں ستر دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزائش عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں بھناتے (اور) نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے سچے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُرد باری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو دکھ دے کر اور احسان بھنکا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض ناشائستگی کی خاطر لوگوں کو دیتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ (البقرہ ۲۶۶-۲۶۷)

غرضیکہ اسلامی نظام عدل کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے جن میں قطریات احسان بھی شامل ہیں۔ یہ نظام روحانی اور مادی دونوں طرح کی قدروں پر حادی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ یہ نظام قوانین کو ان کی اصل شکل میں نافذ کرتا ہے، معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی نگرانی کرتا ہے، اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم کرتا ہے۔ اسلامی نظام عدل کی بنیاد صرف اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے جبکہ اسلام کے علاوہ دوسرے نظام مائے عدل کی اساس اس اصول پر قائم ہے کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لیے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔

اسلامی نظام عدل کا گہرا تعلق تحفظ عزت نفس سے ہے یہ وہ نظر یہ ہے جس نے

تمام اقوام عالم کو متاثر کیا ہے۔ دنیا میں اسلام کا وقار بڑھانے میں اس خیال نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ سے ماسخود تحفظِ عزتِ نفس کے نظریہ نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ مسائل اور تعلقات میں کشیدگی صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اکثر ممالک نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر تحفظِ عزتِ نفس کا خیال نہیں کیا۔ اب باوجود اس کے کہ مادی و اقتصادی وسائل میں کئی گنا اضافہ ہوا لیکن عزتِ نفس کے مجروح ہونے سے ذہنی انتشار اور الجھنیں بھی بڑھ گئیں، نہ صرف مختلف ممالک، ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے بلکہ ترقی پذیر ممالک کے شہری بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ اندرونی طور پر ان کی عزتِ نفس کا معقول خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسلامی حکومتوں نے ایسی صورت میں مؤثر نظام عدل سے معاملات پر تباہی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نظام عدل کو دیر پا بنانے کے لیے کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس کے تقرر کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس پاکستان میں ضلع کی سطح پر مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مستقل سرکاری ملازم نہیں ہوں گے بلکہ اعزازی طور پر کام کریں گے۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں معقول الاؤنس دیا جاسکتا ہے۔ کمشنران کا انتخاب عوام الناس کریں گے جو اس ضلع کے مستقل باشندے ہیں جہاں انتخاب عمل میں آئے ہے۔ وہی شخص بحیثیت کمشنر منتخب ہو سکے گا جو اپنی دیانتداری، غیر جانبداری، منصف مزاجی، حب الوطنی، اسلام دوستی اور شہری حقوق کے احترام کے لئے مثبت شہرت رکھتا ہو۔ بالغ ہو، صاحبِ نظر ہو، مجرم نہ ہو، ملزم نہ ہو، عوام اور انتظامیہ دونوں سے معقول رشتہ رکھتا ہو اور دونوں کے مسائل پر اسے دسترس حاصل ہو۔ کمشنر کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل ہوگی کہ وہ مواضعات اور ضلع کے قصبات کا دورہ کر کے معلوم کرتا رہے کہ اس علاقے میں عوام کے بنیادی حقوق کو تو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اگر بنیادی حقوق تلف ہوئے ہیں تو کیا کسی شخص کے اختیار تیزی کے غلط استعمال سے یہ صورت ظہور پذیر ہوئی؟

کمشنران کو اس بات کی تحقیق کا بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ اگر لیکن انتظامیہ ایسے فیصلے تو نہیں کرتے جن کی موجودگی سے ضلع کے عوام اپنے بنیادی حقوق کو صحیح طور پر بروئے کار نہ لاسکتے ہوں۔ کمشنران کے لیے ان واقعات اور معاملات کا نوٹس لینا ضروری ہے جن سے عوام کو اپنی فریاد و حکام بالا تک پہنچانے سے روک دیا جاتا ہو، یا اپنے مقدمات کی کالٹ کی اجازت نہ ہو، یا مکانات کی ناجائز تلاشی لی جاتی ہو، یا آزادیِ گفتار و کردار سے محروم

کیا جاتا ہو۔ یا جائیداد ناجائز طریقے پر ضبط کی گئی ہو، یا غیر معقول وجہ کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی ہو، یا جبر و تشدد کے ذریعہ سے اقبال حرم کرایا گیا ہو، یا رشوت بالجبر حاصل کی گئی ہو، یا کسی شخص سے بیگاری کی گئی ہو، یا کسی شخص کو اس کی خدمات کا معقول معاوضہ نہ دیا گیا ہو، یا رشوت لینے کی نیت سے کسی معاملہ کے فیصلہ میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہو، یا کسی شخص کی عزت نفس کو بدکلامی سے مجروح کیا گیا ہو، یا کسی شخص کو اس کے استحقاق سے محروم کیا گیا ہو، یا محروم کیا جاتا ہو، یا کسی درخواست گزار کو الٹا کارانہ براساں پر پیشاں کرتے ہوں، یا نجی دشمنی کی بنا پر کسی شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی ہو، یا کسی شخص کو اس چیز کی قیمت ادا نہ کی جاتی ہو جو اس نے انتظامیہ کو فروخت کی ہو، یا کوئی ایسی کارروائی کی جاتی ہو جس سے شکایت کنندہ کے احساسِ خودی و خود اعتمادی کو شدید تکلیف پہنچتی ہو تو کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس اس معاملے کی رپورٹ ممبران (اراکین) مجلسِ شورٰی کو کریں گے تاکہ ایسے معاملات کا سدِ باب ہو سکے۔

حکومتِ وقت کو عوام کی شکایات کا ہر وقت ادراک ہو جس کے نتیجے میں حکومتِ وقت ہر دلعزیز بن جائے اور مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس اسلامی سماج میں فطریہ عدل کو موثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ طریقِ عدل کو زیادہ موثر بنانے کے لیے انتظامی ضابطوں کی تشکیل کی فوری ضرورت ہے۔ انتظامی ضابطوں کی تشکیل کے پس پشت یہ خیال کارفرما ہے کہ جن افراد کو انتظامی فیصلوں سے صدمہ پہنچا ہے وہ ان ضابطوں کی مدد سے ان افسران پر پابندیاں عائد کر دیں جو اپنے معقول حدود سے متجاوز ہو کر عوام کی ایذا رسانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ان ضابطوں کو قانونی شکل حاصل ہونی چاہیے۔ ان ضابطوں کا مقصد اذیتیں پہنچانا چاہیے کہ تمام سرکاری ملازمین کو اسلامی قوانین کا اس حد تک تابع بنا دیا جائے کہ وہ اپنے اختیارات تمیزی کا استعمال ان اختیارات و دفعات کے باہر نہ کر سکیں جو مروجہ قوانین نے فرائض متعلقہ کی انجام دہی کے لیے انھیں تفویض کیے ہیں۔

ان ضابطوں کے تحت الٹا کارانہ انتظامیہ کو اس بات کا عادی بنایا جاسکتا ہے کہ وہ مختتم نتائج پر پہنچنے سے قبل امور زیرِ غور سے متعلق تمام دستاویزات و زبانی شہادتیں کبھی کر کے ان کی صحت کا اندازہ نہ کریں۔ صحیح بات معلوم کرنے کے لیے الٹا کارانہ کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ فریقینِ مقدمہ کی پیش کردہ شہادت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی ان واقعات

کی صحت کا اندازہ کر لیں جو معاملات زیر غور سے متعلق ہیں۔

ہر انتظامی فیصلہ کے خلاف کم از کم ایک اپیل کی اجازت ہر صورت میں ہونی چاہیے۔ انتظامی ضابطوں میں اس بات کی ضمانت ہونی چاہیے کہ اراکین انتظامیہ ایسے فیصلے نہیں کر سکیں گے جن سے قانون شکنی ہوتی ہو، مفاد عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہو، یا کسی شہری کے آئینی حقوق تلف ہوتے ہوں۔ انتظامی ضابطوں کے یہ مقاصد بھی ہوتے ہیں کہ انتظامیہ کے طریق کار میں عوام کا اعتماد قائم رہے۔ تعلیم نہ ہونے کی بنا پر یا لاعلمی کی وجہ سے کسی شخص کو نقصان نہ پہنچے۔ ان ضابطوں سے تمام اہلکاران انتظامیہ کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہر اس فیصلے کا ہوانہ، اسباب و علل بھی تحریر کریں جو انتظامی فیصلہ کے محرک بنتے ہیں۔ یہ انتظامی ضابطے اراکین انتظامیہ کو ایسی خفیہ کاری سے باز رکھ سکتے ہیں جن کی خفیہ نوعیت سے مفاد عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ انتظامی ضابطے ان اہلکاران کو فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جو متبادل خیالات کو صحیح طور پر وزن کر کے ان میں توازن نہ پیدا کر سکتے ہوں۔

ان انتظامی ضابطوں سے انتظامیہ کی سطح پر پیدا شدہ بدینتی، بغض و حسد اور تعصب کو سبھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ غرضیکہ کمشنران برائے تحفظ عزت نفس کی تقرری اور انتظامی ضابطوں کی تشکیل سے اسلامی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔ ایسی بنیادیں جن میں فلاحی مملکت کا راز مضمر ہے، جن سے حکومت وقت کی عزت، شہرت اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے، جن سے اخلاقیات نبوی کے اثرات تمام سوسائٹی کو محیط کر سکتے ہیں۔ جن سے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اپنے خالق حقیقی کے ایمان کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہو سکتے ہیں۔ اس طور پر اسلامی نظام کے خطوط واضح ہوں گے اور اس کے نعوش تمام عالم کو تابناک بنا دیں گے۔

# تربیت فرد کا نبوی طریق

جناب محترم ڈاکٹر خالد علوی

آج کا انسان منظم معاشرتی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے اس امر کا شاید احساس نہیں کہ اس تنظیم کے حصول تک اسے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ منظم معاشرتی زندگی نے انسان کو بے پناہ منفعتیں عطا کی ہیں۔

انسانی کادشوں نے جو اجتماعی ادارے تخلیق کیے اور پروان چڑھائے ہیں وہ ان کی فکری وسعتوں اور علمی عظمتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اجتماعی شعور رکھنے والا جب گرد و پیش میں معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تفریحی ادارے (انسٹی ٹیوشنز) دیکھتا ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے، اسے اپنی ذات اور علاقے کا ایک گورنر محظوظ حاصل ہوتا ہے۔ منظم معاشرے نے انسان کو تحفظ دیا ہے لیکن اس کی بعض انفرادی خوبیاں اور شخصی حسن کی رعنائیاں سلب کر لی ہیں۔ معاشرہ ایک غیر مری وجود ہے اور اس کے تمام اجتماعی مظاہر انفرادی کے ذریعہ سے افراد ہی کے حلال یا حق میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرد اور اجتماع کی یکسوئی و تخیب و تعمیر کا تامل تو بے منظر پیش کرتا ہے۔ شکست و ریخت اور بناؤ اور بگاڑ کی پوری انسانی تاریخ انسان کے عزم و ہمت کی داستان ہے۔ ہمارا ہر فرد و اجتماعی حالات اور معاشرتی ماحول میں جکڑا نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد کی باغیانہ حرکت، پرسکون سمندر میں طوفانی لہروں کی شکل اختیار کرتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا اجتماعی ڈھانچا ڈوبتی کشتی کا نظارہ پیش کرنے لگتا ہے۔ نور وحی کی کرنوں سے محروم ملکا کے عمرانیات ابھی تک فرد اور اجتماع کے رشتے کو سنوارنے میں مصروف ہیں اور تاحیروز آخری اور قطعی فیصلہ دینے کے قابل نہیں۔

غیر موزان طریق شک کے بجائے علم حسیقی کی صداقتوں کو بنیاد بنانے والوں کے ہاں فرد اور اجتماع کے مابین تعلق کا ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام انسان کے اجتماعی شعور کو ملحوظ رکھتا ہے اور باہمی میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے نشو و نما میں معاونت کرتا ہے۔ وہ ایسے فطری اصول دیتا ہے جن سے اجتماعیت کو تقویت ملے۔ وہ اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ایسے عوامل کا قلع قمع کرتا ہے جو اسے بگاڑیں۔ وہ مفید اور غیر

نفیدر جمعیتوں میں تیز کا دستور دیتا ہے۔ اسی لیے آنحضورؐ نے فرمایا:

الاکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ -

یعنی: سنو تم میں سے ہر ایک نگراں اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے مانتا (افراد کے بارے میں سوال کیا جائے گا)۔

یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اسلام نردک انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اجتماعیت کو بالآخر فرد ہی کی اصلاح و صلاح کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔

تمام انبیاءؑ کے مشن میں بالعموم اور خاتم النبیینؐ کے پروگرام میں بالخصوص فرد کی اصلاح تربیت سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مدینہ کی ثنائی ریاست کی تنظیم اور آئینہ عمل معاشرے کی تشکیل انہی تربیت یافتہ افراد کی بدولت ہوسکی۔ حضورؐ کی تعلیمات میں فرد کو اس امر کا احساس دلایا گیا کہ وہ اپنے گناہوں کا تنہا ذمہ دار ہے۔ جو مزا اسے ملتی ہے اسے کوئی اور نہیں اٹھائے گا۔ معاشرتی جرائم کی ایک سزا تو اجتماعی ہے جسے معاشرہ ہی ناکند کرتا ہے لیکن فرد کا انفرادی معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے جسے اس کو ہی بنانا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوگا۔ لہذا اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اپنا فرض پورا کرنے میں دوسرے کا منہ نہیں کھنچنا چاہیے۔ اسے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ فلاں شخص نیکی نہیں کر رہا تو میرے کیوں کر دیں؟ اسے صرف اپنا دامن گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کا معاشرتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص اپنا احتساب کرتا ہے، اپنی اصلاح کرتا ہے اور اپنی برائیوں کے لیے دوسرے کو گونہ نہیں بناتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اکا دکا کہیں کسی نازیبا حرکت کا ارتکاب ہوتا ہے تو مرکب اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے، عریاں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اس اصولی قاعدے کو اس طرح بیان کیا:

علیکم انفسکم لا یضوئکم من ضل اذا اھتدیتم الیہ

یعنی: اپنی فکر کو جب تم میری راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

فرد کی اس ذمہ دارانہ حیثیت کو مختلف پیالیوں میں اس طرح بیان کیا:

ولا تکسب کل نفس الا عیدھا ولا تنزو اذرقه وراخریٰ ۛ

یعنی: اور جو کوئی (بڑا) فعل کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

۱۔ اسلام کا معاشرتی نظام ۲۵۰ ۲۔ القرآن، ۵: ۱۴ ۳۔ القرآن، ۶: ۱۶۴

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلها۔  
 یعنی: اگر اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کر دے گے اور اگر  
 بُرے کام کر دے گے تو (ان کا) دیاں بھی تمہاری جان پر ہوگا۔

یہ ایک مسئلہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل  
 بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبادت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی  
 گئی ہے، حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت و  
 جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظام فکر میں فرد ہی وہ اصل اکانہ ہے جس کو ابتداء میں عامل  
 کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آئی کی عقل اور جذبات سے اپیل کی گئی ہے۔ اسی کو اپنی ہدایت  
 اور رہنمائی کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ دین اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔  
 اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گر دے تو آخری فیصلے میں اس جماعت  
 کی اجتماعی نوبت اس کے لئے کچھ مانع نہیں ہو سکتی جس کے ساتھ وہ دنیا میں اپنا تعلق رکھتا تھا۔

## مقصد

فرد کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر اس کی تہذیب و تربیت اور تعلیم و تزکیہ کی طرف  
 خصوصی توجہ دی گئی۔ آنحضرتؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں تربیت کا ایک جامع پروگرام دیا جس میں مکرر  
 عمل اور تدریس و جد کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ غیر الہامی معاشروں نے اپنے افراد کی تربیت کا مقصد  
 "اچھا شہری بنانا قرار دیا ہے لیکن اچھا شہری ایک ایسی اصطلاح ہے جسے ہر اجتماع اپنے معیار  
 پر جانچے گا۔ اس کے لیے کوئی ہمگیر اصول یا ضابطہ نہیں بنایا جاسکتا۔ وطن پرستی، نسل پرستی، قوم  
 پرستی، ترک دنیا اور قومی فساد کی خاطر دوسروں پر ظلم و تشدد و تک سب کچھ اچھا شہری کے اوصاف  
 میں آسکتا ہے۔ اس کے برعکس نبوی پروگرام کا مقصد فرد کو ایک اچھا انسان بنانا ہے۔ وہ اس  
 کے جوہر انسانی کے نشوونما ارتقاء کا اہتمام کرتا ہے اور اسے رحمت کا پینا مہر بنا کر معاشرے میں  
 بھیجتا ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے:

وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

یعنی: تمہاری قومیں اور برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک  
 تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

لہ۔ القرآن: ۱۴: ۷۷ - اسلام کا نظام حیات، ۱: ۴۹: ۳۰



نبوی نقطہ نظر سے فرد کی تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کی ایسی متوازن تعمیر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ صالح ہو بلکہ معاشرے میں صالحیت کے نشرو نما کا باعث و داعی بنے۔ یہ صالح متقی انسان وہ ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ ہی کی رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس ارشاد خداوندی کا مصداق بناتا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون ۝۱۶

یعنی : میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس تقویٰ شعار اور صالح انسان کی تیاری کے لئے رسول اللہ نے جو جامع پروگرام دیا ہے وہاں اس کے صرف دو بنیادی اصولوں کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ایک تعلق باللہ اور دوسرے خدمت خلق۔ فرد کی تربیت میں ان دو اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

## تعلق باللہ

انسان اعمال کا انبساط منحصر ہے فکری کجیہی رپا کیزگی پر۔ رسول اللہ نے تربیت فرد کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شعوری تعلق کو بنیاد بنالیا ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ توحید معبودیت اور توحید ربوبیت کے ساتھ معیت الہی مقصود قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ تعلق باللہ ذات کے شعور و لاشعور کا حقہ بن جائے۔ مسلمان معاشرے میں بچے کے کان میں اذان دینے کا عمل اس بات کی علامت ہے کہ توحید ربوبیت کا وہ احساس تازہ ہو جائے جو عہد الست میں پیدا ہوا تھا۔ تعلق باللہ ہی وہ واحد اساس ہے جو فرد کی حیات کا رخ صیغ رکھتی ہے اور یہی نبوی طریق تربیت کی بنیاد ہے۔ حضور انسان کو ایسی تربیت دیتا کرتے ہیں کہ ہر لمحہ و ہر لحظہ اس کا تعلق اپنے رب سے برقرار رہے، اس کا تعامل اللہ کے ساتھ ہو، اس میں شیشہ الہی ہو، اس میں حب الہی کی لہریں اٹھتی رہیں اور رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے منہاج زندگی کی جانب رجوع کا جذبہ موجود ہو۔ وہ اپنی خلوت میں مصروف ہو یا اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ ہو، عبادت میں مشغول ہو یا علمی جدوجہد میں لگا ہوا ہو، صنعت و تجارت میں منہمک ہو یا کاریگری انجام دے رہا ہو، صالح و آشتی کے لمحات میں ہو یا نزاع و جنگ لگے اوقات میں، وہ اپنے رب

لے۔ القرآن ۵۱: ۵۶ لے۔ القرآن ۲۱: ۱۶۵

سے بے تعلق نہ ہو۔ اس تعلق کی معراج یہ ہے کہ اللہ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آ جائے۔  
ارشاد خداوندی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّوهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ  
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

یعنی : اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہمسر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس  
طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرتے ہیں، لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے  
ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اس آیت میں بیان فرمادی تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے :  
قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ  
وَأَهْوَالُكُمْ أَنْ يَقْتُلُوكُمْ فَمَنْ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
وَمَسَاكِينُ تَوَضُّعُوا لَهَا حُبَّ الْإِسْلَامِ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ  
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ

یعنی : اے رسول! مسلمانوں سے کہہ دیں اگر تمہیں اپنے باپ، دادا، بیٹے، بھائی،  
بیوی اور رشتہ دار اور وہ اموال جو تم نے (بڑی محنت سے) کمائے ہیں اور وہ  
تجارت جس کے مندا پر جانے سے تم بہت ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم بہت  
عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں کوئی چیز بھی تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور  
اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ  
کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ ناسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔  
کتب حدیث میں "الحب فی اللہ" کے ابواب میں آنحضورؐ کے مختلف ارشادات منقول  
ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حب الہی کمال ایمان و دین ہے اور فرد و من سے یہ مطلوب ہے  
کہ وہ جذب حب الہی سے سرشار ہو۔ شلاً :

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مِنْ كُنْ فِيهِ  
وَجِدَ حِلَاةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحِبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَا  
هَؤُلَاءِ وَأَنْ يَحِبَّ الْمَرْءُ لَا يَحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ تَعَالَى وَأَنْ يَكُونَ

يعبود في الكفر كما يكفره ان يقذف في النار۔

یعنی: حضرت اثنی عشر رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین صفات ایسی ہیں جس میں پائی گئیں وہ ایمان کی لذت پاگیا۔ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب تر ہوں، یہ کہ انسان کسی سے صرف اللہ کے لئے پیار رکھتا ہو اور یہ کہ کفر کی جانب لوٹنا اسے ایسا ہی مکروہ لگے جب اسے آگ میں ڈالا جانا نا پسند ہو۔ (مشکوٰۃ تناب الادب باب الحب فی اللہ ص ۴۲)

اس محبت کے نتیجے میں انسان کو اللہ کی معیت و محبت حاصل ہوتی ہے جو بندے کے لئے بے مثال کیفیت ہوتی ہے کسی عاشق نے کہا ہے:

نسیت کل طریق کنت اعرفه الا طریقا یسود ینی مرحبا  
اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت اور بندے کی محبوبیت کا برملا ذکر کیا ہے۔ فرمایا:  
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَاَلَّذِیْنَ هُمْ یُحْسِنُوْنَ ۝۱۶  
یعنی: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی۔

حضرت موسیٰؑ نے اس معیت کا اظہار اس طرح فرمایا:

اِنَّ مَعِيَ رَبِّیْ سَیِّدِیْ ۝۱۷  
یعنی: بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے یقیناً میری رہنمائی کرے گا۔  
حضور اکرمؐ نے بھی ہجرت کے موقع پر اسی معیت کا ذکر کیا تھا:

لَا تَحْزَنُ رَاۤیَ اللّٰهِ مَعَنَا ۝۱۸  
یعنی: تم غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضورؐ نے جب الہی اور معیت رب کا جو احساس پیدا کیا اس کے حصول و استحکام کا ذریعہ بھی بتا دیا۔ بلاشبہ یہ یقین تو فیق الہی اور فیض ربوبیت ہی سے حاصل ہوتی ہیں لیکن انسان سطح پر جو کوشش ہو سکتی ہے اس کی جانب رہنمائی سے محروم نہیں رکھا گیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاَتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمْ اللّٰهُ ۝۱۹  
یعنی: آپ کہہ دیں اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

۱۔ القرآن ۱۶: ۱۲۸ ۲۔ القرآن ۲۱: ۶۲ ۳۔ القرآن ۹: ۲۰ ۴۔ القرآن ۳۰: ۳۱

آنجنابؐ نے محبت خدا وندی، معیت الہیہ اور قرب ربانی حاصل کرنے کے طریقے بیان فرمائے:

ما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببہ فاذا احببہ کُنْتُ سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یراہ بہ ویبصر بہ ویدہ الذی یمس بہ ورجلہ الذی یمشی بہا وان سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لأعینہ۔<sup>۱</sup>

یعنی: بندہ برابر طاعت و عبادات کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اُسے محبوب بناتا ہوں اور جب میں اس سے پیار کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں ہی اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے طلب کرتا ہے تو میں دیتا ہوں۔ وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

معاذ اللہ اس کا مطلب حلوٰں نہیں ہے، یہ بندہ کی اس کیفیت کا ذکر ہے جس میں وہ مرضی الہی کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ تعلق باللہ کو مستحکم کرنے کا مفصل پروگرام دیا گیا ہے۔ آنحضور نے وحی الہی کی دہائی میں چند اصول بتائے جو اس تعلق کو مستحکم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن و سنت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت، ذکر الہی، مصاحبت صالحین، استقامت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ عبادت انسان کی موعجہ ہے، اسی کے ذریعہ سے انسان عبدیت میں پختہ ہوتا ہے، شرک فی المعبودیت سے نجات حاصل کرتا ہے اور اللہ کی معیت و قرب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ارشاد خدا وندی ہے:

وَأَقْرَبُ إِلَیَّ

یعنی: بے رسولؐ سجدے کئے جائیے اور قرب حق حاصل کئے جائیے۔

یہ موقع عبادت کے مفہوم کو بیان کرنے کا نہیں، صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ عبادت الہی کی تاثیر ہے کہ انسان مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ مادی قوت جو منہاج ربانی سے سٹی ہو باطل ہے، اور باطل سے مقابلہ لازمی ہے۔ یہ عبادت کا اثر ہے کہ انسان باطل کا مقابلہ کر لے۔ اس سے وہ بے پناہ قوت اور ناقابل شکست اعتماد حاصل کرتا ہے اور قرآن پاک کی اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے:

۱۔ مشکوٰۃ کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، ۱۹۷ - ۱۹۸ - القرآن، ۹۶: ۱۹

وَلَا يَهْنُوا وَلَا تَحْزَنُوا ۚ أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۚ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝  
یعنی: دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔  
عبادت کے ساتھ ذکر و فکر کا عمل اس استحکام میں مدد دیتا ہے۔ اللہ کی آیات میں غور و  
فکر اور اس کی یا تربیت نفس کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان کے باعث انسان اللہ تعالیٰ کے جلال کا شعور  
احساس رکھتا ہے اور نفس کے فریب میں نہیں آتا مگر وغرور اور ظلم و ذرعویت جیسے رذائل سے  
محفوظ رہتا ہے۔ قرآن پاک نے مومنین کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالاٰخِلَآءِ الدَّلِيْلَ ۚ وَالنَّهَارِ اللَّيْلِ  
لَا رِيَّ اِلَّا نَبَآءٌ اٰتٰنٰنَ يَذْكُرُوْنَ ۚ اِنَّ اِلٰهَآ فَيَا مَآ وَ قَعُوْا ۚ  
وَّ عَلٰى جُنُوْهِہُمْ ۚ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ  
رَبِّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَيَقْنَا عَذَابَ النَّارِ ۝  
یعنی: بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے اختلاف میں نشانی  
ہیں عقل والوں کے لئے (یہ وہ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے  
اور نکلے کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور غور و فکر کرنے کے بعد  
پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ کائنات بے قاعدہ نہیں پیدا کی۔

حکم ہوتا ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تَفْلَحُوْنَ - یعنی: اور یاد کرو اللہ کو  
بہت تاکہ تم نجات پاؤ۔

حضورؐ فرماتے ہیں:

اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَلٰٓئِكٍ هٰذَا اَلْاَمْرُ الَّذِیْ تَصِیْبُ بِہٖ خَیْرٌ دِیْنِیَاوِ  
اَلْاٰخِرَةِ عَلَیْكَ مَجَالِسُ اَهْلِ الذِّكْرِ وَاِذَا خَلَوْتَ فَحَرِّكْ  
لِسَانَکَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِكْرِ اللّٰهِ وَاَحِبِّ فِی اللّٰهِ وَابْغِضْ فِی اللّٰهِ ۝  
یعنی: کیا میں اس معاملہ کی بنیاد نہ بتاؤں جس کے ذریعے تم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل  
کرو؟ اہل ذکر کی مجالس میں بیٹھو اور جب خلوت میں جاؤ تو اپنی زبان کو حسب استطاعت ذکر الہی  
سے متحرک رکھو اور اللہ ہی کے لئے محبت کرو اور اللہ ہی کے لئے نفرت کرو۔  
ذکر نہ صرف بیکر تعلق باللہ کو مستحکم کر لے بلکہ روح انسانی کو ایسا رنگ دیتا ہے کہ پھر کوئی  
اور رنگ اس پر غالب نہیں آتا۔ ذکر کے بغیر تکمیل ذات ممکن نہیں۔ (قبائل نے کہا:

۱۔ القرآن ۳۰: ۳۹ ۲۔ القرآن ۴۰: ۱۹-۱۸ ۳۔ مشکوٰۃ (ادب باب حب فی اللہ (۴۲۷)

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

## مصاحب

اچھے انسانوں کی مصاحبت انسان کے اندر تعلق باللہ کا احساس، عبودیت کا شعور اور حسن خلق کا انضباط پیدا کرتی ہے۔ قرآن پاک نے اپنے حکیمانہ انداز میں کفار کی حسرتوں کا ذکر کیا ہے:

يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي كُنْتُ نَجْدًا تَخَيَّلْتُ فَلَا تَأْخِيْلًا لَّقَدْ أَهْمْتُنِي عَنِ الذِّكْرِ ۖ

یعنی: ہائے افسوس! کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا اس نے مجھے ذکر سے منحرف کیا۔

قرآن کا حکم "کو نوامع النصاب دین" کی تفسیر و توضیح میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصاحبت و محبت تثنیٰ اہمیت رکھتی ہے۔ حضور فرماتے ہیں:

لا تصاحب الا مؤمنا ولا ياكُلُ طعامك الا اتقى ۖ

یعنی: مومن کے سوا کسی سے مصاحبت اختیار نہ کر اور تیرا طعام صرف متقی ہی کھائے۔

مصاحبت، فکری تربیت اور عملی تنظیم پر گہرے اثرات ڈالتی ہے، اسی لیے رسول اللہؐ نے تعلقاتِ ذکر کی طرف توجہ دلائی۔ کتب حدیث کے ابواب الدعوات والذکر ارشادات نبوت سے بھرے پڑے ہیں۔

## دعا

تعلق باللہ کو بختہ کرنے اور روح کی صحیح تربیت میں دعا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انسان کی عبودیت اور حاجت مندی کے اظہار کا ذریعہ اور اللہ کی قدرت کا ملہ، حاکمیت علی الاطلاق اور رحمت و غفران کا اقرار و اعتراف بھی ہے، نیز دعا تشکر و امتنان کا وسیلہ بھی اور عجز و نیاز کا اظہار بھی ہے جس طرح ذکر روح کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے، اسی طرح دعا بھی باطن کے گناہ کا سبب بنتی ہے۔ دعا کبر و غرور اور خود پسندی جیسے مہلک روحانی امراض کا علاج بھی ہے۔ دعا کی وجہ سے جہاں انسان کو عزت نفس کے تحفظ کا احساس ہوتا ہے وہاں توجہ الہی کے باعث بے پناہ اعتماد بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کے ساتھ ایسا گہرا ربط پیدا ہوتا ہے کہ انسان منقطع کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دعا کی لذت اور تلب پر اس کی تاثیر کے احوال صرف وہی جانتے ہیں جنہیں اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلائے، سر جھکا کر اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص میں

۱۔ القرآن ۸۱: ۲۵ ۲۔ مشکوٰۃ: کتاب الاداب ۱۰ الحب فی اللہ، ۴۲۷۔

اس کی بنے پایاں تاثیر کا ذکر موجود ہے۔  
 إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ  
 السَّائِعِ إِذَا دَعَانِ ۖ

یعنی: جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (کہہ دیں)

کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

کتب حدیث میں دعا پر مفصل ابواب میں مولیٰ اعظمؐ نے دعا کا طریقہ اس کے آداب اور اس کی تاثیر کو بہ دلائل سمجھایا ہے۔ آنحضرتؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان کے الفاظ پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کو کیسا انسان بننے کی ترغیب و تعلیم دے رہے تھے۔ دعا کے بارے میں فرمایا "الدعاء مخ العبادة" پھر فرمایا "الدعاء هو العبادة"۔

حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا يرد القضاء الا الدعاء ولا يزيد في العمر الا السبحة

یعنی: قضا کو صرف دعا ہی لوٹا سکتی ہے اور احسان و بھلائی کے سوا کوئی چیز عمر میں اضافے کا باعث نہیں بنتی۔

عبادت، ذکر الہی، مصاحبت اور دعا، تشکر کے ذریعہ سے مستحکم تعلق باللہ فرد کی تربیت کا اولین ذریعہ ہے۔

## خدمت خلق

بنوی طریق تربیت کا دوسرا بنیادی عنصر خدمت خلق ہے۔ فرد کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ اپنے خالق سے جڑا ہوا ہے اور دوسرے کے اعتبار سے وہ مخلوق سے متعلق ہے۔ خالق کے حوالے سے وہ احساس عجز و نیاز اور عبودیت و بندگی کو پر دان چڑھا رہا ہے اور مخلوق کی نسبت سے خدمت، نفع بخشی و فیض رسانی کو شعار بنا رہا ہے۔ خلق خدا اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہے۔ اس کی خدمت اور اس سے حسن سلوک دنیا کی فلاح اور آخرت کی کامرانی کی ضامن ہے۔ بنی مکرم کا ارشاد ہے:

عن عبد الله دأبى هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم  
 الخلق عيال الله فاحبب الخلق الى الله من احسن الى عياله

یعنی: عبد اللہ ابوبہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، مخلوق اللہ کا کلمہ

لہ۔ (مقرآن: ۲: ۱۸۶) لہ مشکوٰۃ، کتاب الدعوات ۱۹۵- لہ۔ مشکوٰۃ باب الشفاعة والرحمة علی الخلق، ۴۳۵۔

ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کہنے سے اچھا سلوک کرتا ہے۔  
خدا صرت خلق ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں جسمانی خدمت، اخلاقی رُویہ، مالی اعانت  
اور ممکنہ تحفظ شامل ہے۔ قرآن و سنت کی ہدایت سے بہت چلتا ہے کہ حسن خلق دین کی روح ہے۔  
قرآن پاک نے نیکی کے تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ اَبْرًا اَنْ تَوَلُّوا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ اَيْسَرَ  
اَلْبَرِّ مَنْ اَمَّنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ الْكِتَابِ  
وَ النَّبِيِّنَّ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَ اَيْتَامَ اٰمِلِي  
وَالْمَسٰكِيْنَ وَ اٰبَنَ السَّبِيْلِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ فِي الْوَقَابِ وَ اَقَامَ  
الصَّلَاةَ وَ اٰتَى الزَّكَاةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بَعَثَهُمْ اِذَا عَاهَدُوْا  
وَ اَصْلَابَهُنَّ فِيْ اَنْبَاسٍ وَّ اَصْحٰبِ الْوَقَابِ وَ اٰتَى الْوَقَابِ وَ اٰتَى الْوَقَابِ  
اَسَدِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُوْلَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

یعنی: نیکی ہی نہیں کہ تم نماز میں اپنا منہ پررب یا چھم کی طرف کر دو، بلکہ اصل نیکی  
اس کی ہے جو خدا پر، پیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور  
مال کی خواہش کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں کو یتیموں کو، غریبوں کو، مساکین کو،  
مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا۔ اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ  
دیتا رہا اور جو لوگ وعدہ کر کے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت،  
تکلیف اور لڑائی (میدان جنگ) میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی وہ ہیں جو راست باز  
ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

کتب حدیث میں "اشفقتہ" والرحمة علی الخلق" اور "حسن الخلق" کے ابواب  
بھی موجود ہیں جن سے عملی زندگی کی پوری تصویر بنتی ہے۔ آپ حسن خلق ہی کو لیں، بیسیوں احادیث  
اس کی اہمیت و فضیلت اور تفصیلی حکمت عملی پر مل جائیں گی۔ آپ کی دعاؤں میں منقول ہے  
"اللھما احسن خلقی فحسن خلقی" (یعنی: اے اللہ تو نے میرا سراپا اچھا بنا لیا ہے، میرے  
اخلاق کو بھی سنوار دے۔)

آپ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

وَ اِهْدِنِيْ لِحَسَنِ الْاِخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِاحْسَنِ الْاِثْمِ وَ اَصْرِفْ

لہ۔ القرآن: ۲: ۱۷۷۔



عَنِ سَيِّهَا لَا يَصْرَفُ عَنِّي سَيِّهَا إِلَّا أَنْتَ لِي  
یعنی: اے اللہ مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر  
اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور تیرے اخلاق کو مجھ سے بھیر دے اور ان کو نہیں  
بھیر سکتا مگر تو۔

بھیر فرمایا: اَمَلُ الْمُؤْمِنِينَ اِيْمَانُ اِحْسَنُهُمْ حَقًّا۔

یعنی: مسلمانوں میں کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا خلق سب سے اچھا ہے۔

مال و جسمانی اعانت اجتماعی زندگی کی روح ہے اور فرد کے سکون کا ذریعہ جس معاشرے کے  
انفرادیکو دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں وہ مادی طور پر خوشحال اور روحانی اعتبار سے مطمئن ہوتا ہے۔  
اگر معاشرت کی بنیادے خود غرضی و استحصال کے اصول کا رفرما ہوں تو وہ معاشرہ اسی دنیا میں جہنم بن  
جاتا ہے۔ میں یہاں حضور اکرم کی چند احادیث پیش کرنا چاہوں گا جن سے پتا چلے گا کہ آپ کس  
طرح کے افراد تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان احادیث میں ترغیب و ترہیب کے شان دار نمونے ملنے گے۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الساعی  
علی الارملة والمسکین کا ساعی فی سبیل اللہ واحسبہ کالقيام  
لا یفترد کالنصائم لا یفطر (متفق علیہ)

یعنی: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ بیوہ اور مسکین کے لئے  
دروادھو پکرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں سعی کرنے والا، راوی کہتا ہے کہ آپ  
نے یہ بھی فرمایا جیسا وہ نمازی ہے جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار ہے جو کبھی  
اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

عن النس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی لنفسی بیدہ  
لا یؤمن عبد حتی یحب لایحیہ ما یحب لنفسہ

یعنی: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے  
ہاتھ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت کامل ایمان والا نہیں ہوتا جب تک اپنے  
بھائی کے لیے وہ بھلائی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی فی عون العبد ما  
کان العبد فی عون اخیہ

لے۔ مسلم، باب الدعاء فی الصلوٰۃ۔ لے مشکوٰۃ، کتاب الادب باب فی الشفۃ۔ ۲۲۲۔ ۳۔

یعنی : اللہ اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی  
کے مدد میں رہتا ہے ۔

پھر فرمایا :

عن عمران ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال المسلما هو المسلم  
لا يظلمه ولا يسلطه ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته و  
من فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة  
ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة ۔

یعنی : حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مسلمان دوسرے مسلمان  
کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر زیادتی کرتا ہے نہ اسے کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے اور جو شخص اپنے  
بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہوگا اللہ اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے ۔ جو شخص اپنے  
بھائی کو کوئی تکلیف دے گا ، اللہ اس پر سے قیامت کی تکلیفیں کم کر دے گا اور جو اپنے  
مسلمان بھائی کی پرہیزگاری کرے گا قیامت کے دن اللہ اس کے عیب لوگوں سے چھپا دے گا ۔

ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا لِنَا لِلْمَحْزُومِ وَالْمَكْرُومِ (القرآن : ۴۰ : ۲۳-۲۵)

یعنی : جن کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے ۔

خدمت خلق تربیت فرو کا بڑا ذریعہ ہے کیوں کہ اس کے باعث انسان رذائل اخلاق  
اور نفس کے قریب سے نجات حاصل کرتا ہے ۔ اس دنیا میں فساد کا بڑا سبب فرد کی ہوس، اس  
کی طبیعت کا بخل اور اس کا جبر و تشدد ہے ۔ یہ اُس کی ہوس کا روی ہے کہ مباشرت استعمال  
کا شکار ہو رہا ہے ۔ یہ اس کے نفس کا غور و تشدد ہے جو جبر و تشدد اور ظلم و وحشت کو جنم دیتا ہے ۔  
اور یہ اس کا بخل ہے جو معاشی زندگی کے نشوونما کو روک دیتا ہے ۔ بنیٰ نے ان تمام اخلاقی  
بیماریوں کا علاج خدمت خلق سے کیا ہے ۔ خدمت خلق کے لیے محبت و شفقت اور نرمی و  
ہمدردی کے علاوہ ایثار و قربانی کا جذبہ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے ۔ رسول اللہؐ کے تربیت یافتہ  
انصار کی کا عمل وحی ربانی کا حقیقہ بن گیا ۔ جب رب کائنات نے فیض نبوت سے تربیت یافتہ  
انصار کی تعریف کی ۔

وَيُؤَيِّرُكَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۖ

یعنی : یہ لوگ (مسلمان) ایسے ہیں کہ چاہے خود تکلیف میں ہوں مگر دوسروں

کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

تعلق باللہ اور خدمت خلق تربیت فرد کے وہ بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر کسی انسان کی نہ اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ تعمیر حضورؐ نے ان اصولوں کو شخصیت کا جز بنانے کے لیے وعظ و نصیحت، جزا و سزا کے احساس اور سب سے بڑھ کر شخصی عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔

# عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت

جناب محترم ڈاکٹر محمد یوسف گوریہ

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت دنیا میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انتہائی مبارک و مسعود ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین اور تقنین و تخطيط ابراہیمؑ، سیدنا ابراہیمؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نے فرمائی۔ اس سے ملت ابراہیمی اور امت محمدیہ کے درمیان دینی اور روحانی گہرے روابط استوار ہوئے۔

نظام تعلیم چار بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: (۱) مرکز تعلیم (۲) طلبہ (۳) معلم (۴) نظام تعلیم و تربیت۔ سیدنا ابراہیمؑ کی لازوال عظمت و بصیرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظام تعلیم و تربیت کے ان چاروں بنیادی عناصر کا تصور فرمایا اور انہیں معرض وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا فرمائی:

(۱) تعمیر بیت اللہ (۲) تخلیق امت مسلمہ (۳) بعثت محمدی۔ اور (۴) نصاب تعلیم و تربیت۔

## مرکز تعلیم و تربیت (بیت اللہ)

مرکز تعلیم و تربیت کی تاسیس و قیام کے لئے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (القرآن ۲: ۱۲۷)

ترجمہ: اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کیے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما، بیشک تونے والا (اور) جاننے والا ہے۔

## ۲۔ اُمت مسلمہ ( طلبہ )

درس گاہ بیت اللہ میں عبادت اور حصول تعلیم و تربیت کے لیے آپ نے اُمت مسلمہ کی تخلیق کے لئے دُعا فرمائی :

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔  
( القرآن ۲ : ۱۲۸ )

ترجمہ : اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیے اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمت مسلمہ پیدا فرمائیے ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور امت مسلمہ پیدا فرمائی ۔  
وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ  
( القرآن ۲ : ۱۴۳ )

ترجمہ : اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

## ۳۔ معلم ( رسول )

درس گاہ بیت اللہ میں امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معلم کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک رسولؐ کی بعثت کے لیے دُعا فرمائی :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ ۔ ( القرآن ۲ : ۱۲۹ )

ترجمہ : اے ہمارے پروردگار اس امت میں انھیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما ۔  
اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور امت مسلمہ میں اپنے فیض و کرم اور فضل و احسان سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ۔  
لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ  
( القرآن ۲ : ۱۲۴ )

ترجمہ : خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا ۔

## ۴۔ نصاب تعلیم و تربیت

امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک نصاب تعلیم و تربیت تجویز

فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں منظوری کے لیے پیش فرمایا :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

(القرآن ۲: ۱۲۹)

ترجمہ : وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے مجوزہ نصاب تعلیم و تربیت کو شرف قبولیت بخشا اور اس کے مطابق امت کی تعلیم و تربیت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيَّةِ رَسُوْلًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهِ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ - (القرآن ۲: ۱۲۹)

ترجمہ : وہی تو ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیاتوں کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان مباحث سے معلوم ہوا کہ تعمیر بیت اللہ، تخلیق امت مسلمہ، بعثت محمدی اور تجویز ترتیب نصاب تعلیم و تربیت ایک ہی مقدس و مندرجہ سلسلے کی مضبوط درہم و درہم ہیں۔ اس کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابوالانبیاء سے ہوا اور تکمیل سید المرسلین، رحمت للعالمین اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت انھیں عناصر اربعہ پر استوار تھا جن کی تجویز و ترتیب اور تاسیس و تشکیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ اب ان چاروں عناصر کی مختصر طور پر اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

## مرکز تعلیم

انسانیت کے لیے اولین مرکز تعلیم و تربیت اور اسلامی درس گاہ بیت اللہ کو دنیا کے تمام مراکز اور تمام درس گاہوں پر جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے قرآن نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے :

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى

لِّلْعٰلَمِيْنَ (القرآن ۲: ۱۲۵)

ترجمہ : پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے مبارک اور دنیا

کے لیے موجب ہدایت۔

اس آیت میں بیت اللہ کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں (۱) مبارک (۲) ہدی للعالمین۔ ایک جگہ نبیت اللہ کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس میں داخل ہونے والے کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

ومن دخلہ کان اماناً ط (القرآن ۳: ۹۷)

ترجمہ: جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔

ایک جگہ بیت اللہ کو انسانیت کی اجتماع گاہ اور امن گاہ قرار دیا گیا ہے:

وَإِذْ بَعَثْنَا نَبِيًّا قَالُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذَا الْفَاسِقَ (القرآن ۲: ۱۲۵)

ترجمہ: اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع کرنے اور امن پانے جگہ مقرر کیا۔

قرآن و سنت اور سیرت و تاریخ میں بیت اللہ کی اور بھی کئی صفات بیان ہوئی ہیں۔ مذکورہ آیات میں بیت اللہ کی صفات یہ ہیں: مبارک، ہدی للعالمین، اجتماع گاہ انسانیت اور امن گاہ انسانیت۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی تعمیر فرمائی۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا بڑا تعلیمی و روحانی مرکز قائم ہوا اور یہ بھی انسانیت کے لیے برکت، ہدایت، اجتماع اور امن کا موجب ثابت ہوا۔ اسی طرح جیسے جیسے خلقت دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی اور اسلام اکناف و اطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ویسے ہی ویسے ان اولین اسلامی تعلیمی و روحانی مراکز کی طرز پر تعلیم و عبادت گاہیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ مسلمانوں کی درس گاہیں بابرکت ہوتی تھیں کیوں کہ ان کے بانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خلوص، نیک نیتی اور تقویٰ کی بنیاد پر ان کی تعمیر کرتے تھے۔ ان میں رشد و ہدایت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں برکت و ہدایت کی موجودگی انسانیت کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور متلاشیان حق اور تشنگان علم جوق و درجوع ان اجتماع گاہوں کی طرف کھینچے چلے آتے تھے۔ ان کا پُر امن اور پُر سکون ماحول علم و تحقیق کے لیے مہینز اور تعقل و تفکر کے لیے تحریک و تہنیت کا باعث بنتا تھا۔

در حقیقت اسلامی درس گاہوں میں برکت اور ہدایت کا ماحول طلبہ کی خدا واد صلاحیتوں کو ابھرنے پر آمادہ کرتا اور امن و اجتماع کی معتدل، خوشگوار اور سازگار فضا انھیں بڑھنے، پھلنے، پھولنے اور پروان چڑھنے کے وسیع ووافر مواقع فراہم کرتی تھی۔ اگر مسجد نبویؐ پر درس گاہ کی حیثیت سے نگاہ دوڑائیے تو یہ نظم و نسق کے اعتبار سے مثالی، امن و سکون کے اعتبار سے

نمود، برکت و ہدایت کے اعتبار سے بے مثل نظر آئے گی۔ مجاہد کرامؒ نے علوم و فنون کی ہر نوع کا علم حاصل کرتے۔ مختلف مسائل حیات پر اجتہاد و تحقیق کی تربیت پاتے، تلاش و جستجو کی تڑپ کے تحت بہت سے علمی، فکری اور تحقیقی سوال کرتے تھے۔ اس آزادانہ علمی ماحول میں ان کی علمی و فکری تربیت ہوتی۔ درس گاہ میں نظم و ضبط کا سب سے بڑا اور اہم ترین قاعدہ اور قانون معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور سیرت و کردار تھا۔ جبر و اکراہ اور حکم و تسلط کی جگہ معلم کی اخلاقی قوت اور اس کی ذات کی عظمت و برکت تھی۔ یہ فضا صحابہؓ کی صفات عالیہ کو پران چڑھاتی اور شہ و شہادت کو ذل اندازی کا موقع نہ دیتی۔

ان اسلامی درس گاہوں اور ان کے اوصاف و صفات کا موازنہ جب عہد حاضر کی درس گاہوں اور ان کی صفات سے کیا جاتا ہے تو ان کے مقصد و مدعا، ان کے ماحول اور ان کی فضا کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ عہد نبویؐ کے تعلیمی و روحانی مراکز کی صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے:

مَسْجِدٌ أُمِّيَّةٌ عَلَى النَّفْثَى - (القرآن ۹: ۱۰۸)

ترجمہ: مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری درس گاہوں کی بنیاد بھی تقویٰ ہی ہے؟ کیا ان کا مقصد و مدعا اور ان کا ماحول اور فضا وہی ہے جو عہد نبویؐ کی تعلیم گاہوں کی تھی؟

آج دو قسم کی درس گاہیں قائم ہیں۔ ایک جدید نظام تعلیم کی درس گاہیں اور دوسری قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں۔ جدید نظام تعلیم کی درس گاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہوتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبایات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی مباحث و نفسیات، تہذیب و تمدن اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی میں انسٹراکٹو اشتمالیت نے بھی ہماری درس گاہوں پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اس صورت حال سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان درس گاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں، اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس! اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہماری درس گاہوں کا مقصد و مدعا ہی مقبوت نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر ان میں انتشار و



افراق، فساد و غلیان اور قتل و بھارت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درس گاہوں کی بنیاد ہے۔ یہ بغاوت ہے نوجوان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو ان نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا ۱۱۰ اہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں۔

دوسری درس گاہیں قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں ہیں۔ ان میں عربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے۔ ان میں خلوص و تقویٰ موجود ہے مگر بحیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درس گاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے۔ مگر ان کے بیشتر فارغ التحصیل جب مستند مسوکر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے۔ ہماری جاہل و قدیم درس گاہوں کو با مقصد اور تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد عہد نبوی کی تعلیمی و روحانی درس گاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انہیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

## طلبہ

نظام تعلیم کا دوسرا عنصر طلبہ ہیں۔ عہد نبوی کے طلبہ کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ میں موجود ہیں جن کے سرسری مطالعے سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیاوی امور میں مہارت اور اخروی مقاصد کا حصول تھا۔ خشیت الہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعین اور ادائی میں توازن اور رضائے الہی کے حصول کے لیے ایثار، قربانی، محبت، شفقت، ہمدردی، عکساری، محنت، دیانت، قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لیے انتہا درجے کا شوق و ذوق، محنت و مشقت، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے حق گوئی و بیباکی ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبیر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کی درس گاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ طلبہ اپنی ذہنی، فکری، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال پایا جاتا تھا۔ وہ دینی اور دنیاوی امور میں توازن برقرار رکھتے تھے۔ علوم و فنون میں انہماک انہیں اپنے خالق

و مالک کے حقوق کی ادائی سے غافل نہیں کرتا تھا نہ زہد و تقویٰ دنیاوی امور میں مہارت کی راہ میں مانع ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظام تعلیم کا مقصد و مدعا واضح تھا، اس لیے وہ اس کے حصول کے لیے بہت کم مصروف و مشغول رہتے، اپنی تمام تر توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتے اور پورے امن و سکون کے ساتھ تحصیل علم میں گئے رہتے۔ پوری دلچسپی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کا حاصل کرنا ان کا مطمح نظر ہوتا، بلند و بالا امور کی طلب و جستجو کی لگن، غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کے لیے وقت ہی نہ چھوڑتی۔

یہی وہ صفات عالیہ تھیں اور اوصاف حمیدہ تھے کہ جن کی بدولت تلیل ترین مدت میں اس دور کے طلبہ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کیے جن کی روشنی رہتی دنیا تک انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں رہنمائی دیتی رہے گی۔ تعمیر و تشکیل شخصیت میں انھوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی۔ علم و فضل اور عقل و تدبیر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لیے مشعل کا کام دیتے رہیں گے۔

## معلم

نظام تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت معلم کو حاصل ہوتی ہے۔ اہمیت مسلمہ کے حقیقی معلم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: انہا بعثت معلما (ترجمہ: مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے)۔ منصب معلم پر فائز ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے اپنی قبل از نبوت سیرت و کردار کے بارے میں اپنے اہل شہر سے دریافت کیا اور پوچھا کہ میں چالیس برس تک آپ لوگوں میں زندگی بسر کر چکا ہوں آپ نے مجھے کیسا پایا؟ سب لوگوں نے شہادت دی کہ آپ سیرت و کردار کے بلند و بالا مقام پر فائز ہیں، آپ صادق و امین ہیں بہم نے آج تک آپ سے سوائے سچ کے کچھ نہیں سنا۔ اہل شہر کی اسی شہادت کو قرآن حکیم نے اس آیت کریمہ میں بیان کیا ہے:

فَقَدْ بَشَّرْتُ فِیْكُمْ عُمَرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (القرآن: ۱۰: ۱۶)

ترجمہ: میں قبل از تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم سمجھتے نہیں۔

آپ کے خلق عظیم کی شہادت سب سے آخری آسمانی وحی قرآن حکیم نے اس آیت میں

بیان فرمائی ہے :

وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِقْتَ عَظِيْمًا ۝ (القرآن ۴: ۶۸)  
آپ یقیناً خلقِ عظیم رکھتے ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصبِ نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا :  
بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ - (امام مالک الموطا باب حسن الخلق)  
ترجمہ : میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمی کے فرض کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ ایک  
ابدی و سرمدی نمونہ عمل ہے۔ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے آپ نے جن حلوں، جذبے، محنت،  
محبت اور سہروردی کو اپنایا اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی بصیرت افروز انداز میں اس آیت میں  
بیان فرمایا :

فَلَا تَخْلُقْ بَا حِجٍّ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ تَمَّ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ  
آسَفَاهُ (القرآن ۶: ۱۸)

ترجمہ : (اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے  
رج کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔

جب تک معلم کو اپنے مقصد و مشن کے ساتھ ایسی ہی وابستگی نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح  
معنوں میں تعلیم و تبلیغ کے منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
اخلاق، اعمال، افعال اور سیرت و کردار کا جو نمونہ بحیثیت مجموعی اُبھر کر نمایاں طور پر سامنے آتا  
ہے اُسے قرآن حکیم نے تمام انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا اور قیامت تک تعلیم و تبلیغ سے  
والہنتہ انسانوں کو اسے اپنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - (القرآن ۲۱: ۳۳)

ترجمہ : تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

”ارتج عالم اس بات پر شاہد ہے کہ معلمین اسلام نے فرائضِ تعلیم سنبھالنے سے پہلے اپنی  
سہرت و کردار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالا۔ پورے جذبے، شوق  
اور مشن کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کی۔ کمالِ خلوص، محنت اور جانفشانی اپنے تلامذہ  
میں علم و ہنر کی جستجو اور تحقیق و اجتہاد کی تڑپ پیدا کی۔

عہدِ حاضر میں اخلاق و کردار کی پستی اور سیرت و اعمال کی گراؤ کا تجربہ کیا جائے تو معلوم

ہو گا کہ بہ حیثیت مجموعی اس کی تہ میں معلمین کا کردار پوشیدہ ہے۔ ان کی مقصد و مدعا سے لاپرواہی، محنت و جانفشانی سے پہلو تہی، طلبہ سے بے رغبتی وہ عوامل ہیں جن کا پر تو ان کے زیر تعلیم طلبہ کی ذات شخصیت پر پڑتا ہے۔ جب تک معلمین اپنی سیرت و کردار اور اعمال و افعال کو اسوہ حسنہ کے مطابق نہیں ڈھالتے اور اپنے اعلا اخلاق اور عمدہ کردار کو طلبہ کے لیے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے اس وقت تک حوی و ملی اخلاقی گراؤٹ کا رخ تعمیر و ترقی کی طرف نہیں موڑا جاسکتا۔

## عہد نبوی کا نصاب تعلیم و تربیت

قرآن حکیم کی سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد اور آپ کی نبوت و رسالت کے فرائض منضبطی بیان ہوئے ہیں۔ ان ہی مقاصد نبوت کے مطابق آپ نے آہستہ آہستہ مسلمہ کی تعلیم و تربیت فرمائی اور یہی بنیادی تعلیمی اصول عہد نبوی کا نصاب تعلیم و تربیت تھے۔

یہ نصاب تعلیم چار بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا: (۱) تلاوت آیات (یتلو علیہم آیات) (۲) تعلیم کتاب (یعلّمہم الکتاب) (۳) تعلیم حکمت (والحکمت) (۴) تزکیہ نفوس (ویرزیمہم)

### تلاوت آیات

سب سے پہلے اصول تلاوت آیات کو لیجیے: امام راغب اصفہانی تلاوت کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والتلاوة تختص بالتابع کتب اللہ المنزلة (ترجمہ: تلاوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتب کی اتباع کے لیے مخصوص ہے) اس کے ساتھ ہی تلاوت کا یہ معنی بھی ہے: يقال فی القرآن فی شئی اذا قرأته وجب علیک اتباعہ: (ترجمہ: قرآن حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب تو نے اس میں سے کچھ پڑھا تو تیرے اُپر اس کی اتباع واجب ہوگئی)۔

تلاوت سے مراد قرآن حکیم کے ارا م و نواہی، احکام و تعلیمات کی تلاوت، ان پر عمل کے نقطہ نظر سے کرنا ہے۔ تلاوت کے دو مفہوم ہیں:

- ۱۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور ان کا تقدس
- ۲۔ قرآنی احکام و قوانین اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کا اتباع،

اس سے ظاہر ہے کہ ”یتلووا علیہم ایتل“ کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو عام کیا جائے، انہیں نہایت دل سوزی کے ساتھ تلاوت کر کے زمین نشین کیا جائے، اور قلب درجہ پر ان آیات کو نقش کیا جائے۔ ملک و معاشرے میں موجود ہر فکر و فلسفہ پر ان آیات کا غلبہ ہو، شعر و ادب پر قرآنی آیات کی چھاپ ہو، معاشرے میں تمام افکار و خیالات ان کے تابع ہوں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کا چرچا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے وصال تک مسلسل تلاوت آیات کی۔ آپ نے قرآنی آیات کو اس طرح تلاوت فرمایا کہ وہ روزمرہ کا موضوع بن گئیں۔ موافق و مخالف سب ان ہی کے متعلق گفتگو کرتے۔ آپ نے تلاوت کے ذریعہ سے قرآن کو اتنا عام کر دیا کہ قبل از اسلام کا شعر و ادب دب کے رہ گئے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر قرآنی آیات کے مختلف پہلوؤں پر مباحث و مذاکرات ہونے لگے، حتیٰ کہ قبل از اسلام عرب تہذیب و ثقافت کا سرمایہ ”سبع معلقات“ بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور ان کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی۔

آج اگر عہد نبوی کے نصاب تعلیم کے پہلے جزو ”تلاوت آیات“ پر مبنی ملک کے نظام تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو نہایت صدق اور اخلاص کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ”تلاوت آیات“ کو نصاب تعلیم میں پوری پوری اہمیت دینی ہوگی۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اندر ملک کے ہر فرد میں تلاوت آیات کی استعداد پیدا کرنا ہوگی۔ اس کا عملی طریقہ کاریہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کے درجہ ابتدائے (پرائمری) میں پورے قرآن ناظرہ کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ملک کا ہر پرائمری پاس بچہ پورے قرآن حکیم کو ناظرہ کے طور پر پڑھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا جائے کہ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ مختلف موضوعات کے تحت آسان اور عام فہم اردو زبان میں طلبہ کو پڑھایا جائے۔

## تعلیم کتاب

عہد نبوی کے نصاب تعلیم کا دوسرا بڑا اصول تعلیم کتاب ہے۔ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری وحی، کتاب اللہ، قرآن حکیم ہے۔ اس کی تعلیم سے مراد اس کے احکام، تعلیمات، ارشادات، ہدایات، اوامر و نواہی کی تعلیم ہے۔ پوری کتاب کو سمجھنا، اس کے معانی و مفہیم کو جاننا۔ اس میں دیے گئے احکام کا علم حاصل کرنا، اس کی تعلیمات، ارشادات اور ہدایات کا فہم و ادراک پیدا کرنا اس کے اوامر اور نواہی کو سیکھنا، تعلیم کتاب ہے۔ قرآن حکیم، خالق کی طرف سے مخلوق کے لیے آخری، مکمل، تمام و کمال، غیر متغیر، غیر متبدل، ابدی، سرمدی ہدایت

ہے۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اسے پڑھے، اسے سیکھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔

تعلیم کتاب میں ہر فرد سے زیادہ معاشرے پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے۔ عام حالات میں ہر فرد کو خود بخود تعلیم کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم معرض وجود میں لائے جس کی بنیاد "تعلیم کتاب" پر ہو۔ قرآنی آیات کو پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا، تلاوت آیات ہے تعلیم کتاب سے مراد ان آیات میں دی گئی تعلیمات کو سیکھنا، انھیں جاننا اور ان پر عمل کرنا ہے یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ تلاوت کے علاوہ قرآنی آیات کا معنی اور مفہوم بھی سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملک و ملت کے ہر فرد کو اس کا اہل بنانا کہ وہ قرآن حکیم کی جملہ تعلیمات کو سمجھ سکے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے اس فریضے کو اپنی حکومت کی وساطت سے انجام دیتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کی حکومت پر اس فریضے کی اصل انجام دی عائد ہوتی ہے۔ حکومت تمام مسلمانوں کو "تعلیم کتاب" کا اہتمام اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ سے کر سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک و مسعود عہد میں جو نصاب تعلیم ترتیب دیا تھا اس میں تعلیم کتاب ہی کو بنیادی، محوری اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل تعلیم کتاب کے لیے وقف تھے۔ سربراہ حکومت اور تمام اعیان و معاون مملکت، تعلیم کتاب میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے خصوصی تربیت گاہیں برائے اساتذہ قائم فرمائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کو ملک کے طول و عرض میں تعلیم کتاب کے لیے مامور فرمایا۔ مسجد سب سے بڑی درس گاہ قرار پائی۔ ملک کی تمام مساجد تعلیم کتاب کے لیے وقف تھیں، اور تمام مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہوں اور کتاب کا علم حاصل کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم ایک مثالی نظام تھا۔ اس نظام کے ذریعہ سے ہر مسلمان میں اتنی استعداد پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کی کتاب قرآن حکیم، کو پڑھ کر خود سمجھ سکتا تھا۔ کتاب اللہ کی اس وسیع پہلے پر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کے تمام شعبے خود بخود اسلامی سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ معیشت، معاشرت، سیاست، عدالت، حکومت، تہذیب، تمدن، ثقافت تمام شعبے نہایت آسانی، دلی رغبت اور سہولت کے ساتھ اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے تعلیم کتاب مسلمانوں کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوئی اور مسلمان کتاب اللہ کی تعلیمات کے زیر اثر انسانیت کے لیے نمونہ بن گئے۔ ان کے اعمال، افعال، سیرت، کردار، تہذیب اور اخلاق انسانیت کے لیے معیار قرار پائے اللہ تعالیٰ

کی کتاب کو سیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ نظام حکومت کو چلانے والے عمال اور حکام دیانت، امانت، محنت اور خدمت کا شاہکار بن کر سامنے آئے۔ عوام صدق، خلوص، ایثار، ہمدردی، اخوت، محبت، اتحاد و اتفاق کا مجسمہ بن کر ساری انسانیت کے سچے محسن و دشمنوار ثابت ہوئے۔ شر، فساد، فحش و فحشاء مغلوب ہو گئے اور خیر، معروف، صلاح، فلاح غالب ہو گئے۔ بزدلی، چوری، دغا، فریب، مکاری، عیاری کی جگہ شجاعت، اولوالعزمی، بلند مرتبہ، عزم مصمم، صدق اور خلوص ایسے صفات اسلامی معاشرت کا طرہ امتیاز قرار پائے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو صرف ایک درست قدم سے برآمد ہوئے اور یہ درست قدم "تعلیم کتاب" کو نظام تعلیم کا مرکز قرار دینا تھا۔

"تعلیم کتاب" کو موجودہ نظام تعلیم میں رائج کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ درجہ ثانویہ (میٹرک) تک اسے لازمی قرار دیا جائے۔ ان پانچ سالوں میں "تعلیم کتاب" کو نصاب کا حصہ اس طرح بنایا جائے کہ میٹرک پاس کرنے تک ہر طالب علم لازمی طور پر پورے قرآن مجید کا ترجمہ سیکھ جائے۔ اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ جائے جس طرح حصہ پرائمری میں پورا قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے۔ اسی طرح حصہ میٹرک میں پورے قرآن کا ترجمہ سکھا دیا جائے۔

## تعلیم حکمت

قرآنی نصاب تعلیم و تربیت کا تیسرا بڑا اصول تعلیم حکمت (والحکمة) ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا حکمت سے مراد دین کی معرفت، اس کی فقہ اور اس کی اتباع ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآنی احکام ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و شرائع کی حکمت اور ان میں انسانیت کے لیے مصالح و منافع کا بیان ہے۔ ان ائمہ مجتہدین و مفسرین کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی نصاب تعلیم کا اصول — "والحکمة" — ایک نہایت جامع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام علوم سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق کتاب و سنت کی تعلیمات سے ہے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات پر ایک سرسری نظر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دینی و دنیاوی امور پر شتمل ہر وہ چیز جو دنیا و آخرت میں انسانیت کے لیے فائدہ مند اور نفع بخش ہے ان تعلیمات میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت اسرار و رموز دین الہی کی گرہ کشائی بھی ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات سے موافق اور ان کے مطابق تمام علوم و فنون بھی ہیں۔ یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ آپؐ کے ارشادات، فرمودات، تقاریر، اقوال، افعال و اعمال

پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوئے کہ آپ نے "الحدید" کی بڑی تلقین فرمائی۔ اور ساتھ ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا خیال فرمایا۔ حکومت، عدالت، قانون، تعلیم، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن، اخلاق، کردار، سیرت کی تشکیل و تعمیر میں آپ نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ حکمت کی عمدہ تفسیر ہے۔ "والحکمة" چونکہ نظام تعلیم کی بنیاد ہے اس لیے اسے نظام تعلیم میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ حکمت قرآن و سنت پوری طرح اجاگر ہو۔

"حکمت" قرآن حکیم کی بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے بالعموم اسرار و رموز شریعت مراد لیے جاتے ہیں۔ فقہ اسلامی میں "حکم" کی علت بیان کی جاتی ہے جو اس کی حکمت ہوتی ہے۔ حکمت روح دین و اسلام ہے اسے موجودہ نظام تعلیم میں بی۔ اے، بی۔ ایس سی تک لازمی طور پر پڑھایا جائے۔ تاکہ ڈاکٹر، انجینئر، ماہرین معاشیات، سیاسیات، معاشرت، عدالت اور تعلیم حکمت دین سے پوری طرح سرشار ہو کہ دنیا میں پھیل جائیں۔ قرآن کی تعلیمات کی غایت اور ان کی روح پر مبنی نصاب تیار کیا جائے جس میں اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات کی حکمت اور ان کا فلسفہ بیان کیا جائے، تقابلِ ادیان، تقابلِ قوانین اور تقابلِ افکار و نظریات کی تعلیم کے ذریعہ سے اسلام کی حقانیت اور فوقیت ثابت کی جائے۔ مخالفین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے اور صدق و یقین کی دولت سے طلبہ کو مالا مال کیا جائے۔ اس سلسلے میں غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ اور اقبال و دیگر مفکرین اسلام نے حکمت دین کے بیان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔

## تزکیہ نفس

اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا جو تھا بنیادی اصول تزکیہ نفس ہے (وِیْزِکِیْتِھِم)۔ تعمیر سیرت و کردار میں تزکیہ نفس کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اذہان و قلوب کی تمام اخلاقی بیماریوں نیتوں اور ارادوں کے تمام نسا دات کا علاج تزکیہ نفس ہے۔ سرکاری، عدالتی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، جملہ امراض اور ان کے انسداد و تدارک کا واحد حل تزکیہ نفس ہے۔ عہد رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی گمراہ، بدعنوان اور جوانی صفات و اوصاف کا حامل قوم کو تزکیہ نفس کے ذریعہ سے دنیا کی سب سے بڑی بااخلاق، ہتھب، متمدن اور صاحب سیرت و کردار قوم بنا دیا تھا۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے نظام تعلیم اور اس کے بنیادی اصول، تزکیہ نفس کی بدولت ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے انسانوں کو انسانیت سکھائی اور بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلنا چلا گیا۔



تزکیہ نفس کو نظام تعلیم کا حصہ کیسے بنایا جائے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ تزکیہ نفس کا عمل نظام تعلیم کے تمام مدارج کا لازمی جز بننا چاہیے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ جو لوگ سمجھے بغیر بھی اس کی تلاوت کرتے ہیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں وہ تو یقیناً اس کا واضح اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر تزکیہ کا تعلق علم و تعلیم کے بجائے عمل سے زیادہ ہے۔ تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کا تعلق تو زیادہ تر تدریس سے ہے مگر تزکیہ کا تعلق خالصتہً عمل سے ہے۔ تزکیہ نفس میں مقام کی ذات، سیرت و کردار اور نمونہ عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ استاد ایک طرف قرآنی تعلیمات کی تدریس کے فرائض انجام دے اور دوسری طرف ان تعلیمات کا عملی مجسمہ بن کر اپنی سیرت و کردار کے اعلا، عمدہ اور پاکیزہ نقوش طلبہ کے صاف اذہان و قلوب پر ثبت کرے۔ قرآن حکیم میں تطہر اور تزکیہ کی اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں تطہر کا مفہوم ہے زداؤل سے پاک کرنا، اور تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ فضائل سے آراستہ کرنا۔ زداؤل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی مسلم کے فرائض منصبی کا لازمی جز ہے۔ تزکیہ نفس کا مطلب ترک دنیا پرگز نہیں۔ تزکیہ نفس کی افضل و اکمل ترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی بھر پور زندگی آنحضرتؐ نے گزاری اس کی مثال تلاش کرنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حضورؐ کی زندگی ہی کو اسوہ حسنہ قرار دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

## تربیت گاہیں

عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اس کی روشنی میں موجودہ نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لیے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدد و مرتبہ نظام تعلیم کے لیے اساتذہ کہاں سے میسر آئیں؟ انھی تقاضوں کے پیش نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطہ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اس وقت ہر درجہ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر ان کے نظام تعلیم و تربیت کو دینی و ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطح تعلیم کے لیے میسر آ سکتے ہیں۔

اس مقصد کا حاصل کرنا تین اہم امور پر منحصر ہے: — اول تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں

پر ترجیح دی جائے۔ قابل ترین، دیانت دار، محنتی، جوش عمل اور عقیدہ سے سرشار اساتذہ کو تربیت کلموں میں مقرر کیا جائے۔ اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دیں تو ان سے دریغ نہ کیا جائے تاکہ وہ پوری دلچسپی کے ساتھ مستقبل کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔ دوم: نصاب تعلیم و تربیت میں کتاب و سنت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے۔ انھیں مغربی فکر و فلسفہ کی ذیل کی حیثیت حاصل نہ ہو۔ سوم: تربیت اساتذہ پر مامور محائین کے انتخاب میں جہاں ان کی فنی ہمارت، علمی قابلیت، محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیہ نفس پر عمل پیرا ہونے اور اسوہ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

# اُسوۂ رحمۃ للعالمین "خلق عظیم" ہے

جناب محترم ڈاکٹر نعیم احمد ناصر

آپ اہل علم و نظر اور نکتہ ور و نکتہ سنخ ہیں۔ میرے مقالے کا عنوان سنتے ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مافی الضمیر کیا ہے۔ اور میں کیا کہنا چاہتا ہوں! لیکن پھر بھی میں اپنے مقالے کے عنوان سے متعلق دو ایک تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

سب سے پہلے میں اس نکتے کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے "اُسوۂ رسول" کے بجائے "اُسوۂ رحمۃ للعالمین" کو کیوں ترجیح دی؟ اس کا مختصر اور سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ میں اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ بلاشبہ خاتم النبیین و سید المرسلین ہیں اور بلاشبہ آپ کی سیرت طیبہ ہی میں حسین کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حسین نمونہ ہے۔ جیسا کہ رب علیم و حکیم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (القرآن ۳۳: ۲۱)

لیکن آپ بحیثیت رسول اللہ رحمۃ للعالمین تھے اور ہیں، لہذا آپ کے اُسوۂ حسنہ کی حقیقت رحمۃ للعالمین ہے، اور اس حقیقت و واقعیت کو خود اللہ جل شانہ نے انتہائی قاطعیت اور معجزانہ ایجاز و بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (القرآن ۲۱: ۱۰۷)

لہذا جب میں اُسوۂ رحمۃ للعالمین کہتا ہوں تو اس سے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف مقصود ہوتا ہے کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے "رحمۃ للعالمین"۔ نیز میں اس حقیقت پر بھی زور دینا چاہتا ہوں کہ لفظ "رحمۃ للعالمین" ہی تنگنائے قرآن حکیم کے فلسفہ اخلاق کا دریائے ناپیدائنا روضہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس رب علیم و حکیم نے یہ فرمایا کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں، اسی کا ارشاد ہے کہ آپ صاحب خلق عظیم ہیں:

وَأَنزَلْنَاكَ لَعَلَّكَ تَفْهَمُ (القلم ۶۸: ۴)

اس سے ثابت ہوا کہ رحمۃ للعالمین اور خلق عظیم ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور دونوں

لازم و ملزوم ہیں، نیز آپ کا اسوۂ حسنہ رحمۃ اللعالمین یا خلق عظیم ہے۔ اس تہدید سے اس امر کی بھی توضیح در توجیہ ہو جاتی ہے کہ میں نے کیوں اپنے مقالے کا عنوان: اسوۂ رحمۃ اللعالمین ”خلق عظیم“ رکھا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ”رحمۃ اللعالمین“ کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ یہ مصطلح قرآن حکیم کی ان مصطلحات میں سے ہے جنہیں ہم ان کی معجزہ معنویت و بلاغت کے باعث ”اعجازات قرآن“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر حال ائمہ لغت اور مفسرین کے نزدیک ”رحمت“ ایسی وقت و سعادت اور عواطف شفقت و محبت سے عبارت ہے جن میں احسان بھی شامل ہو، اور احسان اسی حسہ خیر اور حسن سلوک کو کہتے ہیں جس سے وہ شخص یا اشخاص خوش ہو جائیں جن سے احسان کیا جائے۔ رحمت کا مفہوم معلوم کرنے کے بعد اب ہم لفظ ”عالمین“ پر غور کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عالمین عالم کی جمع ہے، جس کا ترجمہ عموماً جہان کیا جاتا ہے۔ عالم بے شمار ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں: عالم انسانی، عالم حیوانی، عالم نباتاتی، عالم جماداتی، عالم بحری، عالم فضائی، عالم سمادی اور عالم زمائی وغیرہ۔ حیات و موت کے ان عوالم کے مادہ اور ایک عالم بیکراں اور بھی ہے۔ جیسے قرآن مجید نے دارالآخرت اور الجحیم کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ الجحیم جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے ”حیات محض“ کا عالم ہے، یعنی اس میں زندگی تو ہوگی مگر موت نہ ہوگی۔ اس کے پھر دو عالم ہیں: جنت اور جہنم، اہل جنت لذت موت سے نااشتا حیات محض کی لذت سے سرشار سدا عالم کیف و مدور میں رہیں گے۔ بر خلاف اس کے اہل جہنم لذت حیات و مدامت سے نااشتا، عالم سکرکات میں رہیں گے۔ قرآن مجید کی زبان میں وَلَا یُکَوِّتُ فِیْہَا وَلَا یُجْبِیْ (۲۰: ۷۷، ۸۸: ۱۳)

جہاں تک خود فرد بشر کا تعلق ہے، اس کے دو عالم ہیں: ایک معروضی دوسرا موضوعی۔ معروضی عالم اس کا معاشرتی جہان ہے، جس میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اس کا ایک اور جہان بھی ہے، جسے موضوعی یا داخلی عالم سے تعبیر کرتے ہیں، یہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے، یہ اس اعتبار سے کردہ اس کی خود تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ اور اس میں اسی طرح رہنے اور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ جس طرح معاشرتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پیغمبر عظیم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام جہانوں کے لئے ”رحمت“ ہیں۔

یہاں اس لطیف نکتے کی طرف دھنا حق اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ رب رحمن و رحیم نے یہاں یہ ہنسی فرمایا کہ آپ رحیم ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ آپ رحمت ہیں۔ سوال پیدا ہوا کہ کیا اس کی علت غائی یہ ہے کہ رب جمیل و جلیل اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہے کہ آپ اس غایت درجہ رحیم ہیں کہ آپ کی ذات ”خلق میں“ ”رحمت“ کے سوا کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو رحمت کے منافی ہو یا اس زمرے میں نہ آتی ہو۔ یہ بات اہل علم و نظر سے پوشیدہ نہیں کہ قریب قریب ہر زبان کا یہ محاورہ ہے کہ کسی موصوت کی تعریف بدرجۃ اتم بلکہ مبالغہ کی حد تک مقصود ہو، تو اسے اس کی صفت سے موصوت کرنے کے بجائے محض صفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ نفلان شخص

یہ حد حسین ہے، یہ کھینچے، میں کر دہن“ یعنی اس سے اس امر کی توجیہ و توضیح ہو جاتی ہے کہ کہیں رب رحمن و کریم نے آپ کو رحمت کہا۔ پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں، یعنی مرن عالم انسانی کے لئے رحمت ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ جملہ مخلوقات اور جہانوں کے لئے رحمت ہیں، یعنی رحمتہ للعالمین ہیں۔ اس سے مقصود اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف نبی فروع انسان، بری بحری، فضائی جانوروں اور نباتاتی، جماداتی، سماوی عالم بلکہ جملہ مخلوقات کائنات کے لئے رحمت ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات آپ کے عالمگیر دہمگیر اخلاق حسنہ یا خلق عظیم سے مستفید و مستفیض ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اصل یہ ہے کہ رحمتہ للعالمین اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ آپ ہر عالم اور اس کی مخلوقات کے لئے رحمت ہی محبت، شفقت ہی شفقت اور احسان ہی احسان ہیں اور یہ بات آپ اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ ”محبت“ کو خلوص و صدق اور قربانی و دفا شفقت کو ہمدردی و دہم گساری، حلم و بردباری اور غفور و درگزر اور ”احسان“ کو فلاح و بہبود، حسنہ و خیر، جود و سخا اور حسن سلوک و ایثار تسلیم ہیں۔

نہ صرف تاریخ، کتب احادیث و سیر بلکہ خود کلام الہی آپ کی سیرت حسنہ کی اس ماہ الامتیاز خصوصیت کا شاہد ہے کہ آپ جس طرح رحمتہ للعالمین تھے اسی طرح صاحب خلق عظیم بھی تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس لطیف داہم نیکے کی مراثت کر دی جاتی ہے کہ خلق اس خیر، حسنہ یا نیکی سے عبارت ہے، جو طبعی و اضطراری ہونے کے ساتھ ساتھ ارادی و اختیاری اور شعوری بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسن نیت و شعور کے بغیر یہی حقیقت میں نیکی نہ ہوگی۔ علاوہ بریں خلق بھی رحمت کی طرح ایسا لفظ ہے جسے گنجینہ معانی کہیں تو بالحد نہ ہوگا، اور اس میں خصلت دعادت، قول و فعل اور رویہ و کردار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اُنْكَ لَعَلَّی خُلُقٌ عَظِیْمٌ کا مطلب ہوگا کہ آپ کی خصلت دعادت، قول و فعل اور رویہ و کردار میں حسن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حسن کے باعث ہی آپ کے محاسن یا مکام اخلاق میں لامحدود عظمت و درغمت اور لامتناہی آفاتیت و دہم گیری پائی جاتی ہے بالفاظ دیگر آپ کا حسن خلق آپ کی رحمت کی طرح کل عوالم کو محیط تھا۔

یہ غیر اعظم و آخر اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ایک ایک گوشے کا مشاہدہ بالحق کیجئے، آپ کا معاملہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ حامل خلق عظیم اور رحمتہ للعالمین تھے اور اپنی تعلیمات، حکمت آموزی اخلاق آفرینی، سنت حسنہ اور تبریک رحمتہ للعالمین کے باعث آج بھی رحمتہ للعالمین ہیں اور ابلا بابت تک رحمتہ للعالمین رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں سچ تھا، جھوٹ نہ تھا، حسن تھا نتیجہ نہ تھا، عدل تھا ظلم نہ تھا، صدق و اخلاص تھا، کذب و دغا نہ تھا، شفقت و محبت تھی، حسد و عناد نہ تھی، حلم و رحم تھا، غصہ و انتقام نہ تھا، ہمدردی و دہم گساری تھی، تعاف و جناحاری نہ تھی، انکساری و تواضع تھی، غرور و تکبر نہ تھا، سعادت و رفعت تھی، قسوت و شقاوت نہ تھی، احسان و ایثار تھا، خست و بخل نہ تھا، شیریں کلامی تھی، تلخ کلامی نہ تھی، صبر و استقامت تھی، کم ہمتی و ناشکیبائی نہ تھی، شجاعت

تھی بزدلی نہ تھی، الغرض، آپ کی سیرت حسنہ جگہ محاسن و کمالات سے اس طرح مزین تھی کہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپ نہ صرف عالم انسانی بلکہ سب جہانوں کے لئے رحمت تھے، ہیں، اور ہمیشہ رحمت رہیں گے۔

تاریخ ہمیں بار بار اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ آپ اس قدر فیاض و بخشنے والے تھے، خیر و محسن تھے کہ آپ کے پاس جو کچھ ہوتا اہل احتیاج میں تقسیم کر دیتے۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف اپنی شائع بلکہ اپنی مالدارانہ وجہ مطہرہ حضرت حدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت بھی پہلے دنا ہی کا محو اور پھر تحریک اسلام پر صرف کر دی۔ بیعت سے پہلے مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ اتنا سخت قحط پڑا کہ بقول شیخ سعدی ”یا لایاں فراموش کردند عشق“ آپ سے قحط زدہ لوگوں کی حالت زار دیکھی نہ جاتی تھی اور آپ نے دونوں مرتبہ ہزاروں درہم دینا دیا بلکہ جو کچھ آپ کے پاس تھا، ان میں تقسیم کر دیا، لیکن اس شکر بلکہ حقیقت کے مصداق کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا،

آپ کا قلب سعید و معمور رحمت تھا، اپنی غایت درجہ جو در سخا اور ایشیا و قربانی پر نہ مطمئن ہو سکتا تھا اور نہ ہوا، کیونکہ اس کی حقیقی آرزو تو یہ تھی کہ نہ صرف عرب بلکہ کل دنیا میں نہ بھوک و پیاس رہے نہ فحشا و احتیاج، کوئی بے گھر نہ رہے نہ بے کار، کوئی کسی کا محکوم و غلام نہ رہے اور نہ محتاج و دست بخور، نہ کوئی مظلوم و بے کس نہ رہے نہ مقہور و مغضوب، ساری دنیا میں نہ ظلم و جہل نہ رہے نہ شرک و بت پرستی۔ الغرض کسی انسانی معاشرہ میں ضرورت نہ رہے نہ آرزو، فروغ و کامائی نہ رہیں نہ قارون و ابولہب نہ رہیں نہ ابولہب نہ رہیں نہ ابولہب نہ رہیں۔

آپ مسلسل اس مسئلے پر تفکر و تامل کرتے رہے کبھی خانہ کعبہ میں تو کبھی عورت کدہ خانہ میں، اور آخر کار اس مسئلے کو حل کرنے کی طلب جستجو آپ کو سنگنائے غار حرا میں لے گئی۔ آپ کی یہ طلب جستجو دراصل صرف اہل عرب یا افراد نسل انسانی کے لئے نہیں بلکہ کل جہانوں کے لئے رحمت تمام بننے کی آرزو تھی۔ بالفاظ دیگر یہ ایک عالم گیر و ہمہ گیر اور حسین و منور انقلاب کی آرزو تھی، جو وہ اولاد آدم کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ خود آگاہ و عملاً آگاہ بن جائیں اور شرک و بت پرستی سے نکل کر توحید کی روشنی میں آجائیں اور اس طرح اپنے وقت کے نمرودوں، آذروں، فرعونوں، پادشاہوں اور قارونوں کی غلامی و محکومیت سے نکل کر مکرم و آزاد زندگی گزار سکیں۔ نیز نہ صرف اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، اپنی قوم و ملت اور نسل انسانی کے لئے بلکہ جملہ مخلوقات کے لیے رحمت بن جائیں۔

آپ کی آرزو سچی تھی اور رب العالمین کی حسین مخلوقات کی دنیاوی و اخروی زندگی کو حسین نور بنانے کی حسین آرزو تھی اور پھر جس رب حکیم و علیم نے آپ میں رحمتہ للعالمین بننے کی استعداد بھی بدرجہ اتم و دلالت کی تھی، اسی نے آپ کی آرزو پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور آپ کو نبوت و رسالت کے حسن المقام پر منتخب کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اس حقیقت نفس الامری سے آگاہ کر دیا کہ۔

وما ارسلنا الا رحمة للعالمین (۲۱: ۱۰۷) اور انب لعلی خلق عظیم (۶۸: ۱۱۳)

لہذا آپ کی سیرت حسین ترین نمونہ یا ماڈل ہے اور اب آپ کا فریضہ رسالت و نبوت اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمین کو چلانے پر مبنی ہے، اگرچہ اسلام کی روح توحید میں خود ایسی قوت جمال و جلال ہے جو اسے ایک محرک رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ساتھ ہی ربّ علیم و حکیم نے رحمۃ للعالمین کی رہنمائی کے لئے قرآن مجید ایسی معجزانہ جادو کی کتاب کی تشریل کا سلسلہ شروع کر دیا جو نور ہدایت اور رشد و شفا ہے، نیز جو علم و حکمت اور عزان و معرفت کا سرچشمہ ہے اور اس میں قلب انسانی کا تزکیہ و تصفیہ اور اس کی خدا داد و معجز نما قوتوں کا نشو و ارتقا کرنے کی تاثیر حسن بھی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ آخری و محفوظ کلام الہی اپنے مخلص و متقی تلامذہ کے اخلاق کی تعمیر تحسین اور تکمیل بھی کرتا ہے۔ یہاں اس انبیا اہم کلمے کی صراحت کردی جاتی ہے کہ اسلام محض ایک دستور حیات نہیں بلکہ تحریک بھی ہے اور اس کے بانی رحمۃ للعالمین کے حوالے سے تحریک رحمۃ للعالمین ہے، جس سے کل عالم کی مخلوقات نے اپنے آپ کو مستفید و مستفیض ہونا ہے۔

علاوہ ازیں، حامل خلق عظیم کی نسبت سے اگر اسلام کو تحریک اخلاق سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسلام میں حسن خلق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن خلق کو مومن کی بنیادی صفت قرار دیا ہے۔ لہذا رحمۃ للعالمین نے سب سے پہلے لوگوں کے اخلاق کی تعمیر و تزئین کرنے کی خاطر انہیں ایمان و توحید کی دعوت دی اور ان پر توحید کی حقیقت آشکار کی تاکہ وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن جائیں۔ شرک و بت پرستی کی ناپائیداری سے نکل کر حسن و حق کی روشنی میں زندگی بسر کریں اور اپنے دشمن ارضی و پیدائشی شیطان الرجیم کو پہچانیں اور اس کی ٹھوس و غلطی سے محفوظ رہ سکیں۔ صرف فرعون و دایمان، تارون و لوطیہ و عمرو و آزار و عبداللہ بن ابی اور مسلمہ کذاب ہی تو شیطان کے بہکائے ہوئے نہیں بلکہ ہر زمان و مکان میں دینی و سیاسی احوال و ظروف کے مطابق اپنے آپ کو مختلف اسباب و القاب سے موسوم کر کے اور محافظ دین و ملک کا خرقہ سانس پہن کر شیطان کے بہکائے ہوئے لوگ کارزار حیات میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمین کا اصل الاصول توحید ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار و اعتراف ہوگا جو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ توحید ہی اصل دین و ایمان ہے اور اس میں اپنی نوعیت کی ایسی قوت جمال و حق ہے، جس کی حریف کوئی باطل قوت نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں، اس میں دیگر تمام ادیان پر غالب آ جانے اور اقوام عالم میں اتحاد و ایتلاف پیدا کرنے کی قوت حسن ہے۔ یہ عقیدہ توحید ہی تو ہے جس سے انسان میں حیرت انگیز فطری قوتوں کا شعور اپنی پوری شدت سے بیدار ہوتا ہے، ان قوتوں ہی کی بدولت وہ ایک طرف کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے اور دوسری جانب اپنے نور ذات اور مدارم اخلاق کی تکمیل کر کے احسان و رضوان کے حسن المقام پر بسکتا ہے جو کہ معراج انسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ توحید کو اپنی ذات میں جذبہ کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی اصل دین ہے۔ یہی ہمنغہ اللہ

یاد رنگ الہی ہے اور رنگ الہی میں اپنے آپ کو رنگنے کا مطلب تخلق و اخلاق اللہ ہے یعنی اپنے اندر صفات الہیہ پیدا کرو، جنہیں محاسن و کمالات اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شخصیت انسانی پر رنگ الہی جس قدر چڑھا ہوگا، اسی قدر خلق انسانی میں وسعت و گہرائی اور رفعت و عظمت کی نمود ہوگی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک رحمتہ للعالمین کا مقصد افراد نسل انسانی کو رنگ الہی میں رنگنا یا بالفاظ دیگر خلق انسانی کی تعمیر و تہذیب کر کے اسے عظیم بنانا ہے تو یہ بالکل سچ ہے، اظہار حقیقت ہو گا۔ چنانچہ جیسا کہ نادر کا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ سے ثابت ہے، آپ نے جب اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو انتہائی ناسانہ گارحالات میں انتہائی کامیابی کے ساتھ چلا کر اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کر دی اور اپنی تحریک کے ہزاروں رفقاء کے کارکردگ الہی میں رنگ دیا، بالفاظ دیگر ان کے کمالات اخلاق کی تکمیل کر دی اور انہیں اس قابل بنادیا کہ وہ آپ کے مشن یا تحریک رحمتہ للعالمین کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکیں، تو آپ نے ان ہزاروں صحابہ کرامؓ کے ساتھ حجۃ الوداع کا فریضہ ادا کرنے میں ان عرفات میں اپنے اللہ جلیل درجہ جلیل کے حضور حاضر ہوئے۔ اہل ہر دفا کی لبیبہ، اللہ لبیبہ کی ایمان افروز روح پرورد صدق سے نعمت گو بنچنے لگی اور آسمان سے نور و رحمت کی بارش ہونے لگی تو آپ نے یہ ندائے فردوس گوش سنی:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (۳:۵)

ترجمہ: آج کے دن، تم نے تمہارے لیے دین کی تکمیل کر دی اور ہم نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

یہ ندائے روح پرورد آپ کے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود رب العالمین کی تقی اور اس میں یہ نوید جاں فزا مضمحل کی مبارک ہو آپ نے اپنا رسالتی مشن پورا کر لیا ہے اور آپ نے کمالات اخلاق کی تکمیل کر دی ہے لہذا اب آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد فرزندان توحید آپ کے مشن یعنی اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو جاری رکھیں گے اور یہ ہمیشہ قیامت تک چلتی رہے گی۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے اخلاق کی تعمیر و تکمیل اور تطہیر و تہذیب کرنا اور آپ کی تحریک رحمتہ للعالمین کو چلا نا ہی مقصود قرآن و سنت ہے، نیز جس طرح آپ نے اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کی اور اپنی یعنی اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین کو چلا یا اور اس راہ میں جس طرح صبر و استقلال سے مصائب و دشواری برداشت کیے اور جس جرأت و پامردی سے اس وقت کے فرعونوں، ہامانوں، فاروقوں، عمروں اور آزدوں کا مقابلہ کیا، اس میں حسین و کامل ہندگی کرنے کا حسین نمونہ ہے اور یہی مفہوم ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱:۳۳) کا۔

چنانچہ جو شخص مومن بن کر رحمتہ للعالمین کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اسلام کی تحریک رحمتہ للعالمین میں برکت و رغبت شامل ہو جاتا ہے اور ہر پور حصہ لینے لگتا ہے، وہ بشمول نوع انسانی کے کل مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ پھر وہ نہ تو مشرک و بت پرست ہو سکتا ہے اور نہ ظالم و دغا بر۔ وہ نہ منافق و متکبر ہو سکتا ہے اور نہ دیا کار و کمرش، وہ نہ



مصرف و خلیج پر سکتا ہے اور نہ سرحد و سرماہ پرست۔ نہ تو عیار و کاذب نہ مفسد و مفتن۔ وہ نہ کسی کے سامنے ہتھ پھیلا سکتا ہے نہ سرہی جھکا سکتا ہے۔ وہ جلب منفعت کی خاطر نہ تو لوگوں کا استعمال کرتا ہے نہ حرام دنا جائز طریقوں سے دولت حاصل کرتا ہے۔ وہ نہ تو ضمیر فروش و جہم فروش ہوتا ہے اور نہ لطف فروش و کلم فروش۔ وہ انکار و ادکار کرتا ہے نہ چور و زاری و جعل سازی۔ اس کے ہاتھ، زبان اور قلم سے نہ تو کسی کو گزند پہنچتا ہے اور نہ کسی کی عزت نفس بوجھ ہوتی ہے۔ وہ نہ قوت و اقتدار کے نشے میں لوگوں کی آزادی و تقریر و تحریر سلب کر سکتا ہے نہ ان پر اپنا حکم ہی چلا سکتا ہے، کیونکہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ **إِن الْحُكْمَ لِلَّهِ** (یوسف: ۴۰)۔

یہی نہیں، تحریک رحمت للعالمین کا رضا کار انسان تو انسان کسی حیوان کو بھی بلا وجہ ایذا نہیں پہنچاتا بلکہ ان کی پرورش و محمد اشت کرتا ہے۔ وہ پالتو جانوروں کی طرح جنگلی، صحرائی، کوهستانی، فضائی اور آبی جانوروں کو بھی اپنے رب رحیم و جمیل کی مخلوقات سمجھ کر ان کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے۔ عالم انسانی کی طرح وہ عالم نباتاتی و جماداتی کے لیے بھی رحمت ہوتا ہے۔ وہ شجر کاری تو کرتا ہے، مگر شجر برا نہ ماری نہیں کرتا۔ وہ درختوں، پودوں اور فصلوں کی نشوونما کے لیے ان کا تزکیہ تو کرتا ہے لیکن انہیں نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح وہ جنگلات کی حفاظت کرتا ہے۔ اور انہیں نہ تو بر باد کرتا ہے نہ برباد ہونے دیتا ہے۔ وہ زمین سے پانی نکالتا اور اس سے مستفید تو ہوتا ہے مگر اسے منافع نہیں کرتا چشموں، نہروں، کاربڑوں، ندی نالوں، دریاؤں اور جمیلوں کی حفاظت کرتا اور ان سے آب و توانائی حاصل کرتا ہے اور انہیں منافع نہیں ہونے دیتا۔ وہ ماحول کو صاف ستھرا اور حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسے گندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین سے تیل، گیس اور طرح طرح کی معدنیات نکالتا اور ان سے مستفید ہوتا ہے، غافل اور بے ہنر نہ کہ کفران نعمت نہیں کرتا۔ وہ تو زمین کے ذروں کا جگر چیر کر ان سے جوہری توانائی حاصل کرتا ہے۔ وہ پانی سے بجلی پیدا کر لیتا ہے۔ وہ فضاؤں کو مسخر کر کے زمان و مکان کے فاصلوں کو کم کرتا اور انسانیت کے لیے رحمت بناتا ہے۔

الغرض رحمت للعالمین اور حامل خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیروکار مخلوقات کے لیے رحمت بننے کی خاطر علم کی قوت یا اصطلاح قرآنی میں ”سلطان“ کے ذریعے سے کائنات کی نعمتوں سے تمتع و استفادہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اصل میں مفہوم یہ ہے کہ رحمت للعالمین، خلق عظیم اور اسوۂ حسنہ کا، اور یہی مقصود ہے اسلام کی تحریک کا اور یہی مشیت ہے ربّ ذوالجلال والاکرام کی۔

# اسلامی نظام عدل کا نفاذ

## مشکلات اور ان کا حل

جناب محترم مولانا سید محمد متین ناشی

الحمد لله وكفى وسلا م على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد

مغرب کا نظام عدل کوئی سو ڈیڑھ سو برس سے ہمارے ہاں نافذ ہے اور اس سے مانوسیت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اسلامی نظام عدل کا ذکر آتے ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کی ضرورت کیا ہے ؟ مغرب کے نظام عدل میں جو خرابیاں دکھائی دے رہی ہیں کیوں نہ بعض عملی اقدامات کے ذریعہ انہیں دور کر دیا جائے ؟ لوگ یہ بات واضح طور پر کہیں یا نہ کہیں لیکن اسلامی نظام عدل کا معاملہ عام طور پر کسی سنجیدہ اور دُور رس اقدام کے بجائے ایک جذباتی خواہش بن چکا ہے۔ اس صورت حال کے پیچھے ایک پیچیدہ نفسیات کا رفرما ہے اور اسے سمجھنے بغیر مسئلے کے حل کی طرف کوئی قدم اٹھانا تو درگناہ ہم اس مسئلے کی نوعیت تک کو نہیں سمجھ سکتے۔

دنیا بھر میں انقلاب اور تبدیلی کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگ کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں اور ظاہر ہے کہ تبدیلی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب موجودہ صورت حال میں کسی کمی یا کسی بنیادی غامی کا احساس ہو۔ مغرب کے نظام میں ہمیں سب سے پہلے موجود صورت حال سے مطمئن رہنا سکھا یا ہے۔ انسانی نفسیات میں ”قدر اعلیٰ“ کی طرف جو فطری میلان ہوتا ہے یہ نظام اسے تدریجاً اور منظم طور پر مٹاتا ہے اور اس کی سمت کو بدل کر اسے معاشی مابقت کا رنگ دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم میں سے کچھ لوگ اس کا احساس بھی رکھتے ہوں کہ اسلام کا نظام عدل ایک بہتر اور ارفع نظام ہے جب بھی یہ خیال ان کے کسی عملی اقدام کی بنیاد نہیں بن سکتا اس لیے کہ عام طور پر ان کا یہ خیال ہے کہ موجودہ نظام اول تو اسلام کے نظام عدل سے متصادم نہیں ہے، اگر کہیں جزوی طور پر تضاد موجود بھی ہے تو اسے ترمیم کے ذریعہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس فکر کے پیچھے دو مغالطے کام کر رہے ہیں جن میں سے ایک منطقی اور دوسرا علمی ہے۔

منطقی مغالطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شے کسی دوسری شے سے متصادم نہیں ہے تو وہ اس شے

کا بدل بن سکتی ہے۔ حالانکہ کسی شے کا کسی دوسری شے سے متصادم نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ شے ثانی شے اول کا بدل بھی بن سکتی ہے۔ کیونکہ ایک شے متصادم نہ ہونے کے باوصف ناکافی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں پر بغیر ضروری زور ہو سکتا ہے۔ اہم پہلو نظر انداز ہو سکتے ہیں۔ پچنانچہ مغرب کا نظام عدل ان معنوں میں اسلام کے نظام عدل کا بدل نہیں بن سکتا۔ لیکن ہم اس امر کو اس کے پورے سیاق و سباق میں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اس علمی مغالطے کو نہ سمجھ لیں جو درحقیقت اس پورے فساد کی جڑ ہے۔

مغرب اور اسلام کے نظام ملے عدل میں فرق جزوی اور ثانوی حیثیت کا نہیں ہے، یہ فرق سمتی، اساسی اور فیصلہ کن ہے۔ وہ اس طرح کہ دنیا کے ہر نظام اور ادارے کی بنیاد اس چیز پر ہوتی ہے کہ کسی خاص نظام کے پیچھے کونسا تصور انسان کا فرما ہے۔ اسلام کا تصور انسان تو واضح ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، پچنانچہ جو چیز بھی انسان میں خلافت اللہ کے عنصر کو ملتی ہے وہ اسے انسان کی تعریف سے بھی خارج کر دیتی ہے، چاہے اس کی شکل و صورت اور ماتحت پاؤں وہی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل میں شہادت کے سلسلے میں خصوصاً بعض ایسی بنیادی شرائط رکھی گئی ہیں جن کے بغیر انسانی حیثیت قائم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مغرب کے پورے نظام کے پیچھے جو تصور انسان کام کر رہا ہے وہ یونان سے آیا ہے اور جسے ارسطو نے سماجی حیوان (SOCIAL ANIMAL) کہہ کر بیان کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظام سماجی حیوان اور اس کی ضرورتوں کے مطابق وضع کیا گیا ہے وہ اپنے اس دائرہ کار میں تو شاید کسی حد تک کفایت کرے جو اس تصور سے مطابقت رکھتا ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں انسان کا بنیادی تصور ہی خلیفۃ اللہ فی الارض ہے یہ تصور اور کچھ نہ سہی تو ناکافی ضرور ہے۔

مغرب میں نظام عدل کے پیچھے انسان کی بنیادی تعریف حیاتیاتی ہے یعنی جس مخلوق کو سائنسی زبان میں انسان قرار دیا جاسکے وہ قانون کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور انسان قدری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس میں انسانیت کا قدری پہلو پایا جاتا ہے تو پھر اسے انسان گنا جائے گا ورنہ قرآن کی اصطلاح میں اولئک کا لا تعام بل حمداً اصل کا مصداق ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو اس سارے مسئلے کی جڑ ہے۔ ایک اور بات ایسی ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلم معاشرے میں جب تک اسلامی قوانین نافذ رہے قانون کی خلاف ورزی کم سے کم ہوتی تھی اور جب

اسی معاشرے میں مغربی قوانین نافذ کئے گئے تو قانون کی خلاف ورزی بہت بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ چودہ سو برس کی شرح جرائم اور ڈیڑھ سو برس کی شرح جرائم سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قانون کے پس پردہ تصور انسانی کے علاوہ اس قانون کے تحت زندگی گزارنے والوں کا مذہبی شعور کا فرما ہوتا ہے، کیونکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے فیصلے کی بابت اگر کسی کم سے کم درجے کا تصور عصمت اور تصور طہارت نہ ہو تو قانون موثر ثابت نہیں ہو سکتا، اور ظاہر ہے کہ یہ تصور عصمت و طہارت مذہب ہی سے میسر آ سکتا ہے۔ لہذا جب مغربی نظام عدل مسلم معاشرے میں نافذ ہوا تو چونکہ وہ نظام معاشرے کے مذہبی شعور اور مذہبی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لیے معاشرے کے باطن نے اسے قبول کرنے سے اباہ کیا، جس کے نتیجے میں ذمہ نیک لغات پیدا ہوئی اور جرائم کا ارتکاب بڑھ گیا۔

مغربی اور اسلامی نظام عدل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عدلیہ ہی اصل میں وہ چیز ہے جو معاشرے کے اعمال و افعال کو مخصوص خطوط پر استوار کرتی ہے۔ اسی لیے ہر ملک کا نظام عدل اس ملک کے اساسی نظریات و معتقدات کا عکاس ہوتا ہے اور اس حوالے سے صرف اسی ملک کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کو مد نظر رکھا جائے تو ملک کے باشندے اس نظام عدل سے نہ صرف یہ کہ ناواقف رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی زندگی اس نظام عدل سے متصادم ہو جاتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بنیاد اسلام ہے اور ملک میں کم و بیش برطانوی قوانین نافذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ برطانوی نظام حیات کی اساس دوسری ہے اور اسلامی نظام حیات کی دوسری، جس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے جرائم میں جو برطانوی قانون کی رو سے جرم ہی نہیں شمار کیے جاتے بلکہ بعض اوقات انہیں قانونی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً عمل ہم جنسی، یا کلب میں جوا کھیلنا، یا شراب نوشی، یا زنا بالرضا جبکہ اسلامی نظام عدل میں ان میں سے بعض جرائم کی سزا موت اور بعض کی کوڑے ہیں۔

مغربی اور اسلامی نظام عدل پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مغربی قانون کا ارتقاء استقرائی منطق پر ہوتا ہے جسے اگر شمار یا تئ کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، یعنی دہائی قوانین ہزار در ہزار، لاکھ دو لاکھ انسانوں کے طرز عمل BEHAVIOUR کو دیکھ کر وضع کر دیے جاتے ہیں لیکن استقراء یا شماریات میں غلطی کا امکان ہے۔ جب کہ اسلامی نظام عدل کی اساس انسانی فطرت پر ہے۔ اسی وجہ سے مغربی قوانین میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے کیونکہ انسانی طرز عمل متبدل و متغیر ہے جب کہ اسلامی نظام عدل میں تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے کہ

انسانی فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ کہ وہ نظام عدل جو کسی خاص طرز عمل (BEHAVIOUR) کے انسانوں کے لیے وضع کیا گیا ہو عالمگیر نہیں ہو سکتا جب کہ وہ نظام عدل جو فطرتِ انسانی پر مبنی ہو عالمگیر ہوتا ہے۔ لہذا اسلامی نظام عدل کو اگر مغرب میں نافذ کیا جائے تو وہاں یہ کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ بہر حال وہاں انسان ہی رہتے ہیں لیکن مغرب کا نظام عدل پاکستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ مغربی باشندوں کے طرز عمل اور پاکستانیوں کے طرز عمل میں اختلاف ہے۔ مختصر یہ کہ ہمیں آخر کار پاکستان میں مکمل اسلامی نظام عدل نافذ کرنا ہو گا ورنہ ہمارا معاشرتی ارتقاء ہرگز اسلامی نہ ہو گا۔

## اسلامی نظام عدل کی چند امتیازی خصوصیات

- ۱۔ دیگر نظام عدل کو جو چیز دیگر نظام عدل سے ممتاز کرنے والی ہے یہ ہے کہ :  
 دیگر نظام عدل (وضعی قوانین) کو سوسائٹی کے افراد اپنے سوال و ظروف اور اپنی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تیار کرتے ہیں جبکہ اسلام کا نظام عدل خود معاشرے کو اپنے خطوط اور اپنی اساس کے مطابق ڈھالتا ہے۔ بصورتِ اول سوسائٹی آگے آگے ہوتی ہے اور قانون اس کے پیچھے جب کہ اسلامی نظام عدل آگے ہوتا ہے اور معاشرے کو اس کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔
- ۲۔ صفتِ دوام۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل وحی الہی پر مبنی ہوتا ہے، یعنی اس کا صانع اور منزل اللہ تبارک و تعالیٰ ہے جب کہ وضعی قوانین انسانی ذہن کے نائیدہ ہیں اور چونکہ ”الانسان صوبک من الخطاء والنسيات“ اس لیے انسان کے وضع کردہ قوانین میں فطری طور پر وہ ضعف، عجز، کم ہمتی، نتائج سے عدم واقفیت، مستقبل سے بے خبری پایا جاتی ہے جو اس کی سرشت میں داخل ہے یہی وجہ ہے کہ قانون بنتے ہی اس میں ترامیم شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس اعتبار سے دیکھیں تو وضعی قوانین ہمیشہ ناقص اور ناقابلِ اصلاح رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی قوانین چونکہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، ایک ایسے رب کے جو علم و خیر ہے، جس کے سامنے ازل اور ابد سب کھلے ہوئے، جو مستقبل کے تمام انقلابات سے آگاہ ہے اور جس کو علم بر شے کو محیط ہے، اس لیے اس میں نقص کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور وہ اساسی طور پر ہر تغیر اور تبدیلی سے بے نیاز ہے۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی نظام عدل اپنے اندر صفتِ دوام رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں :

(الف) قرآن کریم میں ارشاد ہے :

لَا تَسْرِقُوا زُرَّاقًا وَلَا زُرَّاقًا وَلَا تَسْرِقُوا زُرَّاقًا (فاطر ۱۸)

ترجمہ : کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یعنی جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے سزا اسی کو ملے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

(ب) یا ارشاد باری ہے :

لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲۸۶)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کسی بھی نفس پر اتنی ہی کلفت ڈالتا ہے جتنی کہ وہ برداشت کر سکے۔

اس آیت سے یہ اصول متفرع ہوا کہ شرعی احکام میں تکلیف مالا یطاق کی گنجائش نہیں۔

(ج) یا ارشاد ہوا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل ۹)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ تمہیں انصاف اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے

اور فحش باتوں، ناجائز کاموں اور سرکشی اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔

(د) یا فرمایا :

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوا الْأَمْثَالَ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸)

ترجمہ : اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرنا

اور جب تمہیں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا پڑے تو انصاف سے فیصلہ کرنا۔

(۴) ایک مقام پر حکم فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوَّلَ الْإِنْسَانِ وَالْكَافِرِينَ (النساء ۱۳۵)

ترجمہ : اے ایماندار بندو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے گواہی دو

اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا تمہارے والدین یا عزیز و اقارب

کے خلاف ہو۔

(و) سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ غَيْرًا مُبْسُطِينَ  
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاةُ قَوْمٍ عَلَى أَنْ لَا تَعْلَمُوا مَا آتَى اللَّهُ بِالْبَاطِلِ  
أَقْرَبُ بِدْتَقْوَى اللَّهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ  
(المائدہ ۸۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے میں مستعد ہو اور  
البتہ ہو کہ لوگوں کی عداوت تم سے گواہی دینے میں بے انصافی کرے۔ انصاف  
کرو کہ انصاف ہی پر ہیہر کاری تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے اور اللہ سے ڈرو  
کیونکہ وہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔

ان آیات کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم  
مفکرین و مقتنیں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ثابت کر دیں کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود قانون  
سازی کی ان اساسیات میں معمولی سا نقص، معمولی سی کسکی اور خفیف سی کمی پیدا ہوئی ہے؟ ہرگز  
نہیں۔ قانون سازی کی بنیادیں انقلاب و ہور و ایام سے قطعاً بے نیاز ہیں۔

## 4/61 مسالوات

اسلامی نظام عدل کی اہم ترین امتیازی خصوصیت اس کا عطا کردہ قصور مسالوات ہے۔ یعنی  
قانون اسلامی کے آگے امیر، عریب، بادشاہ، فقیر، محکوم، حکمران برابر ہیں حتیٰ کہ نبی اکرمؐ نے اپنے  
یا اپنے اہل خاندان کے لیے بھی کسی قسم کا استثناء گوارا نہ فرمایا اور غزوہ بدر میں جب آپؐ کی چھڑی ٹھہرت  
سودا کے پیٹ میں لگ گئی اور انھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا تو سیدالکونین امام المرسلینؐ بدر کے  
سپہ سالار صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بطن مبارک سے کپڑا ہٹا کر کھڑے ہو گئے۔ چھڑی سودا کے ہاتھ میں  
سقمادی اور انھیں بطیب خاطر اجازت دی کہ وہ بدلہ لے لیں۔ اسلام کے نظام عدل میں جب  
شارع اسلام اپنی ذات گرامی کو انتقام کے لیے پیش کر سکتے ہیں تو پھر کون ایسا ہے جو خود کو قانون سے  
بالا تر سمجھے۔

آج تو دنیا بہت ترقی کر چکی ہے، قانون و شرور قانون کی لاکھوں کروڑوں کتابیں تیار  
ہو چکی ہیں لیکن مغربی نظام عدل کی رو سے ایک عام شہری بادشاہ کو عدالت میں طلب نہیں کر سکتا  
اور عام عدالتیں وزیراعظم پر مقدمہ نہیں چلا سکتیں، اس لیے کہ بادشاہ سے تو غلطی کا صدور ہی  
ممكن نہیں۔ مگر قرآن کریم چودہ سو برس سے اعلان کر رہا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا  
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)  
ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے درمیان  
شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک  
تو وہی عزت والا ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب مخزومہ عورت نے پوری کی اور قریش نے محسوس  
کیا کہ اگر اس کا ہاتھ پوری کے مقدمے میں کاٹ دیا جائے گا تو قبیلہ قریش کی بے عزتی ہوگی اور  
اسفول نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کرنے  
کے لیے بھیجا تو جواب ملا :

الشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فخطب فقال یا ایہا  
الناس انما ضل من قبلکم الہم کانوا اذا سرق المشریف ترکوا  
واذا سرق الضعیف فیہم اقاموا علیہم الحد وددنا یم  
اللہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یمنہا  
ترجمہ کیا تم اللہ کی حدود کے بارے میں مجھ سے سفارش کر رہے ہو پھر آپ کھڑے ہوئے  
اور خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا : ”لوگو! تم سے پہلے کئی قومیں اسی لیے گمراہ  
ہو گئیں کہ ان کا کوئی معزز آدمی پوری کرتا تو اسے پھونڈ دیتے اور جب کوئی کمزور  
شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا تو اس پر حدیں جاری کرتے۔ اور خدا کی قسم اگر محمد کی  
بیٹی پوری کرتی تو محمد ضرور بالضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتے۔“

کیا اس مساوات کی نظیر تاریخ عالم میں مل سکتی ہے ؟

### نوفِ خدا اور تصورِ آخرت

اسلامی نظامِ عدل کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاشرے کی تربیتِ خوفِ خدا اور  
تصورِ آخرت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان پر ایسا ہر سبب سی پابندیاں عاید کر دی جائیں  
اور اس کے باطن کو نہ بدلا جائے تو عقلی حیلہ ساز بے شمار راستے نکال لیتی ہے۔ اسلام درحقیقت



اپنے معاشرے کو اندر سے بدلتا ہے تاکہ قانون شکنی اور سرکشی کا موقع ہی نہ آئے۔ اس اندرونی تبدیلی کے لیے اسلام سب سے زیادہ خوفِ خدا اور تصورِ آخرت پر زور دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی ابتدا کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا :

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

اس کتاب میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

پھر کہا گیا :

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۚ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ

کہ جس نے بھی ایک ذرے برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کے ثمراتِ قیامت کے دلی دیکھ لے گا اور جس نے بھی ایک ذرے برابر برائی کی ہوگی وہ اس کے نتائجِ قیامت کے دلی بھگت لے گا۔

قیامت کا دن کیسا ہوگا کہ :

يَوْمَ يُفْرَأُ السُّرَّةُ ۚ مِّنْ أَخْيَرِهِمْ وَأَمَّهِ وَابْنِهِ وَصَاحِبَتُهُ وَبَنِيهِ

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (عبس ۳۷)

جس روز انسان بھلگئے لیکن گے اپنے بھائی سے اور اپنے ماں باپ، بیوی اور بیٹے سے اس وقت ان میں سے ہر شخص کو اپنی ہی پڑی رہے گی اور وہ دوسرے سے بے توجہ ہوں گے۔

پھر ارشاد ہوا :

يَوْمَ تَبْيَضُّ الْوُجُوهُ ۖ فَسَالَهُ مِمَّن قُوَّةٌ وَلَا نَاصِرَ (الطارق ۹)

جس روز سب راز فاش ہو جائیں گے تو اس وقت انسان کو نہ خود قوت ہوگی نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی سینکڑوں آیات اور ان کے علاوہ احادیثِ انسان کے باطن کو بدینے والی اور اسے خوفِ خدا اور تصورِ آخرت سے وابستہ رکھنے والی ہیں۔ اسی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب ایک ماں اپنی بچی سے دودھ میں پانی ملائے کہ وہ بھی تھقی تو بچی نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ نے منع فرمایا ہے اور جب ماں نے یہ کہا کہ کیا عمرؓ دودھ میں پانی ملائے ہوئے دیکھ رہے ہیں ؟

تو سب کچھ بولی اٹھی: ماں! عمر تو نہیں سنیں عمر کا خدا دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح کے واقعات حضرت ماعزؓ اسلمی اور غامدیہ کے ہیں۔ اگر ماعزؓ اسلمی اور غامدیہ دربار نبوت میں حاضر ہو کر بار بار اعتراضات زمانہ کرتے تو کون انہیں سزا دیتا۔ واقعات زمانہ کا کوئی گواہ بھی نہیں تھا۔ مگر چونکہ باطن بدل چکا تھا اور ان حضرات نے یہ محسوس کیا کہ ہم سے گناہ سرزد ہو گیا ہے جسے اگرچہ ہم خلق کی نگاہوں سے چھپا سکتے ہیں تاہم خالق کی نگاہوں سے نہیں چھپا سکتے اس لیے دربار رسالت میں حاضر ہو کر پکار اٹھے ”ٹھہرنی یا رسول اللہ“ اسے خدا کے رسولؐ ہمیں پاک کر دیجیے۔ ماعزؓ اور غامدیہ یہ جانتے تھے کہ ہمیں سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جائے گا۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی لیکن آخرت کا قصور اور رب کا خوف تھا جو کشاں کشاں انہیں مقتول میں لے آیا۔

یہی ہے وہ بنیاد جس پر اسلام کا نظام عدلی معاشرے کی تنظیم کرتا ہے۔ کیا دنیا کا ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ نظام عدلی اس طرح کی ایک مثال بھی پیش کر سکتا ہے؟ اس مقام پر اگر آپ مجھے طبی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ اسلامی نظام عدلی کی دیگر بنیادوں میں سے ایک بنیاد PREVENTION IS BETTER THAN CURE ہے۔ کہ ماحول ایسا بنا دیا جائے، احوال اس طرح تبدیل کر دیے جائیں، طبائع میں اس نوع کا انقلاب برپا کر دیا جائے کہ انسان خود بخود جرائم کے ارتکاب سے محترز رہے۔

### سخت ترین عقوبات

اسلامی نظام عدلی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جرائم ثابت ہونے پر وہ مجرم کے ساتھ کسی رورعایت کی گنجائش نہیں چھوڑتا کیونکہ موجودہ دور کی طرح اگر مجرم کے ساتھ رورعایت کی جائے تو نظام تمدن میں خلل پڑے گا اور کسی شریف آدمی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں رہے گی۔ لہذا اسلام کے نظام عقوبات میں سزائیں عرتناک رکھی گئی ہیں۔ نظام عقوبات کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور عالم الغنیفہ حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا، نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا اور مسلمان معاشرے کی طمانیت و سکونِ قلب رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دوچار بار ان کا ارتکاب کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور

اس سے بھی چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معامی میں محض آخرت کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ساری زندگی سوسائٹی کے دیگر افراد کے لیے سامانِ عبرت بن رہے اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرائم کے ارتکاب کی ہر بات کریں۔

اصل میں اسلام نے جو نظام اصلاح قائم کیا ہے اس کی ابتدا ہی فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک کسی معاشرے کے افراد صالح نہ ہوں ان کا مجموعہ یعنی معاشرہ صالح نہیں ہو سکتا۔ لہذا اگر دئے اسلام جو فرد اس قدر فاسد ہو چکا ہے کہ آزادانہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو توڑتا ہے وہ ایک فرد سارے معاشرے کو تباہ کر سکتا ہے۔ اور اس کی مثال اس دانت کی سی ہے جس میں پائٹیوریا کے برائیم داخل ہو چکے ہیں۔ لہذا جو شخص بھی دانتوں کے امراض کا ماہر ہو گا وہ فوراً اس برائیم زدہ دانت کو دانتوں کے اجتماع سے الگ کر دینے کا حکم دے گا۔

حدود کے فقدان میں شریعت نے جو دوسری مصلحت مد نظر رکھی ہے وہ ہے اس کا عبرت ناک ہونا۔ اسی لیے قرآن کریم میں جس مقام پر حد زنا کا ذکر ہے وہاں یہ بھی حکم ہے کہ :

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور ۲)

ترجمہ : اور چاہیے کہ ان کی سزا کا مسلمانوں کی جماعت مشاہدہ بھی کرے۔ یہی مصلحت، معلوم ہوتا ہے سرقہ کی حد میں قطع ید کی بھی ہے۔ کیونکہ ایک دست بریدہ شخص جب ہر وقت مسلم معاشرے میں پھرتا ہے تو اس کے ہتھکڑی دیکھ کر لاکھوں انسان ارتکابِ سرقہ کے خیال سے باز رہیں گے۔

## اسلام میں قضا کا تصور

دیگر نظام ہائے عدلی کی طرح اسلامی نظام عدلی میں عمدۂ قضا، سمجھوتوں کا مار نہیں بلکہ کانٹوں کا ایسا تاج ہے جسے طلب کرنا بھی جائز نہیں۔

شاہ ولی اللہ: حجتہ اللہ البلاغہ: ۲: ۱۵۸ طبع سلفیہ لاہور ۱۹۷۵ء

صحیح بخاری شریف میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:  
 لَا ذُوِيَ أَهْلًا مِنْ سَأَلَهُ وَلَا مِنْ حَرَصَ عَلَيْهِ لَهُ  
 ہم اس شخص کو حاکم نہیں بناتے جو اس عہدے کو طلب کرے یا اس کا لالچ کرے۔  
 اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:  
 مَنْ وَلِيَ الْقَضَاءُ أَوْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ  
 بغير سكين۔ سہ  
 جو قاضی بنایا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے وہ بغیر چھری کے ذبح  
 کر دیا گیا۔

اسی لیے اسلامی نظام عدل میں ہر کس و ناکس کو قاضی نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ کوئی  
 امتحان پاس کرے اور اس کا فقرر عمل میں آجائے، بلکہ مزدوری ہے کہ جسے عہدہ قضا سپرد کیا  
 جائے وہ منتہی اور بے نفس ہو، اسے ہر قسم کے خارجی اثرات سے بے پرواہ ہو کہ صحیح فیصلے پر  
 پہنچنے کی خواہش ہو۔ ایسے قاضی کے بارے میں صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ  
 سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَاَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ  
 فَاجْتَهَدَ فَاتَّخَطَا فَلَهُ أَجْرٌ وَاحِدٌ سہ

ترجمہ: حاکم جب فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور اپنے اجتہاد میں صحیح ہو تو اس  
 کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اجتہاد کیا اور اس سے خطا ہو گئی تو جب بھی  
 ایک اجر ملے گا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام عدل میں قضا ایک عبادت ہے بشرطیکہ تمام  
 مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت قاضی کی نیت درست ہو اور وہ حق والصاف کا دامن اپنے ماتھے سے  
 نہ چھوڑے۔

### شہادت کا معیار

دیگر نظام ملے عدل میں ہر لٹو پنچو شہادت دینے کا معیار ہے خواہ اس کا ذاتی کردار کتنا ہی

گھناؤنا کیوں نہ ہو۔ صرف ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں ہو اور خود اپنی بات کو  
جو وہ ادائے شہادت کے وقت منہ سے نکال رہا ہے سمجھتا ہو۔ لیکن اسلامی نظام عدل میں  
شہادت کا کڑا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اور اولین شرط یہ ہے کہ:  
وَأَشْهَدُوا ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ

(الطلاق : ۲)

ترجمہ: اور اپنے میں سے دو عادل اشخاص کو گواہ ٹھہراؤ اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے  
واسطے دو۔

قرآن کریم کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اسلامی نظام عدل میں ادائے شہادت  
درحقیقت ادائے امانت ہے، اسی لیے عادل کی شرط عائد کی گئی ہے جس کی فقہائے اسلام نے یہ  
تعریف کی ہے کہ:

”وہ کبار سے محبت ہو، معائنہ پر اصرار نہ کرے اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں  
پر غالب ہوں۔“

اس کے علاوہ اسلامی نظام عدل میں ”تزکیۃ الشہود“ کا نظام رکھا گیا ہے جو شاید دنیا  
کے کسی نظام میں نہیں ہے، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ شریعت میں جھوٹی شہادت پر سخت  
سزائیں مقرر کی گئی ہیں اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اکبر الکبائر کہا ہے۔ صحیح  
مسلم شریف میں ہے:

اَلَا اَنْتُمْ كَمِ الْكَبَائِرِ قَالَ قَوْلُ الزَّوْرِ اَوْ قَالَ شَهَادَةُ الزَّوْرِ  
ترجمہ: آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں بتاؤں؟ وہ  
ہے جھوٹ بولنا یا جھوٹی شہادت دینا۔

## مفت اور فوری حصول النصف

ایک اسلامی حکومت کی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمہ داری ہے کہ رعایا  
کو مفت اور فوراً النصف متیا کیا جائے تاکہ غریب سے غریب آدمی اپنا حق وصول کر سکے  
اور کسی شخص کی غربت حصول النصف میں مزاحم نہ ہو، اور چونکہ اسلامی نظام عدل سیدھا

صحیح مسلم : ۱ : ۶ : طبع مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ

سادہ ہے اس لیے مقدمات کے فیصلے بھی جلد از جلد ہو جاتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ مغربی نظام عدلی کی طرح انصاف میں اتنی تاخیر نہ ہو جائے کہ ظلم بن جائے۔ آج ہمارے ملک میں جو نظام عدلی رائج ہے اس نے ہمارے غریب عوام کو مبینہ مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وکلاء کی بھاری فیسیں، اسٹاپ کے اخراجات، ایک معمولی سے مقدمے میں بے ضرورت پچاس تا رینیں، آمد و رفت کے اخراجات عدالتوں کے لالچیں چکر۔ ان چیزوں کی وجہ سے اس وقت غریبوں کو انصاف میسر آنا اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے باعث اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ اسلام کا عطا کردہ نظام عدلی اس وقت بھی دنیا کے تمام نظام ملے عدلی سے نائق، آسان تر، منہب، حیات اجتماعی کے لیے النفع اور قابل عمل ہے۔ ضرورت اللہ پر بھروسہ کر کے قدم بڑھا دینے کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راہ میں مشکلات بھی ہیں اور موانع بھی۔ سو سالہ دور غلامی نے ہم سے احساس زیاں تک چھین لیا ہے۔ ہم اپنے گریبانوں میں چھپے ہوئے آفتاب کو چھوڑ کر دوسروں کے چراغوں کی طرف دوڑنے میں مصروف ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ کسمحک ہم احساس کمتری کے شکار ہیں۔ یہ سب کچھ تسلیم۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے :

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ضرور بالضرور انھیں اپنی راہیں دکھلائیں گے۔ مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ

دورہ منزل لیلیٰ کہ خطر راست سبحان

شرط اول قدم آنتست کہ مجنوں باشی

ہمیں اللہ کے وعدے پر بھروسہ کر کے اسلام کو من کل الوجہ اس ملک میں نافذ کر دینا چاہیے جب ریلوے کا محکمہ ہم سے ٹکٹ دیتے وقت عملاً یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہم تمہیں کراچی بذریعہ ریل پہنچا دیں گے تو ہم اس کے وعدے پر اعتقاد کر کے اسے ٹکٹ کی قیمت بھی ادا کر دیتے ہیں اور اس کی تیار کی ہوئی ٹرین میں بیٹھ بھی جاتے ہیں اور ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں یہ ٹرین ہمیں کراچی پہنچائے گی کہ نہیں؟ تو کیا اللہ کا وعدہ (العیاذ باللہ) پاکستان کے محکمہ ریلوے کے وعدے سے بھی زیادہ مشتبہ ہے کہ ہم حیریں میں پڑے ہوئے ہیں اور تذبذب کے شکار ہیں اور کبھی کہنے لگتے ہیں کہ اسلام کا نظام عدلی فرسودہ ہے، آج کے ماڈرن دور میں نہیں چلی سکتا۔ کبھی

مغربی نظام عدل میں ان سپلوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں جو اسلام سے متصادم نہیں تاکہ جیسے بھی پروانگیزہ بھاد کا نظام ہمارے ملک کے عزیز عوام پر مسلط رہ کر ان کا خون چوسنا رہے۔ ان کے اسلاف کی بخشی ہوئی اقدار حیات کو مسخ کرتا رہے اور ان سے کو لھو کے بیل کی طرح عدالتوں کے چکر پر چکر لگواتا رہے۔ ہماری مثال اس بندر یا کی سی ہے جس کا بچہ چونتیس سال ہوئے مر چکا ہے لیکن وہ اس کے سرے ہوئے ڈھلچے کو سینے سے لگائے پھرتی رہنا چاہتی ہے۔

اللہ کے فضل و کرم سے ہم ۳۳ سال کے بعد اب ملک میں اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پاکستانی عوام کو منزل مل گئی لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ملت پاکستانیہ جو طویل اور صبر آزمایہ ۳۳ سالوں سے بھنگ رہی تھی اور اس کے سفر کی سمت متعین نہ تھی، اب اس کی سمت سفر متعین ہو چکی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا قیام، نظام زکوٰۃ کا نفاذ، بلا سود بنکاری کا آغاز، قومی زبان پر زور، نظریہ پاکستان کی ترویج و اشاعت، حدود اسلامی کا نفاذ، یہ چیزیں ایک صبح نو کی خبر دیتی ہیں۔ لیکن کسی ملک میں کسی نظام کا نفاذ محض کسی حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ یہ کام ہم سب کو مل کر کرنا ہے۔ علما، دکناء، حج حضرات، طلباء، اساتذہ، تجار، صنعت کار، سرمایہ دار، مزدور، زمیندار، اطباء، پولیس، فوج، عمال حکومت اور ملک کے سارے عوام کا یہ فرض ہے کہ اس ملک میں جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسلام کا نظام اپنی پوری جامعیت و مانعیت کے ساتھ نافذ کریں۔ جب تک سارے عوام کا تعاون نہ ہو یہ مرحلہ سر نہ ہوگا۔

## مشکلات اور ان کا حل

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں سب سے بڑی دشواری یقین کی کمی اور احساس کمتری ہے، اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ جو قوم ڈیڑھ سو برس تک انگریزوں کی غلامی رہ چکی ہو اس کی طبیعت میں اس قسم کے عناصر کا پیدا ہونا فطری ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ہم مغربی نظام عدل کو ملک میں باقی رہ کھنا چاہتے ہیں اور ہماری تمام تر کوششیں اس کے لیے کی جا رہی ہیں کہ رائج الوقت مغربی نظام عدل سے ان شقوں کو خارج کر دیا جائے جو شریعت سے متصادم ہیں یہ فطریہ سرے سے غلط ہے، کیونکہ اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہر صورت و بہر حال ہم مغربی نظام عدل کو باقی رہ کھنا چاہتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسلامی نظام عدل کو ملک میں یکسر نافذ کرنے کے لیے اقدامات تجویز

کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظام عدلی کی جو اچھی اور مفید چیزیں ہیں اور اپنی  
 شہاد میں اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہیں انہیں داخل کر لیتے۔ اس کی ہزاروں مثالیں  
 اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً خندق کھود کر دشمن سے مقابلہ کرنا، مجوسیوں کے طرز  
 حساب کو اپنانا، فلسفہ یونان کو اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے استعمال کرنا وغیرہ  
 لہذا اولین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کی حقانیت پر پختہ یقین قائم کریں اور  
 پھر: اذا عزمتم فتوکلی علی اللہ کا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ

گماں آباد ہستی میں یقین مرد مسلمان کا  
 بیاباں کی شب تاریک میں تندیٰ رہبانی

### معاشرے کو تیار کرنا

کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلامی نظام عدلی کو کما حقہ  
 قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے تقویٰ کا جو معیار  
 ہونا چاہیے وہ ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔

### تبلیغ

ہمیں اس سوال پر دو زاویوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے :  
 (الف) ایک تو یہ کہ کیا نفاذ شریعت کو اس وقت تک معرض القیاد میں رکھا جائے جب  
 تک کہ معاشرہ اس کے لیے تیار نہ ہو جائے ؟ یہ طرز فکر غلط اور منہاج نبوت کے خلاف ہے  
 اس لیے کہ اصلاح معاشرہ کے دیگر عوامل کے علاوہ قوی ترین عامل خود نفاذ شریعت ہے۔  
 آپ روشنی لائیے ظلمت خود بخود دور ہو جائے گی۔ شریعت نور ہے اور معاشرے کے مفاسد ظلمت۔  
 نور کے آجانے کے بعد انشاء اللہ العزیز ظلمت خود بخود کا فور ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ یہ کتنا کہ  
 پہلے معاشرہ صحت مند ہو جائے تب شریعت نافذ کی جائے گی بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو  
 کسی طبیب کے پاس لے جایا جائے اور طبیب کہے کہ اس وقت یہ بیمار ہے جب صحت مند ہو جائے  
 تب میرے پاس لے کر آنا حالانکہ شریعت ایک بیمار معاشرے کی خود طبیب ہے۔ اسے اپنی تمام تر  
 برکات کے ساتھ آنے دیجئے وہ خود اس معاشرے کو صحت بخش دے گی۔ اللہ کے فضل و کرم سے  
 ہمارے پاس تو ہر مرض کے لیے سلمان شفا بغیر کسی تحریف و تبدل کے موجود ہے جو انسان کے ظاہری



و باطنی تمام امراض کے لیے داروئے شفاء ہے۔ ارشاد باری ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَاءٌ (السجده ۴۴)  
ترجمہ: آپ اے میرے نبی کہہ دیجیے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفاء ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا :  
وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا يُبَايِعُ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوْقًا  
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَ لَا يَنُذِرُ إِلَّا الظَّالِمِينَ (الْأَحْكَارُ ۵) (بنی اسرائیل ۸۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل تو مٹنے والا تھا۔ اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں۔ مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے۔

(ب) دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی نظام عدلی کو نافذ کرنا ہو تو اس کی شکل کیا ہوگی ؟ اور معاشرے کو کس طرح تیار کیا جائے گا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام عدلی کو نافذ کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اسلامی نظام عدلی کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس کے طریق پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کا بالاختصار جائزہ لیں۔ چند سال پہلے ہمارے معاشرے کی حالت بالکل سعدی کی اس حکایت کی طرح تھی جس میں سعدی نے اس شاعر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ایک سردار کے دربار میں پوسٹیں پہن کر ڈاکوؤں کے ایک قلعہ میں گیا تھا۔ اس نے حسب عادت ڈاکوؤں کے سردار کی شان میں قصیدہ مدحیہ پڑھا اور سردار نے انعام دینے کے بجائے شاعر کے کپڑے اتروا کر ننگ دھڑنگ قلعے سے باہر نکلوا دیا۔ رات کا وقت تھا۔ گھٹوں نے جب شاعر بے چارے کو اس حال میں دیکھا تو بھونکنے لگے اور کاٹنے دوڑے۔ شاعر بھٹکا کہ پتھر اٹھا کر گھٹوں کو مارے تو پتھر برہن کے ساتھ جے ہوئے تھے اس وقت شاعر نے کہا :

”ایں چہ . . . . . کہ سنگ را بستہ و سگ را کشادہ“

کہ یہ کیا کہینہ ہے کہ پتھر تو باندھ دیے ہیں اور گھٹوں کو کھلا پھوڑ دیا ہے۔

اب سے چند سال پہلے ہمارے معاشرے کا یہی حال تھا کہ اکابر صاغر اور صاغر اکابر بن گئے تھے۔ لاکھوں کے مجمع میں فخری اپنی شراب نوشی کا تذکرہ ہوتا تھا اور مجمع اس پر تالیوں کے ذریعہ داد دیتا۔ بالکل وہی صورت تھی جیسے بلقیس کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے کہ :

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذْ دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْنَاقَهُمْ آذِنَةً

أَذِنَةً (النمل ۳۴)

ترجمہ: مطلق العنان — بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلاتے ہیں اور اس بستی کے شرف کو ذلیل بنا دیتے ہیں۔

بحمد اللہ موجودہ حکومت جب سے آئی ہے وہ صورت حال نہیں ہے، بااں ہمہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سنگ راہستہ و سنگ را کشاہہ والی شکل ضرور ہے یعنی بیک وقت ملک میں نیکی اور بدی کی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ اس ہم فہمیت است۔ مگر فی الحال ہمارا حال اس شخص کی ہے جو اپنے سامنے ایک ایسی بالٹی دھرے بیٹھا ہے جس میں پانچ سو چھید ہیں۔ اس بالٹی میں وہ شخص آب غیر مسلسل ڈالے جا رہا ہے لیکن ان چھیدوں کی وجہ سے پانی بالٹی میں ٹھہرتا نہیں۔ لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ خیر کا پانی معاشرے کی بالٹی میں ٹھہرے تو ہمیں سب سے پہلے ان سوراخوں کو بند کرنا ہوگا جن کے راستے تمام اچھی تعلیمات باہر نکل جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نسخہ تجویز کیا ہے۔

ارشاد ہے:

وَأْمُرُوا بِالْعَدْلِ وَاذِنُوا عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْلَاكُمْ  
إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (البقرہ ۱۷۸)

ترجمہ: نیکی کا حکم دوہرائی سے روکو اور اس راستے میں جو مصائب آئیں انہیں صبر سے برداشت کرو کیونکہ یہ بڑی باتوں میں سے ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

الَّذِينَ إِذَا مَكَاتُوا فِي الْأَرْضِ أَخَذُوا الصَّلَاةَ وَالنَّوَكَارَاتِ  
وَأْمُرُوا بِالْعَدْلِ وَكَهْوُوا عَنِ الْمُنْكَرِ وَرَلَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ  
(الحج ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں با اختیار کردیں تو یہ لوگ نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں نیکی کاموں کا حکم کریں برے کاموں سے روکیں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ  
يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ  
أَضْعَفُ الْاِيْمَانِ - ۱۰

ترجمہ: تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ اپنی قوتِ بازو سے اسے روکے۔  
لیکن اگر اسے اس بات کی طاقت نہ ہو تو نہ زبان سے اسے روکے اور اگر اس کی بھی اس  
میں طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے اس برائی کو بُرا مانے، لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین  
درجہ ہے۔

ان آیات و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے کہ نفاذِ عدلِ اسلامی کے ساتھ ساتھ اُصُر  
یا بُعْدِ عرصہ و دُستِ ہستی عنِ المنکر کا نظام باضابطہ طور پر قائم کیا جائے۔ اس وقت  
صورت یہ ہے کہ ایک طرف سے خیر کا حکم ہو رہا ہے لیکن عین اسی وقت فلمیں، غش و منکرات  
کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے لوگوں کو مار دھار کی تربیت دی جا رہی ہے،  
دی سی آر کے ذریعہ سے بے ہودہ اور گندمی فلمیں دکھا کر عوام کا مذاق بگاڑا جا رہا ہے۔  
اخبارات اور رسائل میں شہوت انگیز تصویریں شائع ہو رہی ہیں، جنسی ناول، جاسوسی  
ناول، بے ہودہ قسم کے ڈائجسٹ اور طرح طرح کے ناپاک رویوں کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ایسی  
صورت میں خیر کی آواز

”فقد غلغله في طوطي كي آواز بن جاتی ہے؟“

لہذا حکومت، دانشور طبقہ، ادبا، شعرا، صحافی، اساتذہ، علما، اور عوام سب  
مل کر معروف کی تبلیغ کریں اور منکرات کو اپنی استطاعت کے بموجب روکیں تو کوئی وجہ نہیں  
کہ معاشرہ اصلاح پذیر نہ ہو جائے۔ اسلام میں اس طریق کو طریقِ تبلیغ کہتے ہیں۔

## ترغیب

تبلیغ کے بعد جو چیز معاشرے کو بدلنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ترغیب  
ہے۔ اسی بنا پر ابتدائے اسلام میں مستحقینِ زکوٰۃ کی فرست میں مولفۃ القلوب کو رکھا گیا  
تھا تاکہ کفار اسلام قبول کرنے کے مادی فوائد بھی دیکھیں اور محسوس کریں۔ لہذا اگر کسی نظام

۱۰۔ مسلم شریف: ۵۰: ۱ : طبع مصر

کو عوام میں مقبول بنانا مقصود ہو تو تبلیغ کے ساتھ ساتھ ترغیبات بھی رکھنی چاہئیں۔ اگر نیکوں نے بھی ہندوستان میں اپنی معاشرت، اپنے طرز فکر اور اپنے نظام تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے ترغیب ہی کا حربہ استعمال کیا تھا اور ان لوگوں کو بڑے بڑے مناصب سے نوازا تھا جنہوں نے ان کے نظریات و افکار کو اپنایا تھا۔ اب اگر کوئی چاہتا ہے کہ اسلامی نظام عوام میں مقبول ہو اور لوگ اسلامی نظام عدل کے مطابق زندگی گزاریں تو ضروری ہے کہ دینی علوم کے حاملین اور اہل اصلاح و تقویٰ کو معاشرے میں پُرمقام حیثیت دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔ سرکاری مناصب پر کسی کو مقرر کرتے وقت ضروری علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ امیدوار دینی علوم سے حسب ضرورت واقفیت رکھتا ہے یا نہیں؟ نیز وہ اسلام کو موجودہ دور میں ایک مکمل بالذات (مکمل، نظام حیات تصور کرتا ہے یا نہیں۔ اس رویت سے انشاء اللہ العزیز خود بخود لوگوں کا رجحان دینی ماحول و معاشرت کی طرف ہو جائے گا۔

## ترہیب

تبلیغ و ترغیب کے بعد تیسرا مرحلہ ترہیب کا آتا ہے یعنی اگر کوئی شخص ایسا دن فطرت اور کمینہ خصلت ہے کہ ابتدائی دونوں عوامل اس کی طبیعت کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوں تو پھر اسلامی حدود و عقوبات کو اس پر جاری کر دیا جائے اور از روئے قرآن:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمْ آفَئَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنَّكُمْ تَعْلَمُونَ بِأَمْرِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور - ۲)

ترجمہ: تم کو ان دونوں پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کسی قسم کا ترس اور رحم نہ آئے اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

حدود کے نفاذ کو دو سال ہونے کو آئے۔ خیال تھا کہ معاشرہ صالح ہو جائے گا اور جرائم کا انداد ہو جائے گا۔ لیکن اسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ حرام کی شرح میں قابل ذکر کمی نہیں آئی اس کی یوں تو اور بہت ساری وجوہات ہیں لیکن ان میں یہ وجہ بھی اہم ہے کہ آج تک ملک میں ایک شخص پر بھی شرعی حد پورے طور پر نافذ نہیں ہوئی۔ ان حالات کو دیکھ کر جرائم پیشہ طبقہ حدود کو مذاق سمجھنے لگا ہے۔ لہذا میرا خیال ہے کہ ابتدائی دور میں غیر ضروری موشگافیوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ حد کا جرم ثابت ہوتے ہی حد نافذ کرنے کا حکم دے دینا چاہیے۔

## تفتیش

ہمارے ملک کے محکمہ پولیس کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، عاقلانہ را  
اشارہ کافی است۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حدود کے مقدمات تفتیش کے ابتدائی مراحل  
ہی میں اس قدر خراب کر دیئے جاتے ہیں کہ حاکم اپنے اس یقین کے باوجود کہ مجرم نے جرم  
کا ارتکاب کیا ہے اس پر حدنا فز نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مقدمات کی تفتیش  
دبا مخصوص حدود و قصاص کے مقدمات کی (کسی دوسرے ادارے کے سپرد کر دی جائے۔  
اس کے لیے بہت سے اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(الف) سارے ملک میں اسلام کا حقیقی نظام احتساب قائم کر دیا جائے اور حدود و قصاص  
کے مقدمات کی تفتیش محکمہ احتساب کے سپرد کر دی جائے۔

(ب) اگر بالفرض پہلی صورت دشوار ہو تو تفتیش کی ساری ذمہ داری سی۔ آئی۔ اے  
پر ڈالی جائے۔

(ج) النسب یہ ہے کہ گورنر انسپکشن ٹیم یا مائی کورٹ انسپکشن ٹیم کی طرز پر ملک  
کے تمام افسروں میں سے بہترین افسروں کو چن کر تفتیشی افسر بنا دیا جائے اور  
انہیں تنخواہوں کا ایسا سکیل دیا جائے کہ رشوت ستانی کا امکان نہ رہے۔ اور اگر  
کسی محتسب یا تفتیشی افسر پر رشوت ستانی کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے سزائے  
موت مع ضبطی اmlak دی جائے۔

## تذریب

اسلامی حدود و قصاص کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جلد از جلد قاضیوں کی  
سرکاری سطح پر تربیت کا انعام کیا جائے۔ اور ضروری قرار دیا جائے کہ قصاص جلد  
قوانین کی ضروری واقفیت کے ساتھ شرعی قوانین کے ماہر ہوں۔ قاضیوں کی تربیت  
کے لیے ہر صوبے میں ایک ادارہ وفاق کے ماتحت قائم کیا جائے۔ تمام اداروں کا نصاب  
ایک ہو اور سب کا امتحان وفاقی ادارہ اپنے اہتمام میں لے۔ قاضیوں کے تقرر کے وقت  
صرف تعلیمی صلاحیت نہ دیکھی جائے بلکہ تقویٰ کا اعلا معیار بھی مد نظر رکھا جائے۔

## تدوین فقہ

قرن اولیٰ میں جب کہ اسلام زیادہ تر عرب کے علاقے تک محدود تھا باضابطہ فقہ کی تدوین کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اسلامی نظام منہایت سیدھا سادہ تھا اور عرب کا ماحول بھی سیدھا سادہ۔ لیکن جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مہری، ایرانی، کلدانی، ترکی، رومی اور جنوبی ایشیا کی اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں تو معاشرہ پہلے کی طرح سیدھا سادہ نہ رہ گیا بلکہ اب نئے نئے مسائل نے سراٹھایا، عقلی موٹگافیاں شروع ہوئیں اور اسلام کا نظام عدل ایرانی اور رومی نظام عدل کے بالمقابل آگیا تو ضرورت پیش آئی کہ اس عہد کے پیچیدہ معاشرے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر باضابطہ طور پر فقہ کی تدوین کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے فقہائے کرام کی قبور کو انوار برکات سے بھر دے کہ انھوں نے نہ تو ہمت ماری اور نہ لکیر کے فیر بنے رہے بلکہ انھوں نے قرآن و سنت پر غور و فکر کر کے ان سے اصولوں کا استخراج کیا اور ان کی بنیاد پر فقہ کا ایک عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا، ایسا سرمایہ کہ جس کی بنیاد پر بنو عباسیہ کی جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا نظام چلتا تھا۔ اور کبھی فقہ اسلامی کے بارے میں تنگی داماں کی شکایت نہیں کی گئی۔

الحمد للہ کہ آج وہ سارا علمی اور تحقیقی سرمایہ اپنی تمام تر جامعیت کے ساتھ محفوظ ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو سمجھنا ہو گا کہ چونکہ چھٹی ساٹویں صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا سلسلہ رک گیا اس لئے ہماری فقہ میں جمود آ گیا۔ زمانہ تو ترقی کرتا رہا لیکن فقہ اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی لہذا ہماری فقہ کا بالخصوص وہ حصہ جو معاملات اور قضا و احکام سے متعلق ہے کسی قدر پیچھے رہ گیا ہے۔ اگرچہ فتاویٰ عالمگیری اور مجلۃ الاحکام العدلیہ جیسے کام ماضی میں ہوئے ہیں تاہم نہ مانہ جس تیزی سے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے یہ کام بھی مکتفی نہیں کہہ سکتے لہذا ضروری ہے کہ ہم اپنی فقہ کے محولہ بالا حصے کا دوبارہ جائزہ لیں اور حالات حاضرہ کی روشنی میں اس کی تدوین جدید کریں۔ فقہ کی تدوین جدید کے وقت اگر مندرجہ ذیل امور کو مانظر رکھا جائے تو کم سے کم غلطی کا امکان ہے :

(الف) اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے :

يُودِعُ اللّٰهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُرْخِئُ بِكُمْ الْعُسْرَ ذٰلِكَ اَتَقَرُّوْا (۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ دشواری نہیں چاہتا۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور نے فرمایا :

يَسِّرْ لِي دَاوْلَةً يَسِّرْ لِي دَاوْلَةً يَسِّرْ لِي دَاوْلَةً

ترجمہ : آسانی پیدا کرنا دشواری نہ پیدا کرنا، خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔

لہذا موجودہ دور میں جب فقہ کی تدوین جدید کی جائے تو سنت کے مطابق احکام کا آسان ترین پہلو اختیار کیا جائے۔ مثلاً گواہ پر فسق کا حکم لگاتے وقت صرف ظاہری شکل و صورت ہی کو معیار نہ بنایا جائے۔ اسی طرح زنا کی شہادت میں کاسمیل فی المکحلہ پر بھی غور کرنا چاہیے اور موجودہ دور میں جو جدید قوانین پیدا ہو چکے ہیں انہیں بھی شرعی حیثیت دینی چاہیے۔

(ب) جدید دور میں جرم کے ثبوت کے لیے بہت سے سائنٹیفک ذرائع پیدا ہو چکے ہیں مثلاً خون کا امتحان، طبی معائنہ، بالوں کا امتحان، ہاتھ کے نقوش، نوٹ، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ جیڑوں سے حاصل ہونے والے ثبوت یا کسی واقعہ کو جانچنے کے لیے جو جدید آلات ایجاد ہو چکے ہیں انہیں بھی قوانین میں شمار کرنا چاہیے۔

(ج) ہمارے فقہائے کرام نے تدوین فقہ کے وقت اپنے دور اور اپنے علاقے کے عرف کو اہمیت دی تھی۔ ہمارے علاقے اور ہمارے دور کا عرف دوسرا ہے اس لیے ضروری ہے کہ فقہ کی تدوین جدید کے وقت ہم متقدمین کی طرح اپنے عرف کو اہمیت دیں۔

(د) ضروری ہے کہ اول ملک کے جدید اور مستند علماء کا ایک بورڈ بنایا جائے جو جدید دور کے مسائل پر غور کر کے قیاس، استحسان، استصحاب، استصلاح اور مصلح مرسد کے دائرہ کار کا آج کل کے حالات کی روشنی میں تعین کرے اور پھر اگر ضرورت محسوس ہو تو تدوین جدید کے وقت ان سے استفادہ کرے۔ اس کے بعد عالم اسلام کے علماء کا ایک بورڈ بھی تشکیل دیا جائے۔ ان بورڈوں میں جدید قوانین کے ماہرین اور علمائے دین دونوں کو جمع کیا جائے۔ جب تک یہ رویہ نہ اختیار کیا جائے گا یقین کیجئے کہ فقہ کی تدوین جدید ممکن نہ ہوگی اور اگر بالفرض تدوین جدید نہ ہو تو ہماری فقہ کا موجودہ سرمایہ ناکافی ثابت ہوگا۔

آزمین علماء اور مفکرین کی خدمت میں آئنا عرض کروں گا کہ آج عالم اسلام بالعموم اور اہل پاکستان بالخصوص ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ آج کی مشقت اور حیران دہنا جو تباہ کن جنگ کے دہانے پر پہنچ چکی ہے، رہبری و رہنمائی کے لیے رحمتہ للعالمین کی امت کی طرف

دیکھ رہی ہے۔ ستاروں کی گزرگاہوں کے ڈھونڈنے والوں کی شبِ تاریک، تاریک سے تاریک  
 تر ہوتی جا رہی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافۃً للذات بشیراً وذنیل  
 تھے، ان کے اسوہٴ حسنہ کے ہم امین ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خیر امت کے لقب  
 سے نوازا ہے، ہم پر صرف اپنی ہی اصلاح کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے آخر جنت  
 للذات کی بھی تصریح ہے، اس لیے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سیادت و قیادت کا فرض  
 اسی امت کو ادا کرنا ہے۔ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کے آغاز میں اسلام  
 کی نشاۃ ثانیہ کے جو آثار نظر آ رہے ہیں ان کے پیچھے غالباً تدبیر الہیہ کار فرما ہے۔ اب اس امت  
 کو آگے بڑھ کر اسلام کو ایک فعال، متحرک اور انقلابی نظامِ حیات کی طرح پیش کرنا ہے۔ آج ہی  
 کے دن صبح صادق کے وقت ہر امت کا آفتاب وادی بطحا سے طلوع ہوا تھا، الحمد للہ کہ ہم آج  
 پاکستان کے اس عظیم شہر سے آوازہ اخلاقی نبوی بلند کر رہے ہیں۔ خدا کرے ہمارے آوازہ عہد  
 روال کے لیے حیات نو کا پیغام اور ہماری یہ صدا کاروانِ ملت اسلامیہ کے لیے صلۃ الریحیل  
 ثابت ہو۔ آمین

ان کے پیش تو گفتم غمِ دل، تر سیدم  
 کہ تو آزدہ شوی، در نہ سخن بسیار است



# محنت کا ضابطہ اخلاق (سیرۃ نبوی کی روشنی میں)

جناب محترم مولانا عبد القدوس قاسمی

الحمد لله رب العالمين والصلاة على رسوله الذي كافته للناس وخاتم النبيين :  
فخمي من سليلين خاتم النبيين حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ  
اور خلق عظیم کا مستند ترین مرقع وہ ہے جو قرآن کریم کے حوالے سے تیار ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ  
عنها فرماتی ہیں ”کان تملقہ القرآن“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کریم تھی، یعنی حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ قرآن کریم کی تعلیمات پر منطبق تھا۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ محنت اور جدوجہد انسان کی فطرت ہے۔ ارشاد باری ہے ”لَقَدْ خَلَقْنَا  
الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ“ (انسان کو ہم نے سخت مشقت کے لیے پیدا کیا ہے) اس آیت کا مقوم یہی ہے کہ  
محنت اور کام انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا کسی نہ کسی جسمانی یا دماغی عمل میں  
مصروف ہی رہے گا۔

عمل اور کام کا ذکر قرآن کریم میں بڑی کثرت سے آیا ہے یعنی لفظ عمل اور اس کے مشتقات ۲۵۹  
مرتبہ اور فعل اور اس کے مشتقات ۱۰۹ مرتبہ ذکر ہوئے ہیں۔ کسب، ابتناء وغیرہ کئی اور ہم معنی الفاظ کا  
استعمال ان کے علاوہ ہے۔ ان آیات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ انسان کوئی نہ کوئی عمل تو لازماً کرتا ہے جس کا  
نتیجہ اس کے سامنے آکر رہے گا۔ اب یہ اس کے انتخاب پر موقوف ہے۔ اگر اس کا عمل اچھا ہو تو نتیجہ  
اچھا رہے گا اور اگر عمل بُرا ہو تو نتیجہ بھی بُرا رہے گا۔ (فمن يعمل مثقال ذرة خیرا يبہد وعن يعمل  
مثقال ذرة شرا يبہد)<sup>(۱)</sup>

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں عمل سے متعلق تین امور نمایاں ہیں؛ اولاً یہ کہ  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سراسر جدوجہد اور سعی و عمل کا نمونہ تھی۔ حضورؐ کے شب و روز کا  
ایک لمحہ بھی فراغت یا غفلت سے نہیں گزرا۔ ثانیاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال حسن انتخاب کا  
مثالی نمونہ تھے، جن میں سعادتِ اخروی کا پہلو غالب تھا۔ ثانیاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں  
دنوی زندگی سے متعلق اعمال کا پہلو بھی کسی حد تک شامل تھا۔ حضورؐ کی زندگی رہبانیت کی زندگی نہ تھی۔

عمل اور محنت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ محنت اور کام ایک قابلِ عزت عمل ہے جسے انبیاء سرانجام دیتے رہے ہیں۔ کھیتی باڑی، شجر کاری، حیاطی، نجاری، آہن گری وغیرہ متعدد پیشوں کی صنعت گری انبیاء کرام ہی کی طرف منسوب ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی کا تذکرہ قرآن کریم نے بھی فرمایا ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت کی زندگی میں دو ایسے مواقع کا تذکرہ آتا ہے جہاں آپ نے اجرت پر کام کیا۔ ایک وہ موقع جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کی بکریاں چرائی تھیں۔ سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی نبی گزرا ہے اُس نے شبائی کا عمل انجام دیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے بھی ایسا کام انجام دیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وانا کنت اراعھا لاهل مکتہ بالقراریط“ (میں بھی مکہ والوں کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتا تھا) حدیث کے ایک راوی نے قراریط کی تشریح یہ کی ہے کہ ایک بکری کی چرائی کی اجرت ایک تیراٹھی۔ بعض اور اصحاب کے خیال میں قراریط کسی چراگاہ کا نام ہے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کا مال لے کر شام کا سفر اختیار کیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بلا کر عرض کی (اور یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ابھی آپ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے نہیں ہوا تھا) کہ مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہو لے کہ آپ قول کے سچے، امانت دار اور با اخلاق ہیں۔ اگر آپ میرا مال تجارت کے لیے لے جانا قبول فرمائیں تو جو حق الخدمت میں دوسرے قریشیوں کو دیتی ہوں آپ کو اُس سے دگنا دوں گی چنانچہ دو اونٹنیاں اجرت ٹھہری۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کا مال لے جا کر نیچے آئے اور نفع دوسروں کی بہ نسبت دگنا ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے دو اونٹیوں کے بجائے چار اونٹنیاں خدمت میں پیش کیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجرت پر کام کرنے والے کے جوہر یہ ہیں کہ سچا اور دیانت دار ہو اور کام کی صلاحیت اس میں موجود ہو اور کام کرنے والے کا یہ فرض ہے کہ عمل کے اختتام پر حق الخدمت پورا پیش کرے۔ اگر ذیقین میں سے کوئی ایک یا دونوں مقررہ شرائط سے زائد کارکردگی دکھائیں تو یہ اُس کا احسان اور تبرع ہو گا۔ فریق ثانی اُس کے معاوضے کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مزدور ہاتھ کام کرے تو کام لینے والے کو بھی چاہیے کہ زیادہ اجرت دے کر اُس کی حوصلہ افزائی فرمائے۔

عہد نبوت میں آپ کی توہمات تمام تر دعوتِ اسلام کی طرف مبذول رہیں۔ معاشی ضرورتوں کا

انتظام غیب سے ہو جاتا تھا۔ اور اس سلسلے میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا ایثار اور تعاون خصوصی طور پر نمایاں تھا۔ ہر حال آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تذکرہ ضرور کیلئے ہے کہ حضورؐ کا بہت سا کام کاج خود اپنے دست مبارک سے انجام دیتے تھے۔ کپڑے خود ہی سی لیتے تھے۔ گھر کی چیزیں خود ہی سنبھال لیتے، گوشت کاٹتے، خادموں کا ہاتھ بٹاتے، اپنے جوتے خود ہی گانٹھ لیتے، قمیض میں یوں لگاتے، بسا اوقات خود ہی اونٹ چرایا لیتے۔ آٹا گوندھ لیتے اور بازار سے سودا سلف خرید کر اٹھالے آتے۔<sup>(۵)</sup> ایسے کام انجام دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک نمونہ عمل مہیا فرمایا ہے۔

اجتماعی مواقع میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ مل کر محنت کے کاموں میں حصہ لیا ہے۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نفسی انیس حصہ لینا اور اینٹیں لانا سیرت کا مشہور واقعہ ہے۔ اسی طرح یہ قصہ بھی اصحابؓ سے نے قلم بند فرمایا ہے کہ ایک سفر میں صحابہؓ نے یہ ارادہ کیا کہ بکری ذبح کر کے کھانے کے لیے تیار کریں۔ کسی نے بکری کو ذبح کرنے، کسی نے اس کی کھال نکلانے اور کسی نے پکانے کی ذمہ داری لے لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں جلائے کی بکری کی کھٹی کروں گا“۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ ہم کام کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: ”اے شک آپ لوگ کافی ہیں مگر میں آپ میں ممتاز ہو کر رہنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے ایسی زندگی پسند نہیں فرماتا کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں ممتاز نظر آئے۔“<sup>(۶)</sup>

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام کی بھی خاصی تعداد تھی اور وہ وقتاً فوقتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نجی کام انجام دیا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت بلالؓ، حضرت ابورافعؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ۔ یہ خدام اجیر یا مزدور نہ تھے بلکہ ایک گھرانے کے افراد کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ بسر کر کے خدمت انجام دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں سے اُجرت پر کام لینے کے مواقع بھی کئی پیش آئے جن کی تفصیلات کتب سیرت میں مہیا نہیں ہیں۔ تاہم صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں یہ ذکر ضرور ہوا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹے گوائے اور جمام ابوہبلیہ کو دو صاع اُجرت میں دیے۔ اس ضمن میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث قابل ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی مزدور کے حق میں کبھی کمی نہیں فرماتے تھے۔<sup>(۷)</sup>

محنت اور عمل سے متعلق کتاب و سنت میں کافی احکام وارد ہوئے اور یہ حیثیت شارع و مقنن یہ احکام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اہم حصہ ہیں۔ ان میں سے چند اہم امور کا تذکرہ اس موقع پر مناسب ہوگا۔

## کسبِ معاش کی فضیلت

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں کسبِ معاش کی ترغیب دی گئی ہے اور وسیلہ معاش کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا گیا ہے:

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَّا نَحْنُكُمْ يَا لَيْلٍ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاءُ كُمْ مِنْ فَضْلِهِ<sup>(۱)</sup>

(اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور

اُس کی دی ہوئی روزی کا تلاش کرنا ہے۔)

۲۔ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ<sup>(۲)</sup>

(اور یہ اُس کی رحمت ہی تو ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنا دیے کہ تم آپس میں

آرام بھی کرو اور اُس کی روزی بھی تلاش کرتے رہو۔)

۳۔ رَبِّكُمُ الَّذِي يُزَيِّرُ فِي كَلِمِ الْفَلَاحِ فِي الْبَحْرِ لِيَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ<sup>(۳)</sup>

(تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ

تم اُس کے فضل کی تلاش کرو۔)

۴۔ كَيْسَ عَمَلِكُمْ جُنَّ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ<sup>(۴)</sup>

(رج کے سفر میں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے

ہاں سے تلاشِ معاش کرو۔)

کسبِ معاش کی فضیلت سے متعلق چند احادیث نبویؐ بھی درج ذیل ہیں۔

۱۔ اِنَّ الطَّيِّبَ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ<sup>(۱)</sup>

(پاکیزہ ترین خوراک یہ ہے کہ انسان خود کما کر کھائے)

۲۔ مَا كَسَبَ الرَّجُلُ كَسْبًا طَيِّبًا مِنْ عَمَلٍ يَدِهِ<sup>(۲)</sup>

(انسان کے لیے کوئی کمائی اُس کے ہاتھ کی کمائی سے

زیادہ پاکیزہ نہیں)

۳۔ مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلٍ يَدِهِ وَانْ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدُ دَكَانَ

يَا اَكَلَ مِنْ عَمَلٍ يَدِهِ<sup>(۳)</sup>

(کوئی شخص اس سے بہتر غذا نہیں کھا سکتا کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اللہ تعالیٰ کے

نبی حضرت داؤدؑ بھی اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے)

۴۔ لَانِ يَحْتَطِبُ احَدُكُمْ حَزْمَةً عَلٰى ظَهْرٍ خَيْرٌ لِّهٖ مِنْ اَنْ يَّسْأَلَ اَحَدًا

فِي عَطِيَّهِ اَوْ يَمْنَعَهُ<sup>(۱۶)</sup>

دیکر تم اپنے دھن کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اٹھا لو۔ اور اسے بیچ کر گزارہ چلاؤ اس سے بہتر ہے کہ کسی سے مانگو چلے ہے وہ تمہیں کچھ دے یا نہ دے

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَرِفَ<sup>(۱۷)</sup>

(اللہ تعالیٰ اُس مومن بندے کو پسند کرتا ہے

جو کسی حُرَف میں لگا ہو)

۶۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ اُس نے عرض کی ”جی ہاں ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حقہ میں بچھا ہوا اور کچھ حقہ اڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک لکڑی کا پیالہ ہے جس میں میں پانی پیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر وہ دونوں چیزیں گھر سے لے آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو درہم میں بیچا اور وہ درہم اُسے دے کر فرمایا کہ ایک درہم کاغذ خرید کر گھر میں ڈال دو اور ایک درہم سے کلمہ لکڑی کا پھل خرید کر میرے پاس لاؤ۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے دست ڈال دیا اور فرمایا کہ جاؤ اپنے دھن بیچنے کی مزدوری کیا کرو اور پندرہ دن کے بعد مجھے اطلاع دو۔ وہ پندرہ دن کے بعد آیا تو دس درہم کچا چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ محنت اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن تمہارا سوال تمہارے چہرے پر داغ ہو۔ سوال صرف تین اشخاص کے لیے جانتے ہیں: وہ فقیر جو اُٹھنے کے قابل بالکل نہ ہو یا ایسا شخص جس پر تادان کا زبردست بوجھ آگڑا ہو۔ یا وہ جس نے دیت کا بوجھ اٹھایا ہو اور وہ اسے تکلیف دے رہا ہو<sup>(۱۸)</sup>

۷۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چند صحابہ تشریف فرما تھے کہ سامنے سے ایک پُٹھریلا شخص گزرا۔ صحابہ فرماتے لگے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس شخص کی قوتیں جہاد کی راہ میں صرف ہوتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے عیال کے نفقہ کے لیے محنت کرنے جا رہا ہو تو بھی اللہ کی راہ میں ہے اور اگر لوٹے ماں باپ کے لیے محنت کا ارادہ ہو تب بھی اللہ کی راہ میں ہے۔ اور اگر سوال کی ذلت سے بچنے کے لیے نکلا ہو تب بھی فی سبیل اللہ ہے۔ ہاں اگر اس کی پُٹھری فخر اور دکھاوے کی ہو تو پُٹھری شیطان کی راہ میں ہے<sup>(۱۹)</sup>

حکومت کے کسی منصب یا ملازمت میں مشغول رہنا بھی ایک عمل ہے جو محنت کے دائرے میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو فرمایا ”میری قوم کو یہ معلوم ہے کہ میرا پیشہ تجارت

میرے گھر والوں کے خرچے کے لیے کافی تھا۔ اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہو گیا ہوں، اس لیے ابوبکر کے گھر والے مسلمانوں کے بیت المال سے کھائیں گے اور ابوبکر اس میں مسلمانوں کے لیے محنت اور حُرمت میں مشغول رہے گا۔<sup>(۲۵)</sup>

## خادموں کے ساتھ سلوک

- ۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ وسلم کے خادم تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال حضورؐ کی خدمت کی کبھی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُف نہ کہا۔ اگر میں نے کبھی کوئی چیز تیار کی یا کوئی کام کیا تو یہ نہ فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور اگر کبھی کوئی کام چھوڑ دیا تو یہ نہ فرمایا کہ کیوں چھوڑا ہے۔<sup>(۲۶)</sup>
- ۲۔ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کا خادم کھانا پکا کر اُس کے پاس لائے تو اُسے اپنے ساتھ کھانے کے لیے بٹھائے اور اگر نہ بٹھائے تو کھانے میں سے اُسے بھی کچھ کھلا دے، کیوں کہ خادم نے اس میں محنت کی ہے۔<sup>(۲۷)</sup>
- ۳۔ حضرت ابوسعید بدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی کہ ”ابوسعید! جتنی دسترس تم کو اس غلام پر حاصل ہے اُس سے زیادہ دسترس اللہ تعالیٰ تم پر رکھتا ہے۔“ مڑ کر دیکھا تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے فوراً کہا کہ ”اب یہ اللہ تعالیٰ کے نام پر آزاد ہے۔“ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر تم ایسا نہ کرتے تو درزخ کی لپٹ تم تک پہنچ جاتی۔“<sup>(۲۸)</sup>
- ۴۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ ایک غلام اُن کے ساتھ ہے اور دونوں یکساں جوڑے پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے اس کی وجہ پوچھی کہ انھوں نے ایک دفعہ ایک بھائی (یعنی غلام) کو ناشائستہ بات کہی تو حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے اور فرمایا:

اِنْ اَتَوْا کُمْ تَحْتَکُمْ فَعَلِمَ اللّٰهُ تَحْتَکُمْ اِذْ یُرِکُمْ فَمَنْ کَانَ اَخُوہُمْ تَحْتَ یدِہ  
فَلِیَطْعَہُ مِمَّا یَا کُلْ وَلِیَلْبِسَہُ مِمَّا یَلْبِسُ وَلَا تَکْلِفُوہُمْ مَا یَغْلِبُہُمْ فَاِنْ  
کَلَفْتُمْوہُمْ مَا یَغْلِبُہُمْ فَاَعِیْنُوہُمْ

(یہ تمہارے بھائی، تمہارے خدام اللہ تعالیٰ نے تمہارے اختیار میں دیے ہیں۔  
تو جب کسی کا بھائی اُس کے اختیار یعنی ماتحتی میں آئے تو جو خود کھائے اُس میں  
سے اُسے بھی کھلائے اور جو خود پہنے اُس میں سے اُسے بھی پہنائے۔ ان پر ایسا  
بوجھ نہ ڈالو جو اُن کے بس کا نہ ہو، اور اگر کوئی کام اُن کی طاقت سے زیادہ اُن کے  
زمتے لگا دیا تو پھر اُن کی مدد کیا کرو۔)<sup>(۲۹)</sup>

## نو کروں کے ذمہ مالکوں کے حقوق

نہد مت اور عمل کام لینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان معاہدہ ہے جو باہمی رضامندی سے طے ہوگا۔ اس معاہدے میں مزدور کی ذمہ داری واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔ تعین یا زمانے کے لحاظ سے ہو یا عمل کے ذریعہ سے۔ وقت کے لحاظ سے عمل کی تعین کی مثال یہ ہے کہ حضرت شعیب (شیخ مدین) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بات متعین کی تھی کہ آٹھ سال یا دس سال اُن کے ہاں خدمت میں گزار دیں گے۔ اسی طرح آج کل کی ملازمت اور مزدوری بھی ہے جو دنوں اور گھنٹوں کے ذریعہ سے متعین ہوتی ہے۔

کام کے ذریعہ سے تعین کی مثال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے تو ایک ماہر رفیق کے یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ عام شاہراہ سے بچا بچا کر انھیں مدینہ منورہ تک پہنچائے (۲۵)

بہر حال مزدوری کے وقت یا نوعیت کی تعین کے بعد نوکر اور مزدور کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کام کو سرانجام دے، اس بارے میں اپنی پوری صلاحیت صرف کر دے اور ایمان داری اور خیر خواہی کے تقاضے اچھی طرح پورے کرے۔ یہ اصول ایک تو سورۃ یوسفؑ اور سورۃ القصصؑ کی آیات سے متعین ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:

تھیر الکسب کسب العامل اذا فہم (۲۶)

(دہتر بن کمائی مزدور کی کمائی ہے جب وہ خیر خواہی سے کام کرے)

کام کرنے والے کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جو کام کرے اُس میں پختگی اور آتھان کا خیال رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملاً ان یتقنہ (۲۷)

(اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کوئی کام کرے تو اُسے محکم کرے)

حضرت سیرینؒ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب زادہ حضرت ابراہیمؑ کی قبر میں شگاف دیکھا تو کسی سے کہا کہ اسے بند کر دو۔ کسی صاحب نے پوچھا کہ کیا اس شگاف کے بند کرنے سے میت کو کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو نہ تو فائدہ ہوگا اور نہ نقصان

لیکن (یہ شگاف) زندہ لوگوں کی نظروں کو برا لگتا ہے۔<sup>(۳۱)</sup>

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو خادموں کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ:

العبد راعی مال سیدہ وهو مسئول عنه<sup>(۳۲)</sup>

(غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے۔ اور اس سے اس کے

بارے میں سوال ہوگا۔

## کام کرنے والوں کے حقوق

عامل اور مزدور از روئے معاہدہ جس حق الخدمت کا مستحق ہے عمل انجام دینے پر اُسے فوراً ادا کیا جائے۔ معاملے کے ایک فریق کے طور پر وہ اس امر کا مجاز نہیں کہ کام کی تکمیل یا وقت کے گزرنے سے پہلے حق الخدمت کا مطالبہ کرے یا مقررہ معاوضے سے زیادہ کا مطالبہ کرے۔

اس بارے میں ہر عامل اور مزدور کا معاملہ اپنے معاہدے کے لحاظ سے طے ہوگا۔ کسی دوسرے کا معاہدہ اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجارت کے لیے مال حوالے کیا تھا تو آپ کے ساتھ جو شرط معاہدہ طے ہوئی تھی وہ دوسروں سے جدا اور ممتاز تھی۔

اجرت کا معاہدہ طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزدور کو کام سے پہلے اجرت کی مقدار بتادی جائے تاکہ بعد میں نزاع پیدا ہونے کا احتمال باقی نہ رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من استاجر اجیر اقلی علمہ اجرو<sup>(۳۳)</sup>

رکسی کو کسی مزدور کو کام پر لگانا ہو تو اُسے اُس

کی مزدوری پہلے سے بتا دے)

اور جب کام کرنے والا کام کو مکمل کرے تو پھر اُس کے حق الخدمت میں دیر کرنا ناجائز نہیں۔

حضورؐ کا ارشاد ہے:

اعطوا الاجیر اجورہ قبل ان یجف رشحہ<sup>(۳۴)</sup>

(مزدور کو اُس کی مزدوری اُس کے پسینہ خشک ہونے سے

پہلے ہی پہلے دیا کرو)

ایک حدیث قدسی کا مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین اشخاص کے خلاف میں خود مدعی

ہوں گا: ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی مزدور کو کام پر لگا کر اُس سے کام پورا لے اور مزدور کا

حق پورا نہ دے<sup>(۳۵)</sup>



## عامل اور مزدور کے ساتھ احسان

شرائط معاہدہ سے زائد حسن سلوک تبرع اور احسان ہوگا۔ اس کی ایک مثال حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ پچھلے لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا کہ اُس نے ایک مزدور سے مزدوری طے کی تھی اور جب مزدور کام کر چکا تو اُس نے واجب مزدوری اُس کو پیش کی مگر مزدور اس پر راضی نہ تھا بلکہ اور زائد کا مطالبہ کرنے لگا جس سے مالک نے انکار کیا۔ اور مزدور حق الخدمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اس حق الخدمت کو مالک نے اُس مزدور کی طرف سے بکری پالنے میں لگایا۔ چند سالوں میں اس سے بڑا ریوڑ بنا۔ اتفاقاً وہ مزدور دوبارہ آیا اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگا۔ مالک نے پورا ریوڑ اُس کے حوالے کیا، جس کو دیکھ کر مزدور بہت حیران رہ گیا۔ اُس کی اس نیکی کا صلہ اُسے دنیا میں یہ ملا کہ ایک دفعہ دو دوستوں کے ساتھ غار میں گھر گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی نیکی کے طفیل دُعا مانگی۔ اُس نے بھی اپنی اس نیکی کے صدقے خلاصی کی دعا مانگی۔ اور اُس کی دُعا قبول ہو گئی۔<sup>(۳۵)</sup>

اس مثال سے یہ سبق ملتا ہے کہ مزدور کو نفع بخش کاموں میں شریک کرنا چاہیے۔

## محنت اور کسب کے جائز ذرائع

وسیلہ معاش کی تلاش انسان کے ذمے فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں کچھ یا بندیاں بھی لگائی ہیں اور جن مکاسب سے معاشرے کو الفحشاء یا اجتماعی نقصان پہنچتا ہے وہ ناجائز ٹھہرائے گئے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سازی اور گانے بجانے کے پیشے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بچوں سے مزدوری کا کام لینا اور ہنرمند عورتوں کے سوا دوسری عورتوں سے محنت مزدوری کا کام لینا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے حوالے سے ناپسندیدہ بتایا گیا ہے۔

## حوالے

(۱) سورة البقرة ۴۔ (۲) سورة الزلزلة آیات ۸، ۷۔ (۳) البخاری: الجامع الصحیح کتاب

الاجارات ۱: ۱۰۳۔ (۴) اسیرۃ الخلیفہ ۱: ۳۵۔ (۵) النہائی وسائل الوصول الی شمائل الرسول ص ۱۳

النعمی و نہایۃ العرب ۱۸: ۲۹۳۔ (۶) زرقانی شرح مواہب ۴: ۲۴۵، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد

ذکر اخصا ص ۲۸۔ (۷) برائے قمرست خدام رجوع کیجیے نہایۃ العرب ۱۸: ۲۲۹۔ ۲۳۷ و

زاد المعاد ۱: ۱۹۔ (۸) البخاری الجامع الصحیح کتاب الاجارات ۱: ۳۴، زاد المعاد ۳: ۸۰۔

(۹) سورة الروم آية ۲۳ - (۱۰) سورة القصص آية ۳ - (۱۱) سورة الاسراء آية ۶۶ - (۱۲) سورة البقرة آية ۱۹۸ - (۱۳) ابن ماجہ کتاب التجارات، والنسائی، السنن - کتاب البيوع ۲: ۲۱۰ - (۱۴) ابن ماجہ عن مقدم بن معد كريب، حوالہ كنز العمال ۴: ۴ - (۱۵) البخاری: الجامع، كتاب البيوع ۱: ۲۷۸ - (۱۶) البخاری الجامع: كتاب البيوع، حوالہ كنز شتہ وكتاب المساقاة ۱: ۳۱۹ - (۱۷) طبرانی عن ابن عمر، حوالہ كنز العمال ۴: ۱۸ (۱۸) سنن ابن داود، شرح بذل المجود ۳: ۴۲ - (۱۹) طبرانی، حوالہ اشترأ كية الاسلام، مصطفى السباعي وكنز العمال ۴: ۲ - (۲۰) البخاری: الجامع، كتاب البيوع ۱: ۲۷۸ - (۲۱) البخاری: الجامع، كتاب الادب ۲: ۸۹۲ (۲۲) ايضا كتاب الحق ۱: ۳۴۶ - (۲۳) مسلم: الصحيح ۲: ۵۱ - (۲۴) البخاری: الجامع ۱: ۲۴۶ و مسلم الصحيح ۲: ۵۲ - (۲۵) البخاری: الجامع، كتاب الاجارات ۱: ۳۰۱ - (۲۶) سورة يوسف آية ۵۵ - (۲۷) سورة القصص آية ۲۶ - (۲۸) مجمع الزوائد ۴: ۹۸ - (۲۹) حوالہ كنز شتہ - (۳۰) طبقات ابن سعد، جزو ۱ ص ۹۲ - (۳۱) الجامع الصحيح، كتاب العتق ۱: ۳۴۷ - (۳۲) النسائی: سنن ۲: ۱۵۰ و محمد بن الحسن في كتاب الآثار عن أبي سعيد الخدري مرفوعاً - (۳۳) مجمع الزوائد ۴: ۹۷ - (۳۴) البيهقي، السنن ۴: ۱۲۱ (۳۵) الجامع الصحيح، كتاب الاجارات ۱: ۳۰۳، ۳۰۴ - (۳۶) محمد مبارک: نظام الاسلام، الاقتصاد و

# اسلامی تعلیمات اور تربیتِ اساتذہ

جناب محترم پروفیسر اسماعیل سیٹھی

پیشتر اس کے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت و تعلیم کے مقاصد پر گفتگو کی جائے یہ طے کرنا ہو گا کہ از روئے اسلام انسان کی تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے ؟ کائنات ہستی میں اس کا مقام کیا ہے ؟ اس کے فرائض اور ذمے داریاں کیا ہیں ؟ قرآن حمید کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کس نوع کی تعلیم تجویز کرتا ہے ؟

بدیہی اور بہت واضح بات ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے پورے کرہ خاکی اور اس میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات پر انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسا محور ہے جس کے گرد پورا عالم آب و گل گھوم رہا ہے۔ کتاب اللہ الحمید نے تو لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کہہ کر انسان کو بہ حد و حساب اور بہ نہایت شرف و مجد کا سزاوارہ ٹھہرا دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے انسان ناسبِ حق ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ:

نائبِ حق در بہای بودن خوش است

حضرت مرعلی شاہ کا ارشاد ہے:

مجددِ آسماء را تو بہت آمدی نذاں خلیفہ و منظر ذات آمدی

علمِ الآسماء طرائفِ حجابی تست اسجد و الآدم ہم اندر شان تست

حضرت مولانا روم بھی فرمایا ہے ہیں کہ انسان عالمِ ہست و بود کا مرکز ہے، وہ مسجودِ دلائل ہے اور اس دُنیا کی ہر چیز اس کی اطاعت و متابعت کے لیے ہے۔

قرآنِ عظیم کی تفسیرات کے مطابق خدا تعالیٰ ایک قائم بالذات، ایک ذی حیات ابدی اور مطلقاً آزاد تخلیقی فعلیت ہے جو واحد، قادر مطلق، حسنِ مکمل، مہربانِ کامل، عادل اور خیرِ تمام ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رُوح چھوٹی ہے۔ اس لیے خدا کی صفات اس کے لیے ایک نصب العین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا وحدت، ابدیت، صداقت، حسن، خیر، محبت، عدل، قوت اور آزادی انسان کے لیے بنیادی اقدار ہیں:

جن کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے سعی کرنا اس کی اپنی ذات اور اس کے ماحول کے دوسرے افراد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

ان توضیحات کے پیش نظر اسلام وہ انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو علم حاصل کر کے مفاتیحِ اشیا سے واقف ہو۔ اور وہ انسان جو برتر مقاصد کے لئے زندہ رہے۔ اور چند روزہ دنیا میں اس کی زندگی کا مقصد صرف رب العزت کی خوشنودی کا حصول اور اس کی رضا طلبی ہو جو خواہشاتِ نفسانی پر قابو رکھے، حبِ خداوندی اور یادِ الہی میں سرشار رہے، احکامِ خداوندی کی پابندی میں جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔ بنی نوع انسان کی خدمت اور تکمیلِ آدمیت اس کا شعار ہو۔ فطرت کی قوتوں کا مسخر کرنے والا ہو کہ اُن سے انسانیت کی فوز و فلاح کا کام لیا جاسکے۔ ایک ایسا انسان جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا کہ:

یا تقویٰ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ناقص

غالب و کارِ آفرین کارِ کشتِ کارِ سامانہ

خاکِ ولوری نہاد بندہ مولا صفات

ہر دو جہان سے غنی اس کا دل بے نیاز

مقصد گفتگو یہ ہے کہ اسلام انسان سے صداقت، حسن، خیر یا بالفاظِ دیگر شَخْلَقُوا بِأَخْلَاقِ اللہ کا طلب گار ہے۔ اسلام اسے دوسری دنیا کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس کی یہ دنیا بھی سنوری رہے۔ گویا اسلام ایسے انسان چاہتا ہے جو عبادت اور کاملیت کے جیتے جاگتے نمونے ہوں۔

اسلام نے اپنے انسانِ مطلوب کے لئے تعلیم کا بو ڈھا نیچہ تیار کیا ہے اُس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص مزاج اور ایک خاص سیرت و کردار کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک مساجد و مکاتب سیرت سازی کی فیکٹریاں ہیں جہاں سے خاص قسم کے انسان ڈھل کے نکلتے ہیں۔ اسلام کا نظامِ تعلیم اسی ایک نکتے پر استوار ہے۔ اسلام جس قسم کا معاشرہ اور جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اُن کی تعلیم کے مقاصد کا تعین بھی اُس نے خود ہی کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اسلام کے نزدیک بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ تو انسان کو فطرت سے نور کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔ یُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۝ کا مفہوم یہی ہے۔

## استاد کا مقام

اسلام کے تعلیمی نظریات میں استاد کو اولین حیثیت دی گئی ہے۔ خدائے رب العزت نے اپنے آپ کو بھی معلم کہہ کے پکارا ہے کہ: ”خدا نے ان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا اَيُّہُ کہ میرے خدا کی اس صفت کی علامت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَ اَنَّا نُنزِّلُ الْفُرْقَانَ مِّنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ اے محمد یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پار ہے ہو۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ معلم کامل تھے خود کو بہ حیثیت معلم بھی پیش کیا ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۝ اور پھر فرمایا فَتَنَّا بِلِّیِّ کُلِّ نَفْسٍ فَعَرَفَتْ۔

اسے بھی حضور کا معلمانہ معجزہ جانئے کہ ان کے زیر تربیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صورت میں ایک ایسی جماعت تیار ہو کر نکلی کہ بلا شائبہ ریب چشم فلک نے انسانوں کا ایک ایسا پاک نفس اور قدسی صفات گروہ آج تک نہیں دیکھا۔ حضور کے فیضانِ سرمدی نے ہوش گردن تیار کئے اُس کے ثمرات زندگی کے ہر میدان میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شبلی نے اسی لئے کہا تھا:

اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجاز کی کیسوم بن گئی دہریں جا کر چین آرائے بہار

یہ اُسی کا تھا کہ شمشد کہ عرب کے بچے کھیلنے جاتے تھے ایوان کہ کسریٰ میں شکار

یہ اُسی کا تھا نتیجہ کہ عرب کے رہزن ناش کرنے لگے جبریل امیں کے اسرار

استاد کا مقام صرف علم کی ترسیل نہیں بلکہ قرآن حمید نے یُذِکِّرُکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَعْلَمُو

الْکِتَابِ وَ اِنَّکُمْ لَمَعْلَمُو کہہ کہ اس کے مقدس ترین اور اہم ترین فریضے کی نشان دہی بھی کر دی ہے کہ استاد کا کام تربیت و تادیب بھی ہے جس کے بغیر تعلیم ایک میکا کی عمل رہ جاتا ہے۔ حضور

کے اسوہ حسنہ میں تعلیم و تدریس پر بہت زور ملتا ہے۔ ایک حدیث کی رو سے، ایک ایسا عالم

جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور یہ علم دوسروں تک پہنچاتا ہے قابلِ رشک مقام رکھتا ہے۔ اس معاملے

میں حضور کی حکمت بالغہ کی معراج دیکھئے کہ آپ نے بعض قیدیوں کے لئے ذرفہ کے طور

پر ٹھہرا دیا کہ وہ ماخواندہ لوگوں کو پڑھنا سکھائیں۔ حضور نے دعوتِ حق کا کام بغرض

ہو کر سرانجام دیا۔ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا۔ حرفِ خدا کی مخلوق کی بہبود و پیش نظر تھی۔ قرآن کریم

میں یوں ذکر ہوا۔ قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِمْ اَجْرًا اِنَّہٗوَ الْاِذْکُرٰی بِالْعٰلَمِیْنَ ۝

اسے نبیؐ کہہ دو کہ میں اس تبلیغ اور ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں یہ تو ایک عام نعمت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔

## نصاب

تعلیمی فلسفے میں سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ مجوزہ نظام سے کس قسم کا ذہن پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ملک و قوم کے حکماء نے اپنے عقاید اور اسواہ کو سلنے رکھ کر تعلیمی نصاب مدوّن کیے اسلام میں چونکہ دین و دنیا کی تعریفیں نہیں ہیں ایمان کی دُعا ہے جو ارشادِ الہی سے ثابت ہے: **وَرَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً**، لہذا مفکرین اسلام نے ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کی کوشش کی جس کی تحفیں کے بعد انسان دین و دُنیا دونوں کی نعمتوں سے مستمتع ہو سکے۔ اُس کی یہ دُنیا بھی سنورے اور عاقبت بھی۔ اپنے اپنے طور پر مختلف ممالک میں مفکرین امت نے قرآن و سنت کی روشنی میں تعلیم کا مقصد و منہاج طے کر کے تدوین کی کوشش کی۔ یہ پہلو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مسلم ماہرین میں غزالیؒ نے وجدان اور تعقل دونوں کو علم کا موضوع یا ذریعہ قرار دیا اور یہ کہا کہ علم کی غایت علم اعلیٰ یا وجدانی علم کا حصول ہے۔ اُن کے نزدیک فضائلِ الہی علم کا سب سے بڑا ثمر ہے۔ باقی علوم ان کے نزدیک کسب و کتاب ہیں۔ تبرہ صغیر ہندو پاکستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دین و دُنیا دونوں کو زندگی کی کلیت کے لئے لازمی قرار دیا۔ بغداد میں مسلمانوں کی تعلیم کا جو سب سے بڑا دبستان قائم ہوا اُس کی خصوصیت وہی زندگی کی ہمہ گیری دین و دنیا کی وحدت اور مادہ اور روح کا اشتراک تھی۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ اور حضرت امام غزالیؒ کی تلقینات سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ آج ہمارا نظام تعلیم جس ابتری، پریشان حالی اور شکوک و شبہات کا شکار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نصاب مادہ و روح کے اشتراک اور دین و دنیا کی وحدت سے محروم ہے۔ امام غزالیؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ محمودہ اور مذمومہ۔ دوسری قسم کا علم عقاید میں اشتیاء پیدا کرتا ہے اور انسان سے عقیدے کی قوت اور زندگی کی حرارت چھین لیتا ہے۔ لیکن ایسا تو نہیں کہ ہمارا علم محمودہ کی بجائے مذمومہ کے حصار میں ہے۔ اس غلط فہمی کا اندازہ مزوری ہے کہ تعلیم جو بھی ہو مفید ہے۔ اسلام نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ **اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ**۔ اے خدا مجھے بے نفع علم سے بچانا۔ گویا صحیح علم وہ ہے جو علم نافع ہو۔ ہمارے آج کے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نصابات کو بے ہمتی

اور غیر نافعیت سے بچائیں۔

قرآن نے سُنَرِ حِیْمَہَ آیَاتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ فَرَکَہَ مَطَالَعِہُ فُطْرَتِہُ پُرلِزِزہ دیا۔ ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ مطالعہ انسانی زندگی میں خیر پیدا کرنے کے لئے استعمال ہونا چاہیے۔ نصاب میں پسند و موغلت کے ساتھ ساتھ انکار اور بد عملی کے نتائج بھی واضح کئے جائیں۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ اَلَمْ نَصْرَہُ کِتَابَ الْاِنْزِلِ اِلَیْکَ فَلَا یُکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْہُ لِتُنْذِرَہُ وَذَکُرْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

## طریق تدریس

آج کے غلط تعلیمی نظریات نے استاد کو معلم کے مقام سے گرا کر اسے ایک اہل کارہ کی حیثیت دے دی ہے۔ وہ آج ایک ادارہ، ایک انجمن، ایک ستارہ نور نہیں محکمہ تعلیم کا ایک تنخواہ دار ملازم ہے جو باقی ملازمین سرکار کی نسبت کسی فوقیت کا حامل نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استاد کا طرز تدریس ایک مشینی عمل ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے نتائج سے قوم اچھی طرح آگاہ ہے۔ نہ اسے اپنے مشن سے محبت ہے اور نہ اُن مقاصد سے لگاؤ جن کے پیش نظر یہ فریضہ اُس کے سپرد کیا گیا ہے۔

استاذ کے لئے مسجد نبوی کے معلم کامل کی سیات مقدسہ میں بھیرت کے بے شمار پہلو ہیں جن کو سامنے رکھ کر استاد کی تربیت کی جاسکتی ہے اور جن پہلوؤں کو اپنا کردہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکتا ہے۔

حضور کے طرزِ تعلیم میں نمایاں ترین عنصر شفقت و محبت کا ہے۔ حضور سرِ پا رحمت عالم تھے۔ اُن کی محبت و رافت نے عرب کے گنوار اور ہندی بدوؤں کی دنیا بدل کے رکھ دی۔ آپ کی تعلیم کی اثر انگیزی میں نمایاں پہلو آپ کی شفقت کا ہے۔ اُمّ مَعْدِنَہ حضور کا علیہ مبارک یوں بیان کیا۔ "تو تو معلوم ہوتا کہ اُس کی آواز گرجے دو پیش پر چھا گئی ہے، گفتگو ایسی تھی جیسے زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ دار نکلتی چلی آ رہی ہو۔ کلام شیریں اور واضح تھا۔ نہ کم گو تھا نہ زیادہ باتیں کرنے والا۔ دُور سے سنیہ تو اس کی آواز سب سے زیادہ بلند مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی اور قریب سے سنیہ تو بہت شیریں اور لطیف معلوم ہوتی۔" ارشاد باری تھا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تَخَافَتْ رِجَالًا وَابْتَغِ بَیْنَ ذَٰلِکَ سَبِيلًا ۝ اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ پست آواز سے اور میانوں اور وسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔ اور اسی پر حضور عمل پیرا تھے۔

حضور کا طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہر ہدایت کو تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

گفتگو نہایت شیریں اور دل آویز ہوتی تھی۔ باتیں آہستہ اور سادہ الفاظ میں فرماتے تھے جس سے مخاطب کا انشراح صدر ہو جاتا تھا۔ قرآن پاک میں یوں ذکر ہوا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ ظَعْنًا غَلِيظًا لَّقَلْبُكَ لَا الْفَضْوَا  
مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)

یعنی نبی اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو۔ ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ ہمارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح اور تفہیم مطالب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ بیک وقت قرآن پاک کی دس آیتوں سے زیادہ نہیں بیان کیں۔ قرآن حمید نے جو مختلف مقامات پر بعض واقعات کو مختلف پیرایوں اور سالیب میں دہرایا ہے اس سے بھی مراد یہ ہے کہ بات دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ قرآن کی حکایات و تمثیلات بھی اس باب میں رہنمائی کرتی ہیں۔ کہ بات کو دل و دماغ میں کیسے بٹھایا جائے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ہ ملائکہ روم نے کیسے دلکش الفاظ میں قرآن پاک کی تلاوت کے فوائد بیان کیے ہیں :

پہلوں تو در قرآن حق بگرمینتی باروان انبیاء آمینتی  
ہست قرآن حاملئے انبیاء ما بیان بحر پاک بکریا  
ور بخوانی نہ قرآن پذیر انبیاء و اولیا را دیدہ گیر  
ور پذیرائی پو بر خوانی قصص مرغ جانت تنگ آید در قصص  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تدریس، تدریج اور عمل کا تھا۔ چنانچہ جب حضور نے معاذ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو آپ نے فرمایا :

تم اس قوم کے پاس جاتے ہو جو اہل کتاب ہیں اس لیے سب سے پہلی چیز جس کی طرف تم بلاؤ وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو ایک سمجھیں۔ جب وہ لوگ اس کو مان لیں تو ان کو بتلاؤ کہ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ لوگ نماز پڑھنے لگیں تو اسٹھیں بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں نہ کوۃ فرض کی ہے۔ ہو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دی جائے گی۔ جب وہ لوگ اس کا اقرار کر لیں تو ان سے نہ کوۃ لے لو اور لوگوں کے عمدہ مالوں سے پرہیز کرو۔



## طریق تدریس

حضورؐ کے طریق تدریس میں سوال و جواب کا طریقہ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ حضورؐ نے صحابہ سے پوچھا۔ یہ کون سا دن ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ صحابہؓ نے جواباً عرض کیا کہ آج قربانی کا دن ہے۔

حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا یہ مہینہ ذوالحجہ کا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مالی آپس میں تمہارے لیے ایسے ہی حرام ہیں جیسے اس دن میں، تمہارے اس مہینے میں، تمہارے اس شہر میں حرام ہیں۔

اور تعلیم کو عوام تک پہنچانے کے لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

لِيُبَيِّعَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

علم حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے مشاہدہ، غور و فکر، عقل، تجربہ، ایمان، کشف و الہام روئے ہمارے ہاتھ اور یقین کے ذرائع بیان فرمائے ہیں۔

مشاہدہ، کائنات اور تحقیق و جستجو کے لیے بہت سے مقامات پر ترغیب دی گئی ہے۔ ایک مقام پر سوال اٹھا کر کہا جاتا ہے۔ کیا پرندوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ پر پھیلائے اُڑتے پھرتے ہیں۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوَقَّعَهُمْ -

کسی جگہ پھولوں کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے: اَنْظُرُوا اِلَى ثَمَرِهِ اِذَا اَشْبَسَ -

پھر ارشاد ہوا۔ قُلِ الْاَنْطٰى وَاَمَّا ذٰلِیْ السَّمٰوٰتِ وَاَلْاَرْضِ - آپؐ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو اور دیکھو۔ کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں۔ کہیں آغا ز تخلیق کے متعلق سوال کیا گیا۔ اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِیْ اللّٰهُ الْخَلْقَ - کہیں تدریجی عمل تخلیق کا ذکر ہوتا ہے۔ اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ہ

حضورؐ نے بھی اسلام کی دعوت دیتے وقت اسی تدریج کے قانون کو ہمیشہ نظر رکھا۔ نبوت کے پہلے تین سال تک خفیہ طریقے سے اسلام کی تعلیمات افراد کو پہنچاتے رہے۔ اڑھائی سال کے بعد حضورؐ نے دار ارقم میں مرکز قائم فرمایا۔ اس کے بعد سب ارشاد باری: وَاَنْزِلْ رَحْمَتُنَا عَلَیْکَ الْاَقْرَبِیْنَ ہ حضورؐ نے اپنے خاندان والوں کو اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس موقع پر حضورؐ نے ایک ایک کو اس کے نام سے

مخاطب فرمایا: ”یا بنی عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیہ“

اس کے بعد حضورؐ نے ایک دن صبح سویرے پہاڑی پہ چڑھ کر یا صبا سنا کہہ کر ایک ایک غاندان والوں کو پکارا۔ حضورؐ کا خطبہ بہت جامع اور مختصر ہوتا تھا۔ تبوک کے مقام پر آپؐ نے یوں ارشاد فرمایا:

فَإِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ - صدق و راستی میں سب سے بڑھا ہوا مجموعہ کلام اللہ کی کتاب ہے۔

وَأَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذِهِ الْقُرْآنُ۔

تمام بیانات سے پاکیزہ ترین اور خوب ترین بیان قرآن مجید ہے۔

وَحَيْرُ الْأَعْمَالِ مَا تَفْعَلُ - بہترین اعمال وہ ہیں جن سے انسان کو دینی، اخلاقی اور دنیوی فائدہ ملے۔

آنحضرتؐ نے ہر تہل قبیلہ و قوم کے نام ہود دعوت نامہ بھیجا اس کے الفاظ بھی سادہ، جامع اور مختصر ہیں:

إِنِّي أَدْعُوكُمْ بِرَبِّ عَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْتُ تَسْلِمًا۔

حضرات! آخر میں آنا عرض کروں کہ ہمارے جملہ مسائل اور مشکلات کا حل صرف اور صرف عشق

رسولؐ میں مضمر ہے۔ ہزاروں تعلیمی پالیسیاں بنائیے۔ اگر ان میں عشق رسولؐ کی جھلک نہیں تو یقیناً نیچے

قطعاً بے مصرف و بے فائدہ ہیں۔ جب تک ہمارا نظام تعلیم حب رسولؐ کے گرد نہیں گھومتے گا وہ نتائج

ہرگز ہرگز برآمد نہیں ہوں گے جن کے لئے قوم چشم براہ ہے۔ سہ

میںدار سعدی کہ راہ صفا تو ان رفت جز در پئے مصطفیٰ!

# نظام تعلیم و تربیت - اخلاق نبوی کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر معصوم علی ترمذی

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سرچشمہٴ رشد و ہدایت ہے۔ اس ذاتِ گرامی سے نور کی وہ کرنیں چھوٹی ہیں جن کی چمک دمک سے ساری دنیا میں اچالا ہو گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا رحمت بھی تھے اور ہدایت بھی۔ تعلیم و تعلم، صلاح و فلاح، ہدایت و استقامت کے جو دل نشین انداز آپ کی ذاتِ والا صفات سے بروئے کار آئے انھوں نے عرب کے بادیہ نشینوں کو مملکتوں کا سلطان بنا دیا۔ آج یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ اخلاقِ نبویؐ کی روشنی میں نظامِ تعلیم و تربیت کا جائزہ لوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کہاں اخلاقِ نبویؐ کا بھرپور استعمال اور کہاں میری ناچیز فہم و دانش۔ بہر حال کوشش کر سکتا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ناچیز ہونے کے باوجود نسبتِ اسی ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں چند ضروری نکتوں کی وضاحت کر دی جائے۔

کسی فرد یا جماعت کی فوز و فلاح کا انحصار اس کے حسنِ عمل اور خوبی کر دار پر ہے، اور حسنِ عمل یا خوبی کر دار موقوف ہے صحیح اور صالح تعلیم و تربیت پر۔ تعلیم و تربیت اگر صحیح ہے تو ایسی نسل پروان چڑھے گی جس کے کردار کی استقامت سے نکرانے والی ہر باطل قوت پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ بقول شاعر:

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

اور جب دل کی دنیا بدل جائے تو پھر خارجی دنیا بدلتے دیر نہیں لگتی۔ گویا قوموں کی سمیات اور ان کی ساری صلاح و فلاح کا مدار صحیح تعلیم و تربیت پر ہے۔

تعلیم و تربیت کی اسی اہمیت کے پیش نظر خالقِ کائنات نے تعلیم و تربیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فریضہٴ نبوت قرار دیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا جو ان میں رسول بھیجا انہی میں کا ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور

کام کی باتیں اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔“ (آل عمران)

اس آیت کہ ہم میں بیان کردہ چاروں باتوں (تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتب اور تعلیم حکمت) کا تعلق تعلیم و تربیت ہی کے اساسی پہلوؤں سے ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ عناصر و اجزاء ہیں جن سے اسلامی نظام تعلیم یا نئی گمراہی کا اختیار کردہ نظام تعلیم و تربیت تشکیل پاتا ہے۔ گویا اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

۱۔ نئی نسل کو ان کے خالق و مالک کے احکامات بعینہ ان الفاظ میں پہنچائے جائیں جن میں وہ نازل ہوئے ہیں۔

۲۔ قرآن پاک کا وہ مفہوم و مطلب جو اللہ کے رسولؐ نے وحی الہی کے تحت بتایا اُسے ذہن نشین کرایا جائے۔

۳۔ نئی پود کو صحت و سنت یعنی زندگی گزارنے کے نبوی اسلوب سے آگاہ کیا جائے جو زندگی کے چھوٹے بڑے تمام شعبوں پر حاوی ہو۔

۴۔ قرآن و سنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اخلاقی اصلاح، اس کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھانے اور انکار و خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لیے علمی اور روحانی تربیت سمیٹی کی جائے، نیز جو کچھ بھی وہ سیکھیں تربیت یافتہ افراد کی گمراہی میں اس پر عمل بھی کریں، تاکہ ان کی تعلیم صرف اعتقاد و نظریات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ عملی صورت اختیار کر کے ان کی زندگی میں مثبت اور مفید تبدیلیاں پیدا کریں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مدبرانہ، حکیمانہ، مریبانہ اور مشفقانہ اسلوب اختیار فرمایا، جو بلاشبہ معلمین کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ معلم اعظم ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی قدر و قیمت بیان فرمائی تاکہ لوگوں میں تحصیل علم کی لگن پیدا ہو۔ پانچویں ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دینی بصیرت عطا فرماتے ہیں۔“

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ:

”جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اپنے گھر والوں کے لیے نیک اللہ کی راہ میں رہتا ہے۔“

امحاب علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوا یا کہ:

”علم دالے اور جاہل آپس میں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟“  
 پچنانچہ حدیث میں علما کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اور طالبین علم کے بارے میں فرمایا کہ  
 اگر انھیں تحصیل علم میں موت آجائے تو وہ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔  
 تبلیغ و تعلیم کے ساتھ اصلاح معاشرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائض میں شامل  
 تھا۔ چنانچہ آپ قرآنی تعلیمات کو خصوصی انداز میں بیان فرماتے۔

اس سلسلے میں حضور اجتماعات سے بھی خطاب فرماتے اور انفرادی طور پر بھی دعوت دیتے  
 تھے۔ بعض اوقات منتخب افراد کو جمع کر کے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی فرماتے، قرآن کریم کی  
 عبارت پڑھنے پھارنے کی تشریح و توضیح فرماتے، صحابہ کرامؓ اکٹھے ہوتے اور مختلف امور پر بحث و  
 تمحیص کرتے اور اپنے پیغمبر سے رہنمائی حاصل کرتے۔ درس و تدریس کا سلسلہ ایک زمانے تک دارالرقم  
 میں جاری رہا۔

پھر قریش مکہ نے جب آپ کو آپ کے رفقاء کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو وہیں  
 پر یہ مجالس قائم ہونے لگیں۔ پھر ہجرت کے بعد حضرت ابوالیوب انصاریؓ کے مکان پر اور پھر مسجد نبویؐ  
 میں درس و تدریس ہونے لگی۔ بعد ازاں آپ نے ایک باضابطہ درس گاہ کی بنیاد ڈالی، اور خود معلم اولیٰ  
 کی حیثیت سے وہاں تعلیم و تربیت فرماتے گئے۔ یہ درس گاہ ”صفہ“ کے نام سے مشہور ہے۔ صفہ عربی  
 میں سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ مسجد نبویؐ کے شمالی جانب ایک چبوترہ تھا جہاں وہ صحابہ قیام پذیر تھے  
 جو علم دین سیکھنے کی غرض سے مختلف علاقوں سے آتے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً چار سو تک تھی،  
 گویا وقتاً فوقتاً ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ حضرت بلال، حضرت صہیب رضی، حضرت عمار بن  
 یاسر، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما صفہ کی اسی مشہور درس گاہ سے تعلق  
 رکھتے تھے۔ ان میں جو قرآن کی تعلیم زبانی حاصل کر لیتے وہ ”قرا“ کہلاتے تھے۔ اسلام کی دعوت  
 عام کرنے کی غرض سے یہی لوگ بھیجے جاتے تھے۔ غزوہ اُحد کے بعد ۴۴ھ میں بڑے معونہ میں دعوت  
 اسلام کی غرض سے بھیجے جانے والے بن ستر (۷۰) قرا کو شہید کر دیا گیا تھا وہ انہی میں سے تھے۔

تعلیم و تربیت کا ایک عام اور واضح اصول یہ ہے کہ حسب موقع نرمی اور سختی دونوں سے  
 کام لیا جائے۔ نرمی کے مواقع پر نرمی اور سختی کے مواقع پر سختی۔ معلم و مربیٰ کامل ہونے کی حیثیت سے  
 نبی کریمؐ نے سختی اور نرمی دونوں سے کام لیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنی ذات  
 کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر شریعت کی حد توڑنے پر سزا دینا ضروری سمجھا۔ آپ حدود اللہ کے  
 سلسلے میں کسی مصلحت کے روادار نہ تھے، البتہ عام معاملات میں نہایت نرمی، تحمل اور بردباری

سے کام لیتے تھے۔

حضور اکرمؐ کے طریقہ تعلیم میں ایک اہم بات یہ تھی کہ موقع و محل کے مطابق نصیحت فرماتے اور مخاطب کے فہم و ادراک اور اس کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر بات کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرو۔ چنانچہ حضور اکرمؐ ایک بدو اور ایک شہری یا سمجھ دار یا کم فہم سے گفتگو کرتے وقت مختلف انداز اختیار فرماتے تھے۔ نیز ہر شخص کے حالات کے مطابق اسے نصیحت فرماتے۔ چنانچہ ایک صحابی، حضرت جابرؓ کو پہلے نصیحت فرمائی کہ ”غور نہ کرو اور اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو“ اور پھر اس پر عمل کی تدابیر بتائیں۔ لیکن جب ایک اور شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیے تو صرف اتنا ارشاد ہوا کہ ”غصہ نہ کرو“ اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا مگر ہر دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا کہ ”غصہ نہ کرو“

معلم اعظمِ قاول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی نفسیات اور اس کی محدود صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ تعلیم و تربیت کے لیے ایسا طریقہ استعمال فرماتے جو گراں نہ گزرتا۔ بعض باتیں مثالوں اور تشبیہات سے سمجھاتے، کبھی توہر اور انتہا تک پہنچانے کی غرض سے صحابہ کرامؓ سے سوال کرتے اور پھر صحابہ کا اضطراب دیکھ کر خود ہی جواب دیتے، کبھی ان کے جواب میں ترمیم فرمادیتے۔ مثلاً ایک بار دریافت فرمایا کہ تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا جسے کشتی میں کوئی بچھاؤ نہ سکے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔

حضور اکرمؐ کے طریقہ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ تعلیم و تعلم کو اس انداز سے جاری رکھتے کہ متعلمین ذرہ برابر کتابت محسوس نہ کرنے پائیں اور تدریس ان کے لیے فرحت و انبساط کا باعث بنے۔ اس لیے کہ جبر و اکراہ سے مفید نتائج ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم دینے میں دنوں کا وقفہ دیتے تاکہ ہم اکتانہ جابائیں۔ جہاں آپؐ تعلیم و تعلم کے دوران اصول تدریج کو پیش نظر رکھتے وہاں گفتگو میں عجلت سے کام نہ لیتے، آہستہ آہستہ اور بھر بھر کر بات کرتے اور اصول اعادہ کے تحت دو دو تین تین بار دہراتے تاکہ متعلم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ جب گفتگو فرماتے تھے تو دریدان میں وقفہ کرتے اور بات کو کھولی کر بیان کرتے تاکہ سننے والا اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکے۔ آپؐ مشکل الفاظ استعمال کرنے سے گریز فرماتے تھے بلکہ آپؐ کا انداز اتنا سادہ اور دلنشین ہوتا تھا کہ حضرت ابن عباسؓ رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا :

”سکھاؤ، آسانی پیدا کرو، مشکل نہیں، اور جب کوئی مفصلے میں ہو تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔“

آپؐ میں ایک بڑی خصوصیت تواضع اور انکساری تھی۔ آپؐ بڑے حلیم الطبع اور بردبار تھے۔ بعض دیمائے تو بڑے اکھڑپن سے پیش آتے اور درشتگی کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن آپؐ مناسبت تھیں اسے انہیں مطمئن فرماتے۔ آپؐ کی حیثیت ایک متواضع برادر اور ایک رحیم و شفیع باپ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا میں تمہارے لیے ہمارے باپ کی مانند ہوں۔ گویا آپؐ بڑے خوشگوار ماحول اور نہایت دلنشین انداز سے تعلیم دیتے تھے۔

ایک اور چیز جو آپؐ کے طریقہ تعلیم میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رزائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سُسنے والا بالبطع فضائل کی طرف مائل اور رزائل سے متنفر ہو جائے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی مثال یوں بیان فرمائی:

”یہ نیکی ایک دانہ ہے جو زمین سے سات بالیں بن کر اُگتا ہے اور ہر بالی میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں۔ اس طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی نعمات کا باعث ہوتا ہے۔“

اس کے مقابلے میں نمائش کی نیکی کو بے نتیجہ قرار دیا گیا۔ کہا گیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان اپنا بیج پٹان پر پھینک دے جس پر زراعی میو، ذرا سی بارش ہوئی تو بیج اور میو سب بہہ گئی۔ اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح یتیم کا مال کھانے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کی سیرت اور عملی اسوہ میں ایسا زبردست اثر تھا جس نے بہت قلیل عرصے میں ایک دہاندہ قوم کو دنیا کا مادی اور رہنما بنا دیا۔ آپؐ کے اخلاق اور کردار ہی کے فیضان سے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کو وہ عظمت عطا ہوئی کہ دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی ان کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدو خالی اور رسول اللہؐ کے طریق تربیت پر غور کرنے سے یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام اس نصب العین اور نظریہ حیات کے گرد گھومتا ہے جسے اسلام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

در اصل نظریہ تعلیم نظریہ حیات ہی کا عکس ہوا کرتا ہے۔ تعلیم کا مقصد تعمیر سیرت و کردار ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ اس کا اپنے نظریہ حیات یا اس نصب العین

پر ہے۔ اس نے قبول کیا ہے غیر متزلزل یقین و ایمان پیدا ہو۔

بعض ماہرین تعلیم مغرب کی تقلید میں رہتے ہیں (جس کے عادی ہو چکے ہیں) فرماتے ہیں کہ مذہب سے تعلیم کو الگ رکھنا چاہیے۔ تعلیم کا مقصد حصول علم ہے، اسے بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیے تاکہ ایک شخص اس علم کی روشنی میں آزادانہ طور پر مسائل و معاملات زندگی کو دیکھے اور نتائج اخذ کرے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اہل مغرب کی اس کاروائی کی وجہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ اہل مغرب نے اگر تعلیم کو مذہب سے الگ کر دیا ہے تو ان کے لیے یہ ضروری تھا۔ اس لیے کہ جب مذہب ان کے تصور حیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کے نظام تعلیم کا جزو قرار پائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے بعد مغربی اقوام کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اسے تعلیم یا کسی اور شعبہ حیات میں ساتھ رکھتے۔ مذہب اور تعلیم کا افتراق، مذہب اور سیاست کے افتراق کا لازمی نتیجہ ہے اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے پر وہ اس لیے مجبور ہوئے کہ ان کا مذہب ان منظم جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا جنہیں ریاستیں کما جاتا ہے۔ انھوں نے مذہب کو سیاست سے مجبوراً اس وقت الگ کیا کہ جب کلیسا اور ریاست کے طویل جھگڑوں نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ دونوں کا یکجا رکھنا بے سود بلکہ ناممکن ہے۔

بعض اوقات یورپ میں کلیسا اور ریاست کی جھلکی کو میکا وئی فلسفہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے حکمرانوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ اگر ریاست کے اندرونی اور بیرونی اشتعال کے لیے ضروری ہو تو وہ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی قیود کو توڑ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت یورپ میں میکا وئی فلسفہ کا ظہور ہی اس وقت ہوا کہ جب یورپ کی اقوام اسے قبول کرنے کے لیے پہلے ہی پوری طرح سے آمادہ ہو چکی تھیں۔

اس کے برعکس زندگی کا وہ تصور جو ہمیں اسلام نے دیا ہے عیسائیت کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر عادی ہے۔ سیاست اس سے نہ صرف ملاقبت رکھتی ہے بلکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتی بقول اقبال :

جہاں وہیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے بارے میں وہی نقطہ نظر اختیار کریں جو یورپی اقوام کو عیسائیت کے نقائص کی بنا پر اختیار کرنا پڑا۔ مغرب کے ماہرین تعلیم کے لئے مذہب اور تعلیم کو باہم رکھنا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا کہ ہمارے لئے مذہب اور تعلیم کو جدا رکھنا۔

اگر ہم رائج الوقت دیگر تقریبات حیات مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، قومیت وغیرہ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا نصب العین اور تصور حیات اس کی زندگی کے تمام



شعبوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کا نظام قانون، نظام سیاست، نظام تعلیم، نظام معاشیات، غرض کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال اس کے ماتحت تشکیل پاتے ہیں اور وہ ان کی خدمت کے لیے وجود میں آئے ہیں اور ہر آن اس کی خدمت کے لیے وقف رہتے ہیں۔

ہمیں اگر بحیثیت مسلمان مینہ ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کہ ہم اس نظام تعلیم و تربیت کو اپنائیں جو ہمارے نصب العین کا محافظ ہو، کیونکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کا نظام تعلیم اس کے نصب العین سے ہم آہنگ نہ ہو۔

ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں جو انحطاط کا عمل جاری ہے وہ غلط تربیت کی بنا پر اپنے نصب العین سے دوری کے باعث ہے۔ نصب العین سے دوری تعلیم و تربیت میں کاروباری ذہنیت پیدا کر دیتی ہے، اور جب کوئی پوز کاروباری سطح پر آجائے تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کاروباری آدمی کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ وہی مال مندی میں لائے گا جس کے زیادہ خرید لے سکیں۔ شکایت کی جاتی ہے کہ نئی نسل بے راہروی کا شکار ہے، اس میں احترام و تعلیم کے جذبات مفقود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ سیکھا ہی کب ہے۔ کیا نئی نسل کی تربیت ان خطوط پر ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں یہ عنصر پیدا ہو؟ احترام کا موجب وہ تعلیم بنتی ہے جو ذہنوں میں جلا، تلوک میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرے میں ہمدردی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسن توازن اور انسانیت میں ارتقا اور نصب العین سے قربت پیدا کرے۔ احترام و تعلیم پیدا ہوتے ہیں غفلت کے احساس سے۔ آپ ان کی تربیت ان خطوط پر کیجیے جس سے وہ اپنے نصب العین کے سچے عاشق بن جائیں۔ جب اپنے نصب العین کی غفلت ان کے سامنے بے نقاب ہوگی تو ان کی نگہ عقیدت خود بخود اس کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ احترام نام ہے اعتراف عظمت کا۔ غفلت ہوگی تو احترام خود بخود پیدا ہوگا۔ حقیقت خود کو منواتی ہے منوائے نہیں جاتی۔ ان کے سامنے ایسے افراد پیش کیجیے جو اسلامی سیرت کے پیکر ہوں اور جن کی زندگیاں ان کے اپنے نصب العین کی عملی تصویریں ہوں تو پھر دیکھیے یہی نوران مجسم تعلیم بنتے ہیں یا نہیں اور اس سلسلے میں کامل ترین اور روشن ترین مثال یعنی نبی کریم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ دعویٰ نبوت کے بعد قریش نے کیا کچھ نہیں کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہیں کی کہ آپ کے اخلاق و اعمال کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ جہاں دوستوں کی نگاہوں کے سجدے آپ کے لیے وقف تھے وہاں آپ کے کڑے مخالفین کے پُر غرور سر بھی آپ کی بلند کرداری کے سامنے خم تھے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا  
اگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے کہ جب وہ مکتب یا اسکول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے اس وقت تک وہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق تین چار سال کی عمر میں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے اس کا اثر تمام زندگی رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس عمر میں بچہ گھر ہی میں رہتا ہے، بلکہ زیادہ تر ماں کی گود میں۔ گویا تربیت کی ابتدا ماں کی گود سے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اولین مکتب ماں کی گود ہے۔ لہذا ماں کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ بچوں کی صحیح تربیت پر مرکوز رکھے۔ تاکہ اس کی جملہ صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو۔

اولاد کی پرورش اور اس کی تربیت کا ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی پوری طرح ذمہ دار ہے۔ اسلام مرد و عورت دونوں کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ آج کے والدین اپنی معاشی و دیگر مصروفیات کی بنا پر اپنے بچوں کی تربیت پر برائے نام ہی وقت دے پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے معلم یا مربی سمجائے ان کے والدین کے ٹی۔ وی، ریڈیو، گھر کے ملازم یا پھر ان کے بڑے بھائی اور ان کے ارد گرد پھیلا ہوا غیر اسلامی معاشرہ ٹھہرتے ہیں۔ اس طرح کی تربیت پائے ہوئے بچے بڑے ہو کر پہلے اپنے ٹیچے اور پھر پورے معاشرے کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ اسکول، کالج یا یونیورسٹی ان بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے سکیں گے لیکن یہ امید ایک امید موعوم ہی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اسکول اور کالج کا مقصد تو یہ ہے کہ یہاں اس تعلیم و تربیت کا نشوونما کیا جائے جو بچہ ابتداءً اپنے گھر سے لے کر آیا ہے یا پھر اس کی تربیت میں جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کر کے اس کی سیرت سازی کی جائے۔ لیکن جب بچہ سرے سے ہی اس صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہو تو اسے اپنے والدین سے ملنی چاہیے تھی تو پھر دوسروں سے اس کی اصلاح کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

بچہ تو دراصل ایک سیدھی اور نرم و نازک شاخ کی مانند ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین یا اس کے سرپرست ہوتے ہیں جو اپنی صحیح یا غلط تربیت سے اسے ہر حال میں موڑ لیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ :

”ہر بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا

مجوسی بنالیتے ہیں۔“ اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب پہلے تعلیم و تربیت کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا اسوہ معلوم کریں اور پھر ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنے بچوں کی تربیت کریں جس کی ابتدا والدین و سرپرست اپنے گھر سے کریں اور پھر مکتب و مدرسہ کے مدرسین اور اسکول و کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ انہیں اسلامی اقدار سے روشناس کرتے ہوئے اچھا شہری بنانے میں اپنے اپنے فرائض پورے کریں۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم ایک ایسی نسل تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اسوہ رسول پر عمل پیرا اور اخلاق نبوی کو اپنانے والی ہو۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں دنیا کی دوسری تمام اقوام سے امتیاز حاصل ہے کہ ہمارے پاس تعلیم و تربیت، اخلاقیات، نصب العین کی بلندی اور پاکیزگی کا مؤثر ترین نمونہ موجود ہے۔ جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں سبھ و پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔ دراصل ہماری ساری محرومی کا سبب یہ کوتاہی اور فرد گزاشت ہے کہ ہم نے تعلیمات نبوی سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا اور مغرب کی پُر فزیب حکمت عملی اور لادینی نظام تعلیم کا شکار ہو گئے۔ ہر کارہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کو جس لمحہ نیک نیتی سے اختیار کر لیا گیا اور اس نظام تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔

# سیرت محمدیہ کا معاشی پہلو

جناب محترم مولانا محمد طاہر

میسورے مقالے کا موضوع ہے: سیرت محمدیہ کا معاشی پہلو، اور مجھے اس مقالے میں موضوع کے نظری اور عملی دونوں رُخوں پر کچھ روشنی ڈالنا ہے۔ یعنی یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے علمی و نظری طور پر جو معاشی تعلیمات و ہدایات پیش فرمائیں وہ کیا ہیں؟ اور اُن پر عمل کرنے اور اُن کی تطبیق سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جو معاشی مظاہر جلوہ گر اور جو عملی ادضاع و اطوار ظہور پذیر ہوئے وہ کیا ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ اس مختصر مقالے میں اُن کو پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اجمال و اختصار کے ساتھ ہی پیش کیا گیا جاسکتا ہے، اور پھر چوں کہ سیرت محمدیہ کے اصل ماخذ قرآن و حدیث ہیں لہذا میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ بھی عرض کروں قرآن و حدیث سے ہو۔

(۱) اور چوں کہ معاشیات کا تعلق رزق و مال سے ہے، لہذا سب سے پہلے میں اُس رویے اور طرزِ فکر کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو رزق و مال کے بارے میں قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتا ہے، بالفاظِ دیگر اُس حیثیت و پوزیشن کو واضح کروں گا جو رزق و مال کی اسلام اور بغیر اسلام کی نظر میں ہے کیوں کہ اسے سمجھ لینے کے بعد اسلام کی معاشی تعلیمات کا سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا اور اُن پر عمل کرنا بھی آسان، اس لحاظ سے مال کے بارے میں اسلام کے رویے کے تعین کا مسئلہ ایک بڑا اہم اور ضروری مسئلہ ہے۔

اس مسئلے کے بارے میں قرآن حکیم اور احادیثِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے سے جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مال کے متعلق جو اسلام کا رویہ ہے وہ نہ محض محبت کا رویہ ہے اور نہ محض نفرت کا رویہ بلکہ اُن دونوں کے بین میں ایسا رویہ ہے جسے محبت آمیز نفرت یا نفرت آمیز محبت کا رویہ کہہ سکتے ہیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محض محبت کا رویہ اس لیے نہیں کہ اس سے انسان کے اندر مال کی بے پناہ حرص پیدا ہوتی اور وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر اندھا دھند اُس کے حصول کے پیچھے پڑ جاتا اور اُسے سمیٹ سمیٹ کر جمع

رکھتا ہے، ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے گریز کرتا اور حق تلفیوں کا مرتکب بنتا اور آخرت سے غافل اور بے پروا ہوجاتا ہے۔ لہذا قرآن وحدیث کی رو سے محض محبت کا رویہ غلط و باطل اور منشاء اسلام کے خلاف ہے۔ اور محض نفرت کا رویہ اس لیے نہیں کہ یہ انسان کو ترک دنیا اور رہبانیت وجوگیت کی طرف لے جاتا اور بعض ضروری فرائض و واجبات سے لاتعلق دے پے پروا بنا دیتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمے عائد ہوتے اور جن کی ادائی پر معاشرے کے قیام و بقا اور اجتماعی امن و اطمینان کا دار و مدار ہوتا ہے اور یہ چیزیں چوں کہ اسلام کے منشاء کے خلاف ہیں لہذا نفرت کا رویہ بھی اسلام کے نزدیک باطل اور مردود رویہ ہے، بالفاظ دیگر مال کے متعلق محبت کا رویہ چوں کہ افراط پر اور نفرت کا رویہ تفریط پر مبنی ہے اور اسلام چوں کہ توسط و اعتدال کا دین ہے لہذا اس کے نزدیک افراط و تفریط پر مبنی محبت اور نفرت کے دونوں رویے غلط ہیں اور صحیح رویہ صرف وہ ہے جو ان دونوں کے درمیان اور وسط میں ہے اور وہ یہ کہ مال فی نفسہ نہ محبت کے قابل ہے اور نہ نفرت کے قابل بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ذریعہ خیریت کی بھی صلاحیت ہے اور ذریعہ شریت کی بھی صلاحیت اس سے انسان کو نفع بھی پہنچ سکتا ہے اور ضرر بھی پہنچ سکتا ہے لہذا ذریعہ خیریت نہ کہنے کی وجہ سے محبت کے قابل اور ذریعہ شریت نہ کہنے کی وجہ سے نفرت کے قابل ہے اور چوں کہ یہ دونوں صلاحیتیں اُس کے اندر ہر وقت موجود رہتی ہیں لہذا وہ بیک وقت محبت اور نفرت دونوں کے قابل ہوتا ہے۔ بنا بریں اس کے متعلق اسلام کا رویہ محبت کے ساتھ نفرت اور نفرت کے ساتھ محبت کا رویہ ہے۔

اس کا ثبوت یہ کہ قرآن وحدیث میں ایک طرف وہ نصوص ہیں جن میں مال کو خیر فضل اور قیاماً لئلا سے تعبیر فرمایا گیا ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انسان کے بہت سے طبعی، جبلی معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی تقاضے پورے ہوتے اور بہت سے دینی مقاصد بر رُوئے کار آتے ہیں اور انسان کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔ نیز وہ نصوص ہیں جن میں جائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی ترغیب اور اُس کے لیے صحیح نیت سے جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ جیسا نیک عمل اور ذریعہ مغفرت اور رضائے الہی بتلایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی نصوص سے مال کے متعلق محض نفرت کے رویے کی نفی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف وہ نصوص بھی ہیں جن میں ایسے حرام مال کی مذمت اور بُرائی ہے جو باطل و ناجائز طریقوں جیسے رِبَا، میسر و قمار، رشوت، چوری، خیانت اور دھوکہ دہی وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہو یا تکاثر و تفاخر کی نیت سے کمایا گیا ہو یا بخل کی وجہ سے ذخیرہ و خزانہ بنا کر رکھا گیا ہو، اور ایسے مال کو اللہ کی ناراضی اور دنیا و آخرت کی بربادی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، سو ظاہر ہے کہ ایسی نصوص سے مال کی محبت کے رویے کی صاف نفی ہوتی ہے۔

مال کے بارے میں اسلام کا جو رویہ اور عندیہ ہے اُس پر کچھ روشنی قرآن مجید کی اُن آیات سے بھی پڑتی ہے جن میں مال کو انسان کے لیے فتنہ بتلایا گیا ہے، مثلاً سورۃ الانفال کی یہ آیت:

وَرَاغِبُوا اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ دَاوِلْدُكُمْ فِتْنَةٌ

”اور خوب جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں یعنی سخت آزمائش و ابتلا“

امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ فتن کے اصل معنی ہیں کھراکھوٹا معلوم کرنے کے لیے سونے وغیرہ کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا، اسی لحاظ سے فتنہ کے معنی آزمائش و امتحان کے لیے گئے ہیں۔ کیونکہ اس میں بھی انسان کی کامیابی و ناکامی کا اظہار ہوتا ہے، لہذا مال کو فتنہ، آزمائش اور امتحان کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ مال انسان کے لیے بمنزل آگ کی بھٹی اور امتحان کے پرچے ہے جس سے انسان کا کھراکھوٹا اور کامیاب و ناکام ہونا ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ جو شخص مال کو جائز و حلال طریقوں سے کماتا اور جائز طور پر صحیح مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ فائز و کامیاب ہوتا ہے، اور جو مال کو ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کرتا اور مصارف خیر میں خرچ کرنے کے بجائے اُسے جمع رکھتا یا غلط ذرائع سے مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ عند اللہ ناکام و نامراد رہتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کو پرکھنے کا معیار اور امتحان کا پرچہ نہ جاتے خود نہ کوئی اچھی اور قابلِ رغبت چیز ہے اور نہ بُری اور قابلِ نفرت چیز بلکہ اس لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ اس سے کھوے اور کامیاب ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے بُری چیز ہے کہ اس کے ذریعے سے کھوٹے اور قلیل و ناکام ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ ٹھیک ہی حال مال کا بھی ہے، انسان کی کامیابی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اچھا اور ناکامی و نامرادی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے بُرا ہے۔

مال کی اسلام کی نظر میں جو حیثیت ہے اُس پر کچھ اُن آیات و احادیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہیں، اگر ہوتی تو اللہ کا فروں کو ہرگز نہ دیتا اور نہ ہی وہی اور نیک بندہ مال دار ہوتا، اور یہ کہ مال کا ہونا انسان کے لیے وجہ شرافت و فضیلت ہے اور نہ ہونا انسان کے لیے سبب رزالت و حقارت ہے بلکہ شرف و فضیلت کا واحد سبب تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے اور رزالت و حقارت کا واحد سبب کفر و شرک اور فسق و فجور ہے، چنانچہ اگر دو مسلمان ایمان و تقویٰ میں برابر ہیں تو اللہ کے ہاں اُن کا درجہ برابر ہے اُن میں سے ایک کا غنی و مال دار اور دوسرے کا مسکین و نادار ہونا اُن کے درجے میں کمی بیشی کا باعث نہیں بن سکتا، قرآن مجید میں سورۃ السبا کی آیت ہے:

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِآلَتِي تُقَرَّبُ بِكُمْ عِنْدَ نَارِنَا إِلَّا  
مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

”اور نہ تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد وہ چیز ہے جو تمہیں ہمارے قریب کرے  
اور تمہارے لیے تقرب الہی کا ذریعہ بنے، مگر وہ جو ایمان اور عمل صالح کیے“

جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث  
نبویؐ کا ترجمہ یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر چھتر کے برابر  
کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافروں کو اُس میں سے ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔

مسند احمد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث نبویؐ کا ترجمہ اس  
طرح ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُردار بکری کے پاس سے گزرے جسے اُس کے مالکوں نے باہر پھینک  
دیا تھا تو آپؐ نے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان  
ہے کہ دنیا کا مال اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور بے وقعت چیز ہے جتنی یہ مُردار بکری اپنے  
مالکوں کی نظر میں ہے۔ ان احادیث سے صاف واضح ہو گیا ہے کہ اللہ کے ہاں دنیوی مال و دولت کی  
کوئی قدر و منزلت نہیں۔ لہذا اس کی بنا پر ایک انسان کو دوسرے سے بہتر اور افضل سمجھنا غلطی اور  
گمراہی ہے جس سے مسلمان کو بچنا چاہیے، حال آں کہ عام طور پر مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

اسلام کی نظر میں دنیوی مال و دولت کی جو حیثیت ہے اس پر میں نے سب سے پہلے اور قریب  
تفصیل کے ساتھ گفت گو کی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج عام طور پر ہم مسلمانوں کی یہ جو  
حالت ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال و  
دولت سمیٹنے اور مال داری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی حرص میں مدہوش ہیں، دیکھا جائے  
تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے مال و دولت کو اصل مقصد بالذات اور ذریعہ شرف و عظمت سمجھ  
رکھا ہے اور اُس کے متعلق ردیہ اور طرز فکر قطعی محبت کا رویہ اور طرز فکر ہے جو اسلام اور مشائے  
خدا و رسولؐ کے خلاف ہے، لہذا ضروری ہے کہ مسلمان کو یہ بتایا جائے کہ یہ حیثیت ایک مسلمان کے  
مال و دولت کے بارے میں اس کا رویہ اور طرز فکر کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔

سیرت محمدیہؐ کے معاشی سلوک و وضاحت میں ایک بات جو آغاز میں عرض کر دینا ضروری  
ہے وہ یہ کہ قرآن و حدیث میں معاشی زندگی سے متعلق جو تعلیمات ہیں وہ دو قسم کی ہیں: ایک وہ  
جن کی بنیاد عدل اور دوسری وہ جن کی بنیاد احسان ہے۔ جو عدل پر مبنی ہیں اُن کے اندر اس چیز  
کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر فرد اور ہر فریق معاملہ کو اُس کا واجبی حق پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک ملے

اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہو۔ لہذا ان تعلیمات کی حیثیت حقیقی اور مستقل قوانین کی ہے جن پر عمل کرنا ضروری اور جن کے نفاذ اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اور جو تعلیمات احسان پر مبنی ہیں اُن کے اندر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ افراد رضا کارانہ طور پر اپنے حقوق کا ایک دوسرے کے لیے ایثار کریں۔ لہذا یہ تعلیمات اخلاقی نوعیت کی ہیں جن پر عمل کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ البتہ ان پر عمل کرنے کا عند اللہ جو درجہ اور جو اجر و ثواب ہے وہ اُس درجے اور اجر و ثواب سے کم نہیں اونچا اور زیادہ ہے جو عدل والی قانونی تعلیمات پر عمل کرنے کا ہے۔ مصلح اعظم، ہادی برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اختیار دیا کہ وہ ان دو قسم کی تعلیمات میں سے جن پر چاہیں عمل کریں، لیکن اپنے عمل کے لیے آپؐ نے صرف احسان والی اخلاقی معاشی تعلیمات اختیار فرمائیں اور ہمیشہ اُن پر قائم اور عمل پیرا رہے یعنی ہمیشہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار فرمایا، کیوں کہ آیت قرآنی ”إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ“ کے مطابق آپؐ اخلاقی عظمت کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ لہذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ اسلام کی معاشی تعلیمات صرف وہ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی معاشی زندگی میں عملی طور پر جلوہ گر ہوئیں اور صحابہ کرامؓ کی آنکھوں نے اُن کا مشاہدہ کیا، کیوں کہ ان کے علاوہ وہ بھی اسلام کی معاشی تعلیمات ہیں جو عدل پر مبنی اور آپؐ کے اقوال و ارشادات سے سامنے آئیں اور صحابہ کرامؓ نے کالوں سے سُنیں اور جو آج قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور عام انسانوں کے لیے دُوبی قابلِ عمل بھی ہیں، کیوں کہ اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہر شخص کے بس میں نہیں، بتائیے دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا سکتے ہوں؟

(۲) اب میں اسلام کی کچھ وہ معاشی تعلیمات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا قرآن و حدیث میں اجمال و تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور جن سے سیرت مقدسہ کے معاشی پہلو کے کچھ مدد و نفع نمایاں اور اُجاگر ہوتے ہیں۔

قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے: ہر مسلمان پر جو معاش کے سلسلے میں کوئی مفید کام کر سکتا ہو، لازم ہے کہ ضرور کام کرے۔ آلایہ کہ کوئی عذر مبالغہ ہو۔ ضرور کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ قرآن و حدیث میں یہ تعلیم جس اسلوب سے ہے وہ نڈب پر نہیں وُجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں جو امر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اُن کا وُجوب کے لیے متعین ہونا احادیث نے ثابت کر دیا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں کے الفاظ ہیں: ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب المال فریضة بعد الفریضة“ دوسری حدیث جو حضرت انسؓ سے مروی ہے اس طرح ہے:



”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم طلب الحلال واجب على كل مسلم“ ان احادیث میں فریضہ اور واجب کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حلال رزق و مال کے لیے جہد و جد اور سعی و کوشش کرنا مسلمان کا دینی فریضہ اور ایک واجب و ضروری عمل ہے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی کہ رزق و مال پر فرد اور معاشرے دونوں کی حیات و بقا اور فلاح و مہم جوئی بہت سے دینی اور معاشرتی فرائض و واجبات کی ادائی کا دار و مدار ہے۔ گویا نقلی اور عقلی کئی ایسے دلائل ہیں جن سے معاشی جہد و جد کا واجب اور ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں اس کو جہاد جیسا تنیک عمل فرمایا گیا ہے جس پر عظیم اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ بعض احادیث میں یہ فرما کر اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے کہ یہ اللہ کی محبت اور مغفرت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

معاشی جہد و جد سے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے کسی ہوش مند کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس پر عمل کرے یا نہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، افسوس کہ آج مسلمان معاشرے اس پر عمل کرنے کے معاملے میں سب سے پیچھے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اپنی بنیادی ضروریات تک میں خود کفیل نہیں اور دوسروں کے دست نگر ہیں۔

بہر حال جہاں تک سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کا تعلق ہے وہ اس تعلیم پر پوری طرح عملیہ رہے۔ حدیث و سیرت کی کتابوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم معاش کے سلسلے میں بہ نفس نفیس تجارت بھی کرتے رہے جو قریش ملک کا خاص پیشہ اور مشغلہ تھا اور بعض دفعہ اجرت پر بکریاں بھی چرائیں، اسی طرح گھریلو معاشیات میں بھی آپ برابر روزمرہ کے معاشی کاموں میں حصہ لیتے رہے اور یہ سلسلہ پوری زندگی میں جاری اور قائم رہا۔ فرائض نبوت کی ادائی کے ساتھ آپ کو جب بھی موقع ملا کسب معاش کے لیے آپ نے ضرور کوئی کام کیا۔ پھر ہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ اپنی معاش کا بوجھ خود اٹھانے کے لیے ہر صحابی کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا۔ کوئی تجارت، کوئی زراعت، کوئی صنعت و حرفت اور کوئی محنت و مزدوری کا کام انجام دیتا تھا۔

قرآن و حدیث میں دوسری معاشی تعلیم اجرت پر کام کرنے کے لئے سے متعلق ہے۔ اجرت پر کام کرنے کے لئے کو اصولی طور پر درست و جائز قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث مبارکہ ہیں ان کے اندر مستاجر اور اجیر کے لیے واضح ہدایات ہی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مستاجر پر لازم ہے کہ (۱) وہ اجیر سے اتنا ہی کام لے جتنا وہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہو۔ (۲) اور یہ کہ کام پر لگانے سے پہلے

واضح طور پر اجیر کو بتادے کہ اُس کی اُجرت کتنی ہوگی۔ (۳) اور یہ کہ کام ختم ہونے پر فوراً اجیر کو اس کی اجرت ادا کر دے۔ (۴) اور یہ کہ اُجرت مقرر کرنے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ اُس سے اجیر کی بنیادی معاشی ضروریات کسی نہ کسی طور پوری ہو سکتی ہوں۔ (۵) اور یہ کہ اُجرت کے تعین میں کام کی نوعیت اور مقدار کا لحاظ رکھا جائے، جو کام نوعیت کے لحاظ سے ادنیٰ و معمولی درجے کا ہو اُس کی اُجرت کم، جو متوسط درجے کا ہو اُس کی اُجرت زیادہ اور جو اعلا درجے کا ہو اُس کی اُجرت اس سے بھی زیادہ لگائی جائے۔ مطلب یہ کہ اسلام اس کو اصولی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ افادیت کے لحاظ سے اور اُس فنی مہارت کے لحاظ سے جو کام کرنے والے نے حاصل کی نیز اُس انہجی و توانائی کے لحاظ سے جو کام میں کام کرنے والے کی خرچ ہوئی، کاموں کے مختلف درجے ہیں لہذا ان کے مطابق اُن کی اجرتیں مختلف و متفاوت ہونی چاہئیں۔ اسی طرح کام کی مقدار کے لحاظ سے بھی اُجرت میں کمی بیشی کا فرق ہونا چاہیے۔ مثلاً ایک ہی نوعیت کا کام جب چار گھنٹے ہو تو اُس کی جتنی اُجرت ہو اٹھ گھنٹے کے کام کی اُس سے دوگنی ہونی چاہیے۔ قرآن حکیم میں ہے: ”لِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا“ سب کے لیے مختلف درجے ہیں اُن کے عمل کے اعتبار سے۔ دراصل یہ ایسا اصول ہے جو انسانوں کو بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام کی محنت کرنے پر ابھارتا ہے اور اس سے ملکی پیداوار میں روز افزوں اضافہ ہوتا اور معاشی خوش حالی بڑھتی ہے۔ (۶) مستاجر پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اجیر کو کام کے اوقات میں دینی فرائض کی ادائی مثلاً نماز، روزے سے نہ روکے، اسی طرح کھانے پینے کے اوقات میں کھانے پینے اور شدید تھکان کی صورت میں قدرے آرام کا موقع دے۔ (۷) اسی طرح اجیر پر لازم ہے کہ وہ معاہدے کے مطابق کام اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر کرے، کام میں چوری اور سُستی و کوتاہی سے بچے۔ (۸) اور پھر اجیر اور مستاجر میں سے کوئی بھی دوسرے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ہر ایک دوسرے کا بھلا چاہے اور احترام کرے۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معلم کامل، با دی برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی یہ نفس نفیس اُجرت پر دوسروں کا کام کیا اور بعض دفعہ دوسروں سے بھی اُجرت پر کام کرایا۔ جب خود کام کیا تو بہتر سے بہتر اور معاہدے سے زیادہ کیلہ اور دوسروں سے کام کرایا تو اُن کو مقررہ اجرت سے زیادہ عطا فرمائی اور کبھی کسی کو آپ سے شکایت نہ ہوتی۔ سنن الکبریٰ یسہقی میں حضرت جابر رضی عنہ سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسی من خدمتہ بحجة سفرتین بقلوص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اجرت پر خدمتِ نبوی سے دو تجارتی سفروں کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان

اونٹ کے عوض۔ صحیح البخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث پر ایسے طور پر ہے: ”قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ما بعث الله نبيًا إلا راعى غنم، قالوا ولا انت يا رسول الله قال وانا كنت اراعها لاهل مكة بالقراريط“

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اُس نے بکریاں چراتیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ نے بھی؟ تو فرمایا ہاں میں بھی مکے والوں کی بکریاں چند قیراط کے عوض چراتا رہا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حُسن کارکردگی کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو مقررہ اجرت سے زیادہ پیش فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حجام سے پھمتیاں لگوائیں اور اُس کو اجرت دی۔ جب مکے سے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو اجرت پر ایک شخص کو لیا جو راستہ دکھانے پر مامور ہوا۔ اسی طرح کئی روایات ہیں جن میں صحابہؓ کے اجرت پر کام کرنے کے لئے کا ذکر ہے۔

(۳) قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم وہ ہے جو شخصی ملکیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرتی اشیاء میں سے جو شے اپنی قدرتی حالت و شکل پر قائم اور برقرار ہو اُس کا کوئی شخص مالک نہیں کہلا سکتا، کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات کے مطابق ایسی ہر شے سب کے استفادہ کے لیے مباح عام کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس شے سے فائدہ اٹھانے کا صرف اُسی کو حق ہے دوسرے کو نہیں، البتہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہلے وسبقہ کے کسی قدرتی شے میں اپنی سعی و محنت سے ایسا رد و بدل کر دے جس سے اُس شے میں ایک نئی افادیت پیدا ہو جائے تو اُس شخص کو اپنی سعی و محنت کے اثرات کی وجہ سے جو اُس شے کے ساتھ قائم ہوئے اُس شے سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے جس کا نام حق ملکیت ہے۔ اب دوسرا کوئی اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس شے سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ قدرتی اشیاء کی ابتدائی ملکیت کا یہ تصور قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی مستنبط ہوتا ہے اور احادیث میں اس کا واضح ذکر ہے مثلاً ”مَنْ أَحْيَا رِضَامِيَّةً فَهِيَ لَهُ“ گویا کسی قدرتی شے کی ابتدائی ملکیت کا اصل سبب انسان کی مفید محنت ہے محض قبضہ نہیں پھر جب پہلا مالک اپنی چیز کسی دوسرے کو ایسے طریقے سے دے دیتا ہے جس میں اُس کی رضامندی موجود ہوتی ہے تو وہ چیز دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے اور وہ اُس کا مالک بن جاتا ہے۔ رضامندی کے موجود ہونے نہ ہونے کا خارجی معیار یہ ہے کہ جس طریقے میں پہلے مالک کے لیے کسی نہ کسی شکل میں مادی یا روحانی معاوضہ موجود ہو وہ طریقہ رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے، اور جس میں

معادضہ موجود نہیں ہوتا وہ عدم رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے۔ رضامندی کے عام طور پر پانچ طریقے ہیں: (۱) تجارتی خرید و فروخت کا طریقہ، جس میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کے لیے نقد وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کے لیے جس کی شکل میں معادضہ موجود ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا طریقہ صدقے و ہبہ کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کے لیے روحانی و اخروی اجر و ثواب کی شکل میں معادضہ موجود ہوتا ہے لہذا وہ اپنی مرضی اور خوشی سے دوسرے کو دیتا ہے۔ (۳) تیسرا طریقہ نوکری و ملازمت کا طریقہ ہے۔ اس میں ایک شخص دوسرے کو اجرت و تنخواہ کے طور پر جو دیتا ہے اُس کے عوض اُس کو خدمت اور منفعت ملتی ہے۔ (۴) چوتھا طریقہ قرض و ادھار کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اُس کو اپنی مقررہ چیز جیسی چیز بھی ملے گی اور وہ اجر و ثواب کا بھی مستحق بنے گا۔ اور (۵) پانچواں طریقہ وراثت کا طریقہ ہے جس میں صلہ رحمی کی وجہ سے مورث کے لیے اجر و ثواب موجود ہوتا ہے۔ گویا وہ نسب و قربت کی بنا پر یہ چاہتا تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا مرنے والا اُس کے قریبی رشتے داروں کو ملے لہذا وہ اس کی بنا پر اخروی اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے، ان مذکورہ پانچ طریقوں سے ایک کی ملکیت کا دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا ان آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے جن میں ان طریقوں کا ذکر ہے۔

اور پھر شخصی ملکیت کے متعلق اسلام کا یہ جو اصول تصور ہے اس کی رو سے جس طرح کوئی شخص اشیائے صرف میں سے کسی شے کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح ہر اُس شے کا بھی مالک قرار پاتا ہے جو ذرائع پیداوار کی تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً زرعی زمین اور کارخانہ وغیرہ، دونوں کی ملکیت میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ اسلام اشیائے صرف کے مالک کو ہر اُس تصرف کا اختیار دیتا ہے جو اُس کے لیے مفید ہو، جب کہ ذرائع پیداوار کے مالک کو کسی ایسے تصرف کا اختیار نہیں دیتا جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفاد عام کے لیے مضر و نقصان دہ ہو، کیوں کہ ایسی اشیاء اپنی وضع و ساخت کے لحاظ سے مفاد عام کے لیے ہوتی ہیں۔ لہذا شخصی ملکیت کے باوجود اُن کی یہ حیثیت قائم رہتی ہے اور مالک پابند ہوتا ہے کہ اُن میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفاد عام کے لیے مضر ہو۔ اس سے اُن مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے جو ذرائع پیداوار کے مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہونے کی صورت میں ضرر پیدا ہوتے اور بدامنی و بے چینی کا باعث بنتے ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شخصی و انفرادی ملکیتوں کا جو نظام قائم ہوا وہ اسی تصور ملکیت کے مطابق تھا۔ قدرتی اشیاء کی ملکیت کی بنیاد انسانی محنت تھی اور

استقال ملکیت کی بنیاد پہلے مالک کی حقیقی رضامندی یا وہ طریقے تھے جن میں حقیقی رضامندی پائی جایا کرتی ہے۔

(۴) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کا تعلق معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے ہے اور جس کے ساتھ معاشرے کے معاشی اعتدال و توازن کا گہرا رشتہ ہے، اور وہ یہ کہ جو معاشی معاملات بنیادی طور پر ایسے ہیں کہ ان کے اندر ہر فریق کو اس کا حق ضرور ملتا اور اس کی رضامندی کا سامان ہوتا ہے وہ عدل کے مطابق ہونے کی وجہ سے صحیح اور جائز ہیں۔ اور جن میں ایک فریق کی ضرورت تلافی ہوتی یا حق تلفی کا ظن و احتمال ہوتا ہے وہ موجود یا محتمل ظلم کی وجہ سے باطل اور فاسد ہیں۔ صحیح اور جائز معاشی معاملات کی مثال بیع و تجارت، اجارہ، نوکری و مزدوری ہیں جب کہ ان میں کوئی دھوکہ فریب اور مجبوری موجود نہ ہو۔ بیع و تجارت میں ظاہر ہے کہ ہر فریق کو اس کا حق کسی جنس یا نقدی کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ دھوکے فریب اور مجبوری کی شکل میں ایک فریق کے حق میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اجارے کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کو اس کا حق نقدی وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ جمالت اور مجبوری کی وجہ سے بعض دفعہ ایک فریق کی کچھ حق تلفی ہو جاتی ہے۔ اور نوکری و مزدوری کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک دفعہ کو اس کا حق نقد وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت اور خدمت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ ایک فریق اپنی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کو اس کا پورا حق نہیں ملتا۔ ہر حال اصول اور بنیادی طور پر یہ مذکورہ معاملات ایسے ہیں کہ ان میں ہر فریق کو اس کا حق کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ لہذا یہ عدل کے مطابق ہیں اور اسلام کے نزدیک جائز و درست۔

باطل و ناجائز معاملات کی مثال ربا، قمار، رشوت اور مخاہبرہ کے معاملات ہیں، کیوں کہ ان میں ایک فریق کی ضرورت تلافی واقع ہوتی ہے اور اس کا مال دوسرا ناحق طور پر ضرور لیتا ہے۔ ربا میں قرض دینے والا فریق، مقرض فریق سے اپنے اصل مال پر جواز نہ لیتا ہے اس کا اس کی طرف سے مقرض کے لیے کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا۔ لہذا وہ بلا عوض اور ناحق دوسرے کا مال لیتا ہے۔ گویا ایک فریق کی حق تلفی اس معاملے کی ماہیت اور بنیادی ساخت میں موجود اور اس کی حقیقت کا جز و لاینفک ہے۔ میسر و قمار کے معاملے میں بھی جیتنے والا فریق ہارنے والے فریق سے جو مال لیتا ہے اس کا کوئی مفید عوض ہارنے والے کے لیے موجود نہیں ہوتا جو جیتنے والے کو اس کا حق دار بناتا

ہو۔ لہذا وہ دوسرے کا مال ناحق طور پر لیتا ہے اور یہ چیز اس معاملے کی ماہیت میں داخل ہے۔ رشوت کے معاملے میں بھی ایک فریق کی ضرورت تعلق واقع ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں حاکم یہ طور رشوت جو مال لیتا ہے اُس کا اُس کی ذات کی طرف سے کوئی عوض موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح حاکم رشوت کی وجہ سے جس حق دار کا حق دوسرے کو دلوں آتا ہے دوسرے کی طرف سے اُس کا عوض موجود نہیں ہوتا لہذا اس معاملے کی ماہیت میں ایک فریق بلکہ دو فریق کی حق تعلق یہ طور جُز کے شامل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مخابره و مزارع کا معاملہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس میں بھی مالک زمین کاشت کار سے جو لیتا ہے اُس کا مالک زمین کی طرف سے کاشت کار کے لیے کوئی ایسا عوض موجود نہیں ہوتا جو اُسے اس کا حق دار ٹھہرنا ہو، کیوں کہ زمین استعمال ہونے سے نہ صرف یہ کہ مالیت میں کم نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ مالیت میں کچھ بڑھ جاتی ہے۔ جب کاشت کار ہجر زمین کو آباد کرتا اور اُسے خوب کھاد وغیرہ دیتا ہے۔ لہذا زمین جب مالک کی طرف لوٹتی ہے تو اُس کی حیثیت ویسی ہی ہوتی ہے جو سود خور کی طرف لوٹنے والی اصل رقم کی ہوتی ہے۔ اُس کی حیثیت کرایہ و اجارہ پر دی ہوئی ایسی چیز کی نہیں ہوتی جو استعمال ہونے سے گھسٹی اور پرانی ہوتی اور اس کی مالیت اور قیمت ضرور گھسٹی ہے، اور چوں کہ یہ معاملہ اپنی ماہیت و حقیقت کے لحاظ سے ربوہ کی طرح ہے لہذا بعض احادیثِ نبویہ میں اس کو صریح طور پر ”ربوہ“ کہا گیا اور اُس کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے بعینہ وہی دھمکی ہے جو ربوہ کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے قرآن مجید میں ہے یعنی اللہ و رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ۔ مستدرک حاکم میں حضرت جابرؓ کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یوں ہے۔ جب سورہ بقرہ والی تحریم ربوہ کی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مخابره کو نہ چھوڑے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے جنگ کر رہا ہے۔

اسی طرح مختلف احادیثِ نبویہ میں بیع کی جن قسموں اور شکلوں سے منع فرمایا گیا ہے جیسے بیع محاقہ، بیع مزاہر، بیع منابذہ، بیع طامسہ، بیع مخاطوہ، بیع الجازفہ، بیع الحصاة، بیع عُربان، بیع عینہ، بیع الغمر، بیع المضامین، والملائق، بیع جبل الجبلہ، بیع السنین، بیع الکالی بالکالی، بیع الحيوان بالعلم، بیع الثمار قبل ان يبدؤ صلاحها، بیع وسلف اور بیعتین فی بیعۃ وغیرہ۔ ان بیوع کی حقیقت کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو اُن کے اندر ربوہ یا میسر و تمار کا کچھ رنگ نظر آتا اور ایک فریق کی حق تعلق کا اگر یقین نہیں ہوتا تو غالب ظن اور قوی احتمال ضرور ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ عموماً باہمی نزاع اور جھگڑے کا باعث بنتے اور بدامنی و بے چینی پیدا کرتے ہیں لہذا اسلام نے ان کو ممنوع و ناجائز ٹھہرایا ہے۔

(۵) معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس پر عمل کا کامل ترین اور روشن نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ احادیث بتاتی ہیں کہ اعلانِ نبوت کے بعد آپ نے معاش کے سلسلے میں ہمیشہ تجارت یعنی بیع و شراء کا مشغلہ اختیار فرمایا جس میں انتہائی درجے کی دیانت و امانت بھی تھی اور سماحت و خوش معاملگی بھی، اور یہ وہ معاملہ ہے جس کے حلال و جائز اور مستحسن و مستحب ہونے کی قرآن مجید میں صراحت ہے۔ اسی طرح آپ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ہمیشہ ربوہ اور میسر سے دُور رہے بلکہ جس معاملے میں ربوہ اور تمار کا شبہ اور شائبہ بھی تھا اُس کو بھی کبھی قریب نہ آنے دیا، آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو زمینِ مخابرہ و مزارعہ پر دی اور نہ کبھی کسی سے لی یہود و غیرہ کے ساتھ جو معاملہ ہوا تھا وہ بہ قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزاحمت کا معاملہ نہ تھا بلکہ غیر مسلم ذمیوں کے ساتھ بیت المال کے لیے خراجِ مقاسمت کا معاملہ تھا جو معاشی ہونے کے ساتھ ایک طرح کا سیاسی معاملہ تھا نیز آپ نے کبھی کسی ضرورت مند کو اپنی کوئی چیز کرایے و اجارے پر نہ دی بلکہ صدقہ اور مہبہ کے طور پر بلا معاوضہ دی۔ اسی طرح آپ نے کبھی کسی کو مالِ مشاربت پر نہ دیا بلکہ ضرورت مند کو صدقہ اور قرضِ حسنہ کے طور پر دیا جو احسان پر مبنی اور مستحب تھا۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے جب آپ کی عمر مبارک تقریباً پچیس برس تھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت پر نہ تھا بلکہ متعین اُجرت پر تھا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تجارتی مال اور اُن کے غلام میسرہ کے ساتھ جو شام کا تجارتی سفر فرمایا اُس کی اُجرت چار جوان اونٹ مقرر ہوئی تھی جو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں دو گنی تھی۔ اس روایت کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ خدیجہ پڑنے سفر شام کے لیے فلاں شخص کی اُجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ کو بھی اتنی ہی اُجرت دے جتنی وہ اُس شخص کو دے گی۔ کیا آپ اُن سے اسے بارے میں بات کر پالندہ کریں گے؟ تو آپ نے فرمایا میں پسند نہیں کرتا۔ تو پھر حضرت ابوطالب خود حضرت خدیجہ کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نے اپنے تجارتی کارواں کے ساتھ بھیجنے کے لیے فلاں شخص کی اُجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، محمدؐ کے لیے میں چار سے کم اونٹوں پر راضی نہیں ہو سکتا تو حضرت خدیجہ پڑنے لکھا منظور ہے اگر آپ کسی دُور کے اور دشمن کے لیے کہتے جب بھی ہم اُلیہ کے لیے اور ایسے شخص کے لیے کیسے نہیں کریں گے جو آپ کا محبوب اور قریبی ہے۔

صُفَاتِ ابْنِ سَعْدٍ میں اسی سفرِ شام سے متعلق دو روایتیں درج ہیں۔ اُن میں بھی کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ معاملہ اُجرت کے ہر جائے مضاربت یعنی نفع کے ایک حصے پر طے ہوا تھا۔ اسی طرح سیرت ابنِ ہشام میں ابنِ اسحاق کی سفرِ شام سے متعلق جو روایت ہے جسے طبری وغیرہ سب نے نقل کیا ہے اس میں بھی کوئی ایسی صراحت نہیں کہ یہ تجارتی سفر متعین اُجرت پر نہیں مضاربت پر ہوا تھا بلکہ اس روایت میں متعدد ایسی چیزیں ہیں جو اس معاملے کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ اس معاملے کے متعلق مضاربت کا خیال دراصل ابنِ اسحاق کی روایت کے بعض الفاظ سے پیدا ہوا جو اس طرح ہیں: قال ابنِ اسحاق: وكانت خديجة بن خويلد امرأة تاجرة ذات شرف ومال تستأجر الرجال في مالها وتقصار بهم. أياد بشرى تجعله لهم. - خديجة بن خويلد تجارت پیشہ خاتون تھیں اور ثریفہ مال دار۔ وہ واقف کار اشخاص سے اپنے مال میں اُجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور اُن کو مقرّرہ حصّے کے عوض مال مضاربت پر بھی دیتی تھیں۔ اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت میں دو طریقوں سے کام لیتی تھیں: ایک متعین اُجرت پر اور دوسرے مضاربت سے نفع کے ایک حصّہ پر۔ لیکن کسی نے یہ سمجھ کر کہ دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر ہے یہ مطلب نکالا کہ حضرت خدیجہؓ ہر ایک سے صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کام کرایہ بھی مضاربت پر تھا، حال اُن کہ نہ دوسرے جملے کو پہلے جملے کی تفسیر سمجھنا درست اور نہ اُس سے یہ مطلب لینا درست کہ حضرت خدیجہؓ صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں، کیوں کہ دوسری روایات اور احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ وہ متعین اُجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور اُن حضرتؐ سے جو کام لیا وہ متعین اُجرت پر تھا۔ سفرِ شام کے متعلق تو ابنِ سعد کی روایت صاف بتا رہی ہے کہ وہ معاملہ چار اونٹوں کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا جب کہ دوسرے شخص سے دو اونٹوں کے عوض ہوا تھا۔ اس کے علاوہ المستدرک للحاکم اور سنن الکبیری للبیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: استأجرت خديجة رضى الله عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم سفرتين إلى الجُرش، كل سفرقة لبقطوص، حضرت خدیجہؓ نے اُجرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ مقام جُرش کی طرف سفرِ تجارت کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے بدلے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد بتایا ہے، جُرش یمن میں کسی جگہ کا نام ہے جہاں بازار لگتا تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت خدیجہؓ کے لیے یمن کی طرف بھی تجارتی سفر فرمائے جو ہو سکتا ہے کہ شام کے سفر سے پہلے کے ہوں۔



بہنقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک مرفوع حدیث بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:  
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسی من خدیجة سفوتین  
بقלוں۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا! میں نے خدیجہؓ سے دو مرتبہ متعین اُجرت پر تجارتی سفر کا  
معاملہ کیا۔ ہر سفر ایک جوان اوشنی کے عوض۔

ان روایات سے اُس مطلب کی صاف تغلیط و تردید ہوتی ہے جو ابن ہشام کی روایت کے  
بعض الفاظ سے لیا گیا اور بعد والوں نے بے سوچے سمجھے لکھنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت کے طور پر تھا۔ اگر ان حضرات  
کے سامنے اس سلسلے کی تمام روایات ہوتیں تو وہ کبھی ایسا نہ لکھتے۔

(۶) اس بحث کے تعلق سے یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
نے مضاربت کا معاملہ کبھی بھی اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ یہ معاملہ احسان کے درجے کا نہیں تھا۔  
اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اُس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ آپ ہمیشہ عدل  
کے مقابلے میں احسان کو اختیار فرماتے، لہذا آپ کسی کارباری ضرورت مند کو مال نفع کے ایک حصے  
پر دینے کے بہ جائے اس کو افضل اور بہتر سمجھتے تھے کہ اس کو مال یوں ہی یا قرض حسنہ کے  
طور پر دیا جائے۔ اسلام کے بعض دوسرے اصولوں کی رو سے جو عدل سے تعلق رکھتے ہیں  
مضاربت کا معاملہ جائز ہے، لیکن یہ جواز استحباب کے ساتھ نہیں بلکہ کراہیت کے ساتھ ہے۔  
گویا اس کے جائز ہونے کا مطلب ہے حرام نہیں، جیسے طلاق جائز تو ہے، لیکن کراہیت کے ساتھ  
، کیوں کہ اس کو اُبْغَضُ الْمَبَاهَات فرمایا گیا ہے۔

(۷) قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات میں ایک تعلیم وہ ہے جو ضرورت سے زائد اور  
فاضل مال سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ زائد از ضرورت اور فاضل مال کو جمع رکھنے کے بہ جائے  
راہِ خدا اور مصارفِ خیر میں خرچ کر دیا جائے، سورۃ بقرہ کی آیت ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ اَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ لَا يُغْنِي عَنْكُمْ كُنُوزُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يَنْفَعُوهُمْ  
”آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں فرمادیجیے  
جو ضرورت سے زائد ہو“

سورۃ التوبہ کی آیات کا ترجمہ ہے: جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے اور راہِ خدا  
میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی خبر سنائی دیجیے جس دن اُس کو جہنم کی  
آگ میں تپایا جائے گا، پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں، اُن کے پہلوؤں اور اُن کی پیٹھوں کو داغا

جائے گا یہ کہتے ہوئے کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا پس چکھو مزہ اُس کا جو تم جمع کرتے اور خزانہ بناتے رہے تھے۔

سورۃ الہمزہ میں ہے: ویل وخرابی ہے ہر اُس کے لیے جو سامنے منہ پر دوسرے کو طعنہ دینے والا اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرتے والا ہے؛ جس نے مال جمع کیا اور گین گین کر رکھتا رہا اور یہ گمان کرتا رہا کہ اُس کا مال اُس کے لیے ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ چکنا چور کر دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

صحیح المسلم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے یاد رکھ کہ تیرا اپنے فاضل مال کو خرچ کر دینا تیرے لیے بہتر اور اُسے روک رکھنا تیرے لیے بُرا و مضر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں فرمایا خوش بختی ہے اس کے لیے جس نے اپنا فاضل مال خرچ کیا اور فضول باتوں سے خود کو روکا۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث نبوی کا ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری طرف چند کلمات وحی کیے گئے جو میرے کان میں داخل ہو کر دل میں ٹھہر گئے؛ ایک یہ کہ میں اُس کے لیے دُعائے مغفرت نہ کروں جو مشرک مرا ہو، اور دوسم یہ کہ جس نے اپنا فاضل مال صحیح مصارف میں خرچ کر دیا وہ اُس کے لیے موجب خیر ہے اور جس نے رد کر رکھا وہ اس کے لیے موجب شر اور بُرا ہے اور یہ کہ ہر قدر کفاف رکھنے پر اللہ ملامت نہیں کرتا اور ناراض نہیں ہوتا۔

صحیح المسلم میں حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے: کہا کہ اس دوران کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک اونٹنی پر سوار ایک شخص آیا اور اپنی نہایت افزائشی کو دائیں بائیں گھمانے لگا جو چل نہیں سکتی تھی، اُس کی اس قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر حضور نے فرمایا: جس کے پاس فاضل سواری ہو وہ اُس پر لوٹا دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں، جس کے پاس فاضل خوراک ہو اُس کو دے دے جس کے پاس خوراک نہیں، یہاں تک کہ ہم یہ سمجھ کر جس کے پاس جو بھی فاضل مال ہے وہ اُس کا حق نہیں بلکہ اُس کا حق ہے جو اُس کا ضرورت مند ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس تعلیم کو پیش فرمانے والے کا خود اپنا اس پر کیا عمل تھا، اور صحابہ

کرام کی جو عینی شہادتیں اس بارے میں حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں اُن سے کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ جنہیں کئی سال تک خادم خاص کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف نصیب ہوا فرماتے ہیں: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایفر شیئاً بالغیہ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہ کر رکھتے تھے، یہ حدیث جامع ترمذی اور بیہقی وغیرہ میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ایک لمبی حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ألا ذرائی لا اکنز دیناراً ولا درهما ولا آخبرنا قال الغیہ، آگاہ رہو کہ میں نہ دینار جمع کرتا ہوں اور نہ درہم اور نہ کھانے کی کوئی چیز مکمل کے لیے ذخیرہ کر رکھتا ہوں۔ یہ حدیث الترغیب و الترویج میں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث نبویؐ کا مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میں اُسے راد خدا میں خرچ کر ڈالوں گا اور یہ نہیں چاہوں گا کہ تیسرے دن میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی رہے سوائے اس کے جو مجھے کسی کا قرض ادا کرنا ہو۔

بخاری اور مسلم میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو میرے پاس گھہر میں کوئی سامانِ خوراک نہ تھا سوائے جو کہ کچھ مقدار کے جو ایک چمڑے کے ظرف میں پڑے تھے۔

صحیح البخاری ہی میں حضرت عمر بن حارث رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درهما ولا دیناراً، ولا عبداً، ولا امة ولا شیئاً الا بغلته البیضاء النی کان یرکبھا وسلاصه وارضاً بجمعھا لابن السبیل صدقة۔ ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت نہ درہم چھوڑے نہ دینار، نہ غلام چھوڑا اور نہ کنیز، اور نہ ہی کوئی دوسری شے چھوڑی سوائے سفید فخر کے جس پر آپ سواری فرماتے تھے اور ایک ہتھیار کے اور ایک زمین کے جو مسافر مہمانوں کے لیے بہ طور صدقہ تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: توفي رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ودرعه مرهونة عند یہودی فی ثلاثین صاعاً من شعیر، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اُس وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض گردی تھی، غور فرمائیے یہ اُس وقت کی بات ہے جب مالِ غنیمت بڑی مقدار میں آ رہا

تھا اور آپ اپنے ہاتھ سے مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے، اصل بات یہ تھی کہ آپ کو جو حقہ ملتا اُسے جمع رکھنے کے بجائے آپ اُسے تقسیم فرما دیتے تھے اپنی ذات کے لیے کبھی فکرِ فردانہ فرمائی اور اللہ پر انتہائی توکل کا ثبوت پیش فرمایا۔

(۸) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان کا معیارِ زندگی سادہ ہونا چاہیے، یعنی خوراک، پوشاک، گھر اور گھریلو سامان وغیرہ میں متر فائے تعیش و تکلف اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے بجائے نمایاں سادگی ہونی چاہیے تاکہ اُس کا مال اس مد پر کم سے کم اور اجتماعی فلاح و بہبود کے مصارف میں زیادہ سے زیادہ خرچ ہو اور اُن برائیوں سے بھی بچ جائے جو متر فائے زندگی سے ضرور پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے کو بُری طرح بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں، غور سے دیکھا جائے تو سادہ معیارِ زندگی کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے فرد اور معاشرے دونوں کے لیے اپنے اندر بے شمار مصالح اور فوائد رکھتی ہے جو روحانی و اخلاقی بھی ہیں اور تمدنی و سماجی بھی، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ جو معاشرہ سادگی کی زندگی اختیار کرتا ہے، توازن کے ساتھ ضرورت رتی کرتا اور زندگی کے ہر میدان میں برابر آگے بڑھتا ہے۔

سادگی کی اس تعلیم پر بھی عمل کا مثالی نمونہ دیکھنا ہو تو وہ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں نمایاں صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ یہ قولِ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مدینے کی زندگی میں کبھی دو روز مسلسل آپ نے جو کہ روٹی بھی پیٹ بھر کر اور سیر ہو کر نہ کھائی، آپ کے دستِ خوان پر کبھی ایک سے زیادہ کھانا نہ دیکھا گیا، بعض دفعہ دو دو ماہ گزر جاتے اور گھر میں چولہا نہ جلتا اس لیے کہ پکانے کے لیے کچھ موجود نہ ہوتا اور صرف کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا، کبھی کبھی پڑوسی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیا جاتا، شام کے وقت عموماً فاقہ رہتا اور گھر کے سب لوگ بھوکے پیٹ سوتے۔ سُنن ابنِ ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کا ترجمہ یہ ہے: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی نے گرم کھانا پیش کیا تو آپ نے تناول فرمانے کے بعد الحمد للہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کئی روز سے گرم کھانا خلق سے ہمیں اُترا اور پیٹ میں ہمیں پہنچا تھا۔ غذا کی سادگی اور کمی کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث خاص طور پر قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَكَوْنُ رِشْنًا لِّشَبْعَانَ وَلَكِنَّهُ كَانَ يُؤَفِّرُنِي لِنَفْسِهِ۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہمیشہ خوب سیر ہو کر کھا سکتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے یعنی اپنا سامان خور و نوش بہ طورِ ایثار و ہمدردی دوسرے مساکین و فقرا کو عطا فرما دیتے تھے گویا یہ حالت اضطراری نہ تھی اختیاری تھی۔ اس کا اظہار اُس مرفوع حدیث سے بھی ہوتا ہے جس کے راوی حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہیں اور جس کا ترجمہ یہ ہے: نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھ پر یہ چیز پیش فرمائی کہ اگر تم چاہو تو بولنا کہ آپ کے لیے سونا بنایا جاتے، میں نے عرض کیا کہ میرے رب مجھے نہیں چاہیے بلکہ میری خواہش و تمنا تو یہ ہے کہ ایک دن کھاؤں اور دوسرے دن بھوکا رہوں۔ جب بھوکا رہوں تو عاجزی و زاری کے ساتھ تیرے ادا کروں اور جب کھاؤں تو تیرا شکر ادا کروں اور تیری حمد بجالاؤں، سرورِ بدو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھوکے رہ کر دوسروں کو جو کھلاتے تھے تو آپ دراصل قرآن مجید کی اس آیت پر عمل فرماتے تھے:

وَيُؤْتِرُونَ عَلَى الْفُقَهَاءِ وَتَوَكَّأَتْ بِهِمْ فَخَصَّاصَةً ۝

”اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود

اس کے ضرورت مند ہوں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس اور کپڑوں کے بارے میں صحابہ کرام کی جو روایات ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عموماً آپ کا لباس سادہ اور معمولی رہتا جیسا کہ دوسرے مساکین مسلمانوں کا، آپ نے ہمیشہ قیمتی اور رسمی لباس سے اجتناب فرمایا۔ بعض دفعہ آپ کی خدمت میں قیمتی لباس پیش کیا گیا تو آپ نے دوسروں کو عنایت فرمادیا، آپ موٹے اور کھردرے لباس کو اپنے لیے پسند فرماتے اور پہنتے، پھر کبھی ایک جوڑے سے زائد نہ تھا اور وہ بھی عموماً بیوند لگا ہوا، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں وَلَا يُطَوَّى لَهُ ثَوْبٌ۔ اور کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا یعنی صرف ایک جوڑا ہوتا تھا دوسرا ہوتا ہی نہیں تھا کہ تہہ کر کے رکھا جاتا۔ بعض روایات میں ہے کہ جن کپڑوں میں حضورؐ کی وفات ہوئی ان میں اوپر تلے کئی بیوند لگے ہوئے تھے اور پھر لباس میں یہ سادگی مجبوری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اپنی مرضی اور اختیار سے تھی۔ آپ کے پاس جو اچھا اور زائر کپڑا آتا دوسرے مساکین ضرورت مندوں کو عنایت فرمادیتے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی ضرورت کی چیزوں سے لوگوں کی ہمدردی و امداد فرماتے حتیٰ کہ آپ نے اپنے پیٹے تہ بند پر کپڑے کے بھانے چڑھے کا بیوند لگایا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سادگی اور مسکینی کی زندگی اتنی پسند تھی کہ آپ اللہ سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اللَّهُمَّ احْنِنِيْ مُسْكِينًا وَارْحَمْنِيْ مُسْكِينًا وَاشْفِرْنِيْ فِيْ زَمَرَةِ الْمَسْكِيْنِ

”اے اللہ مجھے زندہ بھی مسکینی میں رکھ اور موت بھی مسکینی میں دے اور میرا حشر

بھی مسکینوں میں کرنا۔

خوراک اور لباس کی سادگی کی طرح تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہائشی گھر بھی نہایت سادہ، معمولی اور چھوٹا سا تھا، آپ نے مسجد نبوی کے متفنن اذواجِ مطہرات کے لیے چھوٹے چھوٹے جو

مُحْرے بنوائے، نہ اُن کے صحن تھے نہ دالان۔ اور کسی حجرہ یا کمرہ کی وسعت چھ سات ہاتھ سے زیادہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں اور اتنی کم زور کہ ان میں شگاف پڑے ہوتے تھے جن سے دھوپ اندر آتی تھی۔ چھت چھپر کی طرح کھجور کی شاخوں پتوں سے بنی تھی، بارش سے بچنے کے لیے بالوں کے کبل لپیٹ دیے جاتے تھے اور اونچائی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر معمولی پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم باری باری ایک ایک شب ایک ایک گھرے میں گزارتے تھے اور دن میں لوگوں کے لیے نشست ساتھ ہی مسجد میں ہوتی تھی۔ ان گُجروں کے علاوہ اُوپر ایک چھوٹا سا بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں مُشْرَبہ کہا گیا ہے، لکھا ہے کہ آپ نے جب ایلا کیا نیز گھوڑے پر سے گرے کہ جب چوٹ آئی تھی تو ایک مہینہ اسی مشربہ میں اقلت فرماتی تھی، اس کمرے میں جو فرنیچر اور گھر یو سامان تھا وہ صرف یہ کہ ایک چٹائی یا بان کی چار پائی جس پر لیٹنے سے جسم پر نشان پڑ جاتے تھے، چڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور ادھر ادھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں اور بس، روشنی کے لیے چراغ تک موجود نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر دھاری دار رنگین پردہ لٹکا دیا تو حضور ﷺ دیکھ کر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہمیں اینٹ پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے اور اُسے اُتر دیا۔

(۹) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے درمیان معیارِ معیشت اور منظرِ معیشت میں زیادہ سے زیادہ مساوات و یکسانی ہونی چاہیے۔ اس کی کچھ وضاحت یہ کہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ تو جائز ہے کہ معاشرے کے بعض افراد کے پاس مال زیادہ اور بعض کے پاس کم ہو، کیوں کہ مال کمانے کی دماغی جسمانی صلاحیتیں اور قوتیں سب انسانوں کے اندر برابر و یکساں نہیں بلکہ ان میں نمایاں فرق و اختلاف اور کھلی تفاوت ہے لہٰذا اس کے نتیجے میں بعض انسانوں کے پاس رزق و مال کم اور بعض کے پاس زیادہ ہونا قدرتی امر ہے۔ اور چوں کہ رزق و مال کے اس فرق و تفاوت کے ساتھ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی گوناگوں مصلحتیں و اہلست ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، سورۃ النحل میں ارشادِ رب العزت ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۝

”اور اللہ نے تمہارے بعض کو بعض پر رزق میں

فضیلت و برتری دی ہے“

اور سورۃ الرعد میں فرمایا:

اَللّٰهُ يَبْطِطُ الرِّزْقَ لِمَن يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۝

”اللہ کھلا کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے“

یہ اور اس مضمون کے متعدد قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان رزق و مال کی کمی بیشی کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور اس کا موجود رہنا انسانیت کے لیے مفید اور ضروری ہے، غرض یہ کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ معاشرے کے سب افراد کے پاس رزق و مال برابر و مساوی ہو، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ معیار زندگی اور ظواہر معیشت میں زیادہ سے زیادہ برابری و یکسانی ہو یعنی ایک تو یہ کہ معاشرے کا کوئی فرد بنیادی معاشی ضروریات سے محروم نہ ہو جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان نا اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طور پر ادا کر سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی معیار پر ہمیشہ غذا، لباس اور مکان ضرور میسر ہو، اور دوم یہ کہ ان ظاہری چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو سکے مساوات و برابری ہو، اور اسلام یہ اس لیے چاہتا ہے کہ جس معاشرے کے بعض افراد بنیادی معاشی ضروریات ہی سے محروم ہوں اُس میں دیر سویر ایسے حالات ضرور رونما ہو کر رہتے ہیں جن سے پورا معاشرہ بد امنی و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کسی کو پائیدار امن و اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسی طرح جس معاشرے کے بعض افراد کا معیار زندگی بہت اونچا اور بعض کا بہت پست ہو، بعض کے دسترخوان پر قیمتی کپڑے، نفیس کھانے اور بعض کے دسترخوان پر رُڑکھی ٹوکھی روٹی ہو، بعض کے پاس مختلف قسم کے قیمتی و فاخرانہ لباس و کپڑے کثیر تعداد میں ہوں اور بعض کے پاس برائے نام سادہ قسم کے ایک دو جوڑے ہوں، اسی طرح بعض کے پاس قیمتی فرنیچر سے مرقع شان دار بیگلے اور کوٹھیاں ہوں اور بعض کے پاس ضروری سامان کے بغیر کچے مکان و چھوٹے ہوں ایسے معاشرے میں طرح طرح کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مفاسد جنم لیتے اور اس کو کھوکھلا و برباد بنا کر تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیتے ہیں مثلاً اِس ماندہ افراد میں سے جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، بعض حدود و بغض میں مبتلا ہو کر جلتے رہتے اور اوپر والوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض رشک میں مبتلا ہو کر اپنے پست معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب جائز طریقوں سے اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو حرام و ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں جن سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی اور بے چینی پھیلتی ہے۔ اسی طرح اونچا معیار زندگی رکھنے والوں کے اندر فخر و غرور پیدا ہوتا ہے اور وہ نچلے معیار زندگی والوں کو حقارت سے دیکھتے اور اُن کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں، نیز اُن کے اندر دُراتیاں جنم لیتی ہیں جو اُنچے معیار زندگی کا غاصہ ہیں، اور چوں کہ یہ تمام خرابیاں اور بُرائیاں افراد معاشرہ کے اندر اس صورت میں پیدا نہیں ہوتیں جب اُن کے درمیان مظاہر معیشت اور معیار زندگی میں فطری مساوات ہو لہذا

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مقدار مال کی کئی بیشی کے باوجود افراد کے معیار زندگی میں مساوات و یکسانی ہوئی جائے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب جان داروں اور سب انسانوں کا رب اور رزاق ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر جان دار اور ہر انسان کو رزق اور سامان پرورش ملے، نیز جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام اشیاء بنی نوع انسان اور سب انسانوں کے انتفاع و استفادہ کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور سب کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا مساوی حق ہے، اور پھر وہ آیات جن میں طعام، لباس اور مسکن کا سب انسانوں کے لیے بطور ایک نعمت خداوندی کے ذکر ہے، اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نوع انسان کے ہر فرد کو رزق اور سامان معیشت بہ صورت غذا، لباس اور گھر ضرور ملنا چاہیے اور کوئی اس سے محروم نہ رہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کی جن آیات میں مال دار ہونے پر اترانے اور فخر کرنے، اپنی تو نگری کا دوسروں پر رعب جمائے اور ظواہر معیشت کے ذریعے اپنی دولت و ثروت کا مظاہرہ کرنے کی مذمت اور مبالغت ہے، جیسے وہ آیات جن میں قارون، اس کی نمائش مال و دولت اور پھر اُس کے انجام بد کا تذکرہ ذقہ ہے، اس کا اتفاق کرتی ہیں کہ جن کے پاس زیادہ مال و دولت ہو وہ معیار معیشت کے ذریعے اس کا اظہار نہ کریں اور خوراک، پوشاک اور رہائش وغیرہ میں ایسے معیار زندگی سے بچیں جسے معاشرے کی عظیم اکثریت آسانی کے ساتھ نہ اپنا سکتی ہو۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث میں یہ تعلیم ہے کہ افراد معاشرہ کے درمیان معیار زندگی میں مساوات ہونی چاہیے اُن میں سے ایک نہایت واضح حدیث وہ ہے جس میں آپ نے غلاموں کے آقاؤں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جو خود کھاتے ہو اُن کو بھی کھلاؤ، جو خود پیتے ہو وہ اُن کو بھی پیناؤ اور معیشت کی ظاہری چیزوں میں اُن سے کوئی امتیاز نہ برتو، چنانچہ اس مبارک ہدایت پر عمل ہوا اور نتیجہ نکلا کہ حضرت عثمان غنی، اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسے غنی و متمول صحابہ کرام شہب اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو اجنبی پہچان نہ سکتا کہ ان میں آقا کون ہے اور غلام کون، کیوں کہ معیار معیشت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہ نظر آتا تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں سب مسلمانوں کے مکان تقریباً ایک ہی جیسے مٹی پتھر سے بنے ہوئے کچے مکان تھے، بعض دفعہ کسی نے اپنے مکان میں امتیازی شان پیدا کرنے کی کوشش کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو دیکھ کر اس امتیازی شان کو ختم کر دینا پڑا۔ بمعطربانی کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: عن ابی العالیۃ ان العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بنی غرفۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم



اَھِرُ مَھْأَ، فَقَالَ اَھِرُ مَھْأَ، وَاقْتَصَرَ بِشَھْمَاہِ فَقَالَ اَھِرُ مَھْأَ۔ حَقْرَبُ ابْنِ الْعَالِیْہِ رَوَاہُتَہُ  
کہ حضرت عباسؓ نے اپنے مکان پر خوب صورت بالاخانہ بنایا جو امتیازی شان کا حامل تھا۔ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا اسے گرا کر منہ دم کر دو، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! گرا  
دوں یا اس کی قیمت صدقہ کر دوں تو آپؐ نے فرمایا گرا دو۔

سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ایک اور حدیث ہے جس کا مضمون اس طرح ہے:  
النصارِ مدینۃ میں سے ایک نے اپنے گھر کے دروازے پر اونچا سا قُبْرَہ بنوایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں  
سے گزر رہا تو دیکھ کر پوچھا یہ کس کا مکان ہے بتلایا گیا کہ فلاں کا، آپؐ سُن کر خاموش ہو گئے، لیکن دل سے  
ناراض ہوئے، پھر جب حسبِ معمول وہ صحابیؓ مجلسِ مبارک میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا تو حضورؐ  
نے اُن سے منہ موڑ لیا اور جواب نہ دیا لہذا انھیں محسوس ہوا کہ حضور کسی وجہ سے ناراض ہیں، پوچھنے پر  
بعض صحابہؓ نے زَیْن کو بتایا کہ اس ناراضی کی وجہ دُقبْرہ ہے جو آپؐ نے بنایا ہے۔ وہ یہ سُن کر گھر گئے اور اس  
قُبْرہ کو فوراً سمار کر دیا، پھر ایک موقع پر جب حضورؐ کا وہاں سے گزر رہا تو قُبْرہ دیکھ کر پوچھا تو بتلایا گیا کہ اس  
کے مالک کو جب آپؐ کی ناراضی کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اُس کو گرا دیا۔ اس پر حضورؐ خوش ہوئے اور  
اس صحابیؓ کے حق میں دُعا فرمائی، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُس قُبْرہ کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: اس قسم  
کی عمارت اُس کے مالک کے لیے قیامت کے دن وبال بنے گی۔ یہ ہر حال اس قسم کی احادیث کا ایک مطلب  
یہ بھی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان رہائشی مکانات میں بھی  
یکسانی دہرا برزی ہوئی چاہیے تاکہ مکانات کے ذریعہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر و مباہات کا اظہار نہ کر سکیں۔  
ابن باریؒ نے کتابِ نسب کے پاس سامانِ معیشت ہو اور یکسانی کے ساتھ ہو اُس حدیثِ نبویؐ کا  
ذکر بھی فروری ہے جو امام بخاریؒ نے کتابِ الشُّرَکَہ میں نقل فرمائی ہے اور جو اس طرح ہے: عن ابی موسیٰ  
قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الاشعرۃ یشیع اذا ارسلوا فی القرد، و اقل طعام عیالہم  
بالمدينة جمعوا ما عندہم فی ثوب واحد ثم اقتسموه بینہم فی اناہ واحد بالسویۃ،  
فعم حق و انا نرہم۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبیلہ اشعرہ  
لوگوں کا یہ طریقہ اور طریقہ عمل تھا کہ جب جنگ کے موقع پر خوراک کی کمی محسوس کرتے، یا مدینہ میں بحالتِ  
امن قحط وغیرہ کی وجہ سے اُن کے سامنے کمی خوراک کا مسئلہ کھڑا ہوتا تو وہ اپنا سب بچا کھچا سامانِ خوراک  
ایک جگہ ایک کپڑے پر جمع کرتے اور پھر اس کو ایک پیمانے سے اپنے درمیان برابر برابر تقسیم کر لیتے، اور  
فرمایا وہ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں۔

اس حدیثِ مبارک کے آخری الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ اور لائقِ اعتنا ہیں۔ ان کا تعلق

اشد علیوں کے جس طرز عمل سے ہے وہ ان کے اندر قبل از اسلام چلا آ رہا تھا، اس طرز عمل کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق یہ فرمانا ”مَعْمُومٌ مَّيْتٌ“ آنا مستعجب ہے، اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طرز عمل آپ کے نزدیک صحیح اسلامی طرز عمل اور بے حد محبوب تھا اور اس فرمانے سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی اپنی زندگی میں یہی طرز عمل اختیار کریں۔

پھر امام بخاریؒ نے اسی کتاب الشکر میں ایک فعلی حدیث بھی بیان فرمائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غزوے میں حضور نبی اکرمؐ نے بھی یہی طرز عمل اختیار فرمایا۔ جب صحابہ کرامؓ نے قلتِ خوراک کی شکایت پیش کی، آپؐ نے منادی کرائی کہ جو جس کے پاس سامانِ خوراک رہ گیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے جب جمع ہو گیا تو آپؐ نے برکت کی دعا کے بعد فرمایا کہ سب اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لیں، چنانچہ سب نے اپنے اپنے برتن و نوشہ دان بھر لیے اور اُس کے بعد بھی کچھ بچ گیا، پھر امام بخاریؒ نے اسی باب میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے متعلق بھی ایک اثن بیان فرمایا کہ ان کو بھی جب ایک غزوے میں ایسی ہی صورت حال پیش آئی تو یہ حیثیت سردار لشکر اور سپہ سالار کے آپؐ نے لشکریوں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو بھی سامانِ خوراک ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے، چنانچہ جمع ہونے کے بعد آپؐ نے سب کے مابین برابر برابر تقسیم فرمایا، اس روایت کو بیان کرنے سے امام بخاریؒ کا مقصود یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوے میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ آپؐ کی ذات سے مخصوص و مختص نہ تھا۔ در نہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس کو اختیار نہ فرماتے، اور یہ کہ اس طرز عمل کا جن خاص حالات سے تعلق ہے وہ جب اور جہاں بھی پاتے جاتیں مسلمانوں کے سردار و سربراہ پر لازم ہو گا کہ وہ اس سنتِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ طرز عمل اختیار کرے۔

(۱۰) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی اخراجات میں اسراف و تبذیر سے بچے یعنی نہ اپنے مال کو غلط اور بے جا مصارف میں خرچ کرے اور نہ جائز و صحیح مصارف میں خرچ کرتے وقت حدِ اعتدال سے آگے بڑھے، کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جس اسراف سے رد کا اور جس کے مرکب کو مجرم و گنہگار ٹھہرایا ہے کیف و کم کے لحاظ سے اُس کی دو قسمیں ہیں، کسی حرام چیز اور ناجائز کام میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی کم اور تھوڑا کیوں نہ ہو باعتبار کیف کے اسراف ہے، اور کسی صحیح اور مشروع مصرف میں حدِ اعتدال اور قدر پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، باعتبار کم کے اسراف ہے اور دونوں حرام و ناجائز ہیں، مثلاً شراب و دیگر نشہ آور اشیا، مُردار، لُچ خنجر، چھتے و مورتیاں، مردوں کے لیے لیشی لباس اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ، مہو و لعب اور موسیقی کے آلات، نیز مچوئے لاٹری، کسی کا حق مارنے کے لیے حکام کو رشوت وغیرہ، حرام و ممنوع چیزوں اور

کاموں میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی معمولی ہو اسراف کی تعریف میں آتا ہے، اسی طرح طعام و خوراک لباس و پوشاک اور مکان و فرائض، ضروری سواری پر حد سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف کے تحت آتا ہے۔ اور پھر یہ دوسرا اسراف تفاخر کے جذبے اور اپنی شان و دولت مندی کے اظہار کی غرض سے ہو تو وہ دگرگانہ جرم بن جاتا ہے۔ فقہانے لکھا ہے کہ بغیر کسی دینی مصلحت اور مہمان کی ضیافت کے ایک سے زیادہ کھانے پکانا، نیز ضرورت دور ریختوں کی ہو اور تین پکوانا یا خریدنا، اسراف ہے، ضرورت و حاجت سے زیادہ کپڑے و لباس بنوانا جو بکھوں اور الماریوں میں پڑے پڑے فنانے و بے کار ہو جائیں اور کبھی اُن کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے، اسراف ہے، ایک سادہ مکان، لیکن جو ضرورت سے زائد ہو یعنی ضرورت دو کمروں کی تھی اور تین بنوائے یا ضرورت چار کمروں کی تھی اور پانچ بنوائے یا خرید لیے تو یہ بھی اسراف ہے۔

مقام افسوس ہے کہ مسلمان اسراف کے معاملے خصوصاً مکانوں کے اسراف کے معاملے میں اتنے زیادہ آگے نکل چکے ہیں کہ اب اُن کو اعتدال پر لانا بہت مشکل بلکہ ناممکن و محال ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ غنی و مال دار مسلمان اسلام کی اس تعلیم کو تقریباً بھول چکے ہیں جو اسراف و تبذیر سے متعلق اور اسلامی معاشیات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آج اچھے خاصے مسلمان جو نماز و روزے، زکوٰۃ کے پابند ہوں پرچ اور عمرے کرتے چلے جا رہے ہیں، تکاثر و تفاخر کے جنون میں مبتلا اور معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کر لے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر و کوشش میں منہمک و مستغرق ہیں اس کا نتیجہ وہ بدترین صورت حال ہے جس سے آج ہر جگہ مسلمان معاشرے اور نام نہاد اسلامی ممالک دوچار ہیں۔ اور علماء مصلحین حضرات کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس صورت حال کی اصلاح ہو تو کیسے ہو، کیوں کہ بعض حضرات اس کے لیے جو کوششیں فرما رہے ہیں اُن سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے بلکہ صورت حال مزید بگڑتی چلی جا رہی ہے، ضرورت ہے کہ مرض کے اصل اسباب کو پوری طرح سمجھ کر ایسا علاج تجویز کیا جائے جس کا فائدہ عارضی نہ ہو بلکہ مستقل و پائیدار ہو۔

# رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی اصلاحات

جناب محترم مولانا عبد القدوس ہاشمی

الحمد للہ و الحمد و الصلوٰۃ و السلام علی النبی الذی لانبی بعدہ  
دنیا میں ایسی تحریکیں بہت ہی کم پیدا ہوتی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہو۔ کوئی تحریک صرف ایک پہلو کو متاثر کرتی نظر آتی ہے اور کوئی تحریک دو پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور بعض تحریکوں کا تو مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہلو کی اصلاح ہو جائے۔ کوئی محض ایک پہلو مثلاً سیاسی صورت حال کی اصلاح چاہتی ہے اور کوئی بڑھتی ہوئی مادی وابستگی اور عیش کوشی سے لوگوں کو دور رکھنے کی ہدایات پر اپنا سارا زور صرف کر دینا پسند کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک رُخی اصلاحی تحریکوں میں سے چین کے بوٹھے فلسفی لاؤ زے کی تحریک تاقدمت، ایران کے عظیم المرتبت فلسفی زردشت اعظم کی تحریک، شری دھان مہا یوگی کی تحریک، چین مت اور گھور تبتیا اور مہاتما بدھ کی تحریک بُدھ مت وغیرہ ہیں۔  
اسلام ایسی کوئی ایک رُخی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں جس طرح زندگی بسر کرنے کی ہدایات دی تھیں اُن ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن مجید میں تو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ دین ہمیشہ سے اسلام ہی رہا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی تیرھویں آیت میں وضاحت کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے کہ جو شریعت تم کو دی جا رہی ہے اور جو دین تمہیں دیا گیا ہے یہ وہی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ لفظ مسلمین کے ساتھ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۷ میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔ اُن ہی نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔

ہمیں مذہبی افسانوں اور آثارِ قدیمہ کے ذریعے سے جو تاریخی معلومات حاصل ہو سکی ہیں وہ بھی یہی بتاتی ہیں کہ بنی نوع انسانی کا اولین مذہب توحید تھا۔ یعنی مومن تو تہذیب ہی انسان کا اولین مذہب ہے اور اسی عقیدے کے ماتحت انسانوں کے اعمال و حرکات میں تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ اقوامِ قدیمہ کے افسانوں میں اسمائے معرذ بدلے ہوئے تو ملتے ہیں، لیکن عقیدۂ توحیدِ کامل یا ناقص صورت میں ہر قوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد قوموں نے صفاتِ الہی کی تجسیم کی یا مخلوقات میں صفاتِ الہی کو مرکوز کیا، اس طرح عقائد و افکار میں خرابیاں پیدا کیں اور ان افکار کے زیر اثر اعمال و حرکات وجود میں آئے۔ ہر قوم میں ہادی درہ نما آئے اور انھوں نے ازل عقائد کی اور پھر اعمال کی اصلاح کی۔

چوں کہ انسانی اعمال کا ایک بڑا بلکہ بہت بڑا حصہ انسان کی معاشی جدوجہد ہوتا ہے، اس لیے لازمی طور پر خرابیاں سب سے زیادہ اُس کے معاشی اعمال میں نمایاں ہوئیں۔ عقائد کی خرابی کا اثر انسان کی اُن حرکات پر پڑا جو ایک آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیے کرتا ہے، معاملات میں دھوکا، فریب، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، چوری اور جیب تراشی وغیرہ، یہ سب انسان کے عقائد کی کم زوری اور خالق کائنات پر کامل اعتماد کے فقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھتا ہے کہ وہ محنت کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور دے گا۔ اور اگر اس کا یہ بھی یقین ہے کہ اس کو اپنا اعمال کے لیے ایک دانا ویدنا اللہ جن جلالہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے تو اس کی معاشی جدوجہد، اس قسم کے اعمال کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ اجتماعِ نوعِ انسانی کے پھیلاؤ کا وسیع ترین دور تھا۔ مشرق و مغرب میں تجارتی تعلقات پوری طرح قائم ہو چکے تھے۔ ساری دنیا کے لوگوں میں مقامی اور بین الاقوامی لین دین ہونے لگے تھے۔ دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں اور بادشاہیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ شان و شکوہ اور اسراف و تبذیر کی بدترین صورتیں موجود تھیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا دین اسلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت پھر سے اور مکمل صورت میں قائم کی جائے تو عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ معاشی جدوجہد اور معاملات کی بھی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی طرف پوری توجہ نہ دی جاتی تو انسانیت کا بڑا نقصان ہوتا اور دینی نظام ناقص کا ناقص رہ جاتا، اس لیے آخری پیغمبر اسلام نے عقائد و عبادات کے بعد سب سے زیادہ توجہ معاشی اصلاحات کی طرف مبذول فرمائی۔

## معاشیات کی اہمیت

معاشی اصلاحات پر گفت گو کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی اعمال میں معاشی جدوجہد کو کیا مرتبہ دیا جائے؟ کیا تقرب الہی حاصل کرنے کے لیے معاشی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر مٹھوں، دیباڑوں اور خالقانہوں میں بیٹھ رہنا ضروری ہے، یا تعذیبِ نفس کرنا، ترکِ دنیا کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا مفید ہے؟ انسان نے یہ صورتیں پیدا کر رکھی تھیں، حال آں کہ اسے خبر تھی کہ یہ ساری صورتیں فطرت کے خلاف جنگ کی ہیں۔ سارے انسان تو کیا ایک فرد واحد بھی پوری طرح ترکِ دنیا

نہیں کر سکتا، وہ اگر صرناشین ہو جائے گا پھر بھی اس کے گرد پیش دنیا ہی ہوگی، وہ معاش کے معروف طریقوں کو چھوڑ بھی دے گا تو بارش، دھوپ اور سردی سے بچنے کے لیے کسی کھوہ اور غار کی ضرورت باقی ہی رہے گی۔ وہ پیاسا بجھانے کے لیے چشمہ آب تک ضرور جائے گا اور ٹھوک میں جنگلی پھل ضرور چڑھے گا۔ وہ دہارا میں رہ کر بھیک پر گزرا تو کرے گا، لیکن بھیک دینے والوں کو بھیک دینے کے لیے معاشی جدوجہد کرنی ہی پڑے گی۔ ایک بزرگ کسی خانقاہ میں چلہ دمراقبہ تو کریں گے، لیکن ان کے لیے ضروریات زندگی بہت سے مریدوں کی معاشی جدوجہد ہی سے مہیا ہو سکیں گی۔

انسان نے اپنی نادانی سے جو بر تصور قائم کر رکھا تھا کہ معاشی جدوجہد تقرب الہی کے راستے میں حائل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کی، اور بار بار یہ وضاحت فرمائی کہ معاشی جدوجہد کا مرتبہ عبادت الہی کے برابر ہے، بلکہ کسبِ حلال خود اپنی جگہ پر ایک عبادت ہے۔ بندہ مومن کو روزی کمانے کا ذریعہ فائدہ ہی نہیں بلکہ آخری ثواب بھی ملے گا۔ کسبِ حلال اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی مصیبت اور گناہ ہے۔ معاشی جدوجہد تقرب الہی کی راہ میں حائل نہیں بلکہ تقرب الہی کا ذریعہ ہے۔ ایک بندہ مومن حلال مال کے لیے جو محنت کرتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اللہ کا پیارا اور حبیب ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

(۱) جو ایک پودا بھی زمین پر لگا گا ہے وہ نیک عمل کرتا ہے جس کے صلے میں وہ جنت کے باغوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ (زراعت)

(۲) ایمان دار تاجر قیامت کے دن عرشِ اعظم کے سلسے میں جگہ پائے گا۔ (تجارت)

(۳) محنت اور مزدوری کر کے حلال روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا حبیب دوست ہوتا ہے (محنت)

اسی طرح رزق حاصل کرنے کے جتنے ذرائع جائز ہیں، ان سب کی تعریف فرمائی۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان ذرائع کو اختیار کریں اور رزقِ حلال حاصل کریں۔ یہی خالق کائنات کا حکم ہے اور انھیں صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بڑا صلہ ملے گا۔

## صرف دولت

دوسرا اہم سوال جو کچھ ہم کیا ہیں اُس کے صرف کرنے کا ہے۔ انسان کی ضروریاتِ ادران کی تکمیل کے لیے دولت کی پیدائش، یہ ایک اہم سوال ہے۔ انسان نے اس میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرۂ انسانی میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ضروریاتِ انسانی کی اگر صحیح تنویب و تقسیم کی جائے تو حسبِ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) ضی و ریاتِ زندگی :- یعنی ایک انسان کو اپنی اہل و عیال کی زندگی کے لیے جن چیزوں

کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً غذا، پانی، مکان، لباس، دوا وغیرہ وغیرہ۔

(۲) ضروریات کا کس دگی: یعنی ایک آدمی کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کے لیے بیل، ٹریکٹر وغیرہ، صنعت کار کے لیے اوزار، آلات وغیرہ، تاجر کے لیے گودام اور سائبان وغیرہ۔

(۳) ضروریات توانائی یا ارجاع توانائی: یعنی آدمی اپنی حرکات میں اور جدوجہد میں اپنی توانائی کا جو حصہ صرف کرتا ہے، اس کے پھر سے واپس لانے کی تدابیر کے سلسلے میں جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں مثلاً سیر، تفریح، ورزش وغیرہ۔

ان تینوں اقسام ضرورت کو شریعت اسلامی نے قبول کیا ہے۔ اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کو محمود اور قابلِ تعریف قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی راہ مستقیم پر رہنے کے سلسلے میں بہت سی ہدایات دیں مثلاً کھانے پینے میں حرام و حلال کی پابندی قائم رکھو۔ ایسا مکان نہ تعمیر کرو جو ضرورت سے زائد ہو اور جس میں سکونت مقصود ہی نہ ہو۔ جب خود کھاؤ، پیو تو یہ یاد رکھنا کہ ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔ مسائل اور محروم کے حق سے غافل نہ ہو جاؤ۔ قربت داروں کے حقوق و ضروریات یاد رکھو اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرتے رہو۔ وغیرہ۔

ان تینوں مباح ضروریات زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال کا دامن چھوٹنے کے بعد کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے معلوم کرنے کے لیے کسی کو عظیم مفکر یا فلسفی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ذی ہوش اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر یہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ بے اعتدالی کی کس درجہ سے کس قدر رشک و حسد، مفاہمت اور دشمنی اور سب سے زیادہ معاشی ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ شداد کی طرح لوگ جنتِ ارضی تعمیر کرنے اور مبارک درہم کی طرح سو رنگ بھون بنانے کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ رنگ محل کی تعمیر اور پانی محل بنوانے میں کتنے مزدوروں سے بغیر ادائے اجرت بیگار لی گئی۔ شہزادی کلو پٹرا، روم کی ملکہ اور خود مسلمان شہزادی شجرۃ الدر کے ملبوسات کی تیاری میں کاریگروں پر کیا گزری۔

ان تینوں ضروریات کے علاوہ آدمی دو اور قسموں کے ماتحت اپنی دولت کو صرف کرتا ہے قرآن مجید نے ان دونوں صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم اہلی ان کی ممانعت کی اور لوگوں کو اس سے بچایا۔ یہ دونوں صورتیں اصطلاح قرآنی میں اسراف اور تبذیر کہلاتی ہیں۔

(۱) اسراف یہ ہے کہ جہاں پر جتنی خرچ کی ضرورت ہو، اس سے زیادہ خرچ کیا جائے، چاہے وہ

کام اچھا ہی ہو، قابلِ تعریف ہو مگر اس میں ضرورت سے زائد خرچ اسراف ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: میں کیا وضو کرنے میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا:

ج ۱۔ ہاں اگرچہ تم ایک ہستی ہو مگر اللہ ہی کے کنارے پر وضو کر رہے ہو۔

جواب بالکل وضو جیسے عمل عبادت میں بھی پانی نہ درت سے زیادہ صرف کیا جائے تو یہ عمل اسراف ہوگا۔ اور اسراف کی تلقین نے قرآن مجید میں عربی ممانعت فرمائی ہے لیکن اس جواب کی ممانعت پر غور کیجیے فن معاشیات کا ایک سوال اس سے حل ہو جاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ رسد اگر کثیر ہو تو کیا طلب کو بھی بڑھا دینے کی اجازت ہے؟ میں تو کوئی ماہر معاشیات نہیں، ایک ماہر معاشیات اس کے خطر سے بے پوری طرح واقف ہے کہ طلب کی زیادتی کا اثر قیمتوں پر، دوران زرخیز اور افراط زرخیز پر کیا پڑے گا۔

(۲) ناجائز خرچ و اخراجات کی دوسری قسم تبذیر ہے۔ لغت میں تبذیر کے معنی ہیں کھیتوں میں بیج کا پھٹنا اور پانی کو ایسا گندہ کر دینا کہ پانی کا رنگ بدل جائے۔ اصطلاح شرعی میں اس کے معنی ہیں مال کا بیجا صرف کرنا، اپنے اس خرچ کی نمائش کرنا، اور اس پر فخر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عملی تبذیر سے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شدت کے ساتھ ممانعت کی، بلکہ لوگوں کی عادتوں کو بدل دیا۔ ہمیں دولت مند صحابہ کرام مثلاً حضرت سعد بن عبادہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اعمال میں کہیں تبذیر کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

ان پانچوں عمل اخراجات کی آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعے پوری طرح وضاحت کی، اور جائز و ناجائز اخراجات و مصارف کے مابین ایسا خط فاصل کھینچ دیا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ لکھ پتی باپ کے لکھ پتی فرزند بھی اپنی خلافت و جلالت کے دور میں بیرونہ لگا ہوا کرتا ہوں کہ سرگ پر چلنے اور مسجد میں نمازوں کی امامت کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے، حال آں کہ ان سے پہلے کے خوش حال لوگ جو دولت و جلالت میں ان سے بدرجہا کم تر تھے، اعلیٰ درجے کا لباس اور قیمتی چادر و دوش پر ڈالے بغیر نکلنے میں شرماتے تھے۔ ابو جہل بن شریحیل، ابولہب بن عبدالمطلب اور جہل بن ابیہم کبھی یہ نہیں برداشت کرتے تھے کہ گھٹیا لباس میں لوگوں کے سامنے آئیں۔ یہودی دولت مند، ابوالحقیق، عبداللہ بن ابی، حتی بن اخطب ہمیشہ اپنی دولت کے مظاہرے کیا کرتے تھے۔ اور جاہلی معاشرے کی ہمیشہ سے یہی کیفیت تھی کہ اسراف و تبذیر پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی عرب شاعری کا سارا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ وہ کس طرح اسراف و تبذیر میں مبتلا تھے۔

### پیدائش دولت

صرف دولت کی اس مختصر سی بحث کے بعد ہم جب پیدائش دولت پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ



اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاحی ہدایات دیں اور ان پر جس پابندی کے ساتھ عمل کرایا اُس نے معاشیات کی بگڑی ہوئی شکل کو اصلاحات کے ذریعہ سے سنوار کر خوش نما بنادیا۔ درنہ حرص کے داغ سے پیدا شدہ دولت کی جہر و جہد کا چہرہ ہمیشہ گھناؤنا رہا ہے۔

آج کل فین معاشیات میں عوامل پیدا شدہ دولت چار یا پانچ بتائے جاتے ہیں۔ یہ محض دقت پسندی ہے حقیقتاً زمین پر عامل پیدا شدہ دولت اور نہ زمین منتظر اور نہ حوصلہ کار بار۔ سرمایہ بچھلی کسی محنت کا غیر صرف شدہ بچا ہوا حصہ ہے اور نہ زمین منتظر و حوصلہ انسانی محنت کی ایک قسم ہے۔ حقیقی عوامل پیدا شدہ دولت صرف دو ہیں، ایک زمین اور دوسرا انسان یعنی محنت۔ اس واقعیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم جن اشیاء سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں وہ سب بلا استثناء زمین یا معاشی زبان میں اصل قائم سے براہ راست یا بالواسطہ ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور انھیں ہماری ضرورت میں کام آنے کے قابل جو طاقت بتاتی ہے وہ انسانی محنت ہے۔ اس لیے حقیقی عوامل صرف دو ہیں: زمین اور انسان۔ یہ دونوں عوامل ایسے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ تمام تر رب العلمین کا عطیہ ہیں شاید اسی حقیقت کو یاد رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اولین سورہ کی اولین آیت میں اپنا تعارف کسی اور صفت الہیہ کے ذریعہ سے نہیں کرایا بلکہ الحمد للہ صرب العلمین کہا۔ ساری تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں جو سارے عالم والوں کا پالنے والا ہے۔ اور شاید اسی لیے بار بار یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، بادل، بارش، کھیت، باغ، جانور، اور وہ لطف بھی جس سے انسان پیدا ہوتے ہیں اللہ جل شانہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس میں سے کچھ بھی بنا سکے۔ یہ عقیدہ و ایمان ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت و واقعہ ہے جس سے انکار ہٹا دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس واقعیت کے اثرات و نتائج کو دیکھیے علم المعیشت میں اس سے انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اور ہر قول مرحوم علامہ اقبالؒ

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی کسی شے میں محنت کر کے روزی کمانے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے اور جب وہ اپنی محنت سے اس شے کو ضروریات میں سے کسی ضرورت کی تکمیل کے قابل بنالے تو پھر اُس شے کا مالک ہے اور اُسے حق حاصل ہے کہ کسی کو مفت دے دے یا بتراضی طرفین اُس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اسی لیے ہدایت نبویؐ کے بہ موجب دینا یا مانگ کے پانی پر بخود رہنا یا مانگ کے پانی پر چلنا وغیرہ پر زہر چھڑکا کر یا پال کر کسی نے نہ رکھے ہوں۔ ایسے جانور اور پرندوں پر کسی شخص کا کوئی ترجیحی حق نہیں ہوتا اور کسی کو یہ حق

حاصل نہیں کہ دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے سے روکے۔

## تبادلہ دولت

ہر شخص جو کچھ زمین یا باغ سے پیدا کرے یا اپنی صنعت و حرفت سے بنائے اُس کو خود ہی خرچ کر دے، نہ ایسا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ضرورت مند تک ان تمام چیزوں کو دُور دراز سفر کر کے خود پہنچائے۔ اس لیے تبادلہ دولت کے ایسے قواعد و ضوابط ضروری ہیں کہ کاشت کار، صنعت کار یا صرف کنندہ پر ظلم نہ ہو سکے۔ اس کا بنیادی اصول قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تبادلہ دولت باہمی رضامندی سے ہو۔ ظلم و تعدی یا دھوکا و فریب کی آلودگی اسے ناپاک نہ بنادے۔ اگر کوئی تبادلہ دولت کے اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُس شخص کو سزا دیں۔ ”سورۃ المائد“ کی آیت ۳۳ میں ہر فساد کی سزا دینے کا ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ فساد کی سخت سے سخت سزا دیں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلا واسطہ یا بالواسطہ ایسی صورت پیدا کرے جس میں خریدار خریدنے پر یا فروشنہ فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی طرح ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور کسی چیز کو اُس کا نقص بتائے بغیر فروخت کرنے کی ممانعت ہے اور یہ سارے جرائم دنیا میں قابلِ سزا اور آخرت میں موجبِ عذابِ عظیم ہیں۔ ہر اُس مقام پر جہاں مسلمان با اقتدار ہوں مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ایسے مجرموں کو سزائیں دیں اور معاشرے سے ان جرائم کو دفع کریں۔

تبادلہ دولت میں اتنی اصلاحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہیں کہ ان سب کا تفصیلی بیان کسی ایک مختصر مضمون میں نہیں سہا سکتا، لیکن مندرجہ بالا حکم کے علاوہ تین احکام وہ ہیں جن کا مختصر بیان ضروری ہے:-

(۱) سلفہ کی بالکلیہ ممانعت:- فروخت کی جانے والی چیز اور اُس کی قیمت دونوں کی غیر موجودگی میں ہر بیع یا معاہدہ بیع ناجائز ہے۔ بڑی سختی سے ایسی بیع یعنی معاملہ خرید و فروخت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے بھی سڑ نہایت ہی غیر عادلانہ اور نقصان رساں معاملہ ہے۔ اس کی وجہ سے ضروری اشیاء پیدا کرنے والے کو کم سے کم قیمت ملتی ہے اور صارف کو اشیائے صرف کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت غیر منصفانہ بلکہ صریحاً ظلم ہے، اس کی آپ نے ممانعت فرمادی۔

(۲) سُود کی حُصوت:- سُود جسے عربی میں ربا کہتے ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور ہر صورت میں سُود حرام ہے، چاہے سُودی قرض لینے والے نے اسے اپنی ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہو

یا کار باری قدرت کے لیے، چاہے ربُّو الفضل ہو یعنی اصل قرض دی ہوئی رقم پر کوئی اضافہ وصول کیا جائے یا ربُّو النسیہ ہو یعنی کوئی شے فروخت کر کے یہ شرط لگا دی جائے کہ اتنی مدت کے اندر اس کی قیمت ادا نہ کی جائے تو اس قدر زیادہ رقم ادا کرنی ہو۔ سود ہر صورت میں حرام ہے۔ اور اس شدت کے ساتھ اس کی حرمت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ حرمت کا حکم آجائے کے بعد بھی سود لیں تو ان کے خلاف اللہ و رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

سود میں اضافہ بہ مقابلہ وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ یہ قانون فطرت کے بالکل برخلاف ہے۔ کسی سرمایہ میں بہ مقابلہ وقت کوئی اضافہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قانون فطرت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ سود کا ہر معاملہ ایک طرف معاہدہ ہوتا ہے اور ایک طرف معاہدہ دنیا کے کسی قدیم و جدید اصول قانون میں جائز نہیں ہے۔ سود کے ذریعہ سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر حقیقی اضافہ ہو جاتا ہے جس کا بوجھ غریب صارف پر پڑتا ہے۔ سود کی وجہ سے دولت کا ہمارا ایک خاص طبقہ کی طرف ہو جاتا ہے اور شہید معاشی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سود کی وجہ سے ساہوکارہ حاشیہ جہد و جدوجہد کی غرور محسوس نہیں کرتا اور دوسروں کی کمائی مفت کھاتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک سود خوار معاشے کا ایک بے عمل فربہ بن جاتا ہے۔ اس لیے معاشی مٹوجہ بوجہ کا یہی تقاضا ہے کہ سود کی حرمت پر زور دیا جائے اور اس لعنت سے معاشرہ انسانی کو نجات دلائی جائے۔

آں حضرت کی دیگر معاشی اصلاحات سے صرف نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو سود کے خلاف جو آیات قرآنی نازل ہوئیں اور آپ نے جس شدت کے ساتھ اس پر عمل کرایا بہت بڑی اصلاح اور معاشی نقطہ نظر سے بڑا دور رس انقلابی اقدام ہے۔

(۳) قانونِ وراثت:- قانونِ وراثت خود اپنی جگہ پر بڑی اہم معاشی اصلاح ہے۔ قدیم اقوام میں عام طور سے وراثتِ اکبر جسے انگریزی میں ہیریٹج بنش کا قاعدہ کہا جاتا ہے، رائج تھا۔ ایران میں، رومن حکومت میں، چین میں اور ہندوستان میں یہ طریقہ رائج تھا کہ باپ کی وفات پر صرف اُس کی سب سے بڑی اولاد وراثت ہوتی تھی، دوسری اولاد کو یا دارثوں کو وراثت سے محروم سمجھا جاتا تھا اور چین و ہند میں تو عورت کبھی وارث ہوتی ہی نہ تھی۔

اس نا انصافی کی اصلاح قرآن مجید نے اس طرح کر دی کہ تفصیل کے ساتھ دارثوں کے حصے مقرر کر دیے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ دولت مال دار کی وفات کے بعد خود بہ خود تقسیم ہو گئی اور بڑی بڑی جائیدادوں کے وراثتی دولت مندوں کا کابل و بلے عمل طبقہ ختم ہو گیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دو بھائیوں اور بھائی بہنوں کے مابین محبت و الفت کے رشتوں کو باقی رہنے کا موقع میسر آ گیا۔ درنہ وراثتِ اکبر اور عورتوں کی وراثت سے

بالکلیہ محدثی نے بھائی، منوں کے مابین محبت و الفت کو جس طرح تباہ کیا ہے وہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

اسلام کے قانونِ وراثت پر جن مسلم و غیر مسلم علماء سے میری گفتگو ہوئی ہے ان سب نے اس کی تعریف کی ہے ہر جہز ایک رُوسی سفیر صاحب کے، جنھوں نے فرمایا کہ دنیا میں کسی قانونِ وراثت کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کا بیان ہے کہ رُوس میں بھی قانونِ وراثت ہے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ ان کا شخصی خیال ہے جس کے قائم کرنے میں وہ یہ بھول گئے کہ قانونِ وراثت مرنے والے کی آخری تمنائی تکمیل ہے، اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی مرتے ہوئے یہ تمنائیں ہو کہ وہ جو کچھ چھوڑ کے جا رہا ہے چاہے وہ ایک پُرانا کپڑا ہی کیوں نہ ہو، اس متر و کر سے اُس کی وفات کے بعد وہ لوگ فائدہ اٹھائیں جو زندگی میں اُس کے پیارے اور قریبی رشتہ دار تھے۔

البتہ بعض مسلمان بھائیوں نے اسلامی قانونِ وراثت پر دو اعتراضات کیے۔ دو ایک حضرات نے تو صرف اس موضوع ہی پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ مختصراً اس کی توضیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ دوسرے اہل علم بھی صحیح طور پر بات کو سمجھ لیں۔

(۱) پہلا اعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں یتیم پوتے کو دواؤ کی وراثت سے محروم نہیں قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ مورث کا دوسرا بیٹا موجود ہو تو پوتہ محروم ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں دیے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض اس لیے ذہن میں آسکا ہے کہ وصیت اور وراثت کے سارے قانون پر غور نہیں کیا گیا ورنہ بات سمجھ میں آ جاتی۔ اور جب ان کے سامنے وصیت کے متعلق بتایا گیا تو مترض کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ان دو امور پر غور کیجیے۔

ہر شخص پر واجب ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو مال متر و کر کی ایک تمنائی تک پوتے یا کسی غیر وارث کے لیے وصیت کر دے۔ اور وصیت اتنی فرد کی چیز ہے کہ حسبِ فرمانِ نبوی کسی مسلمان پر ایک رات بھی نہ گزرنے پائے جب کہ اُس کا لکھا ہوا وصیت نامہ تیار نہ ہو۔

ولایت کا قبول کرنا اختیاری امر نہیں بلکہ لازمی اور اجباری ہے۔ کوئی چچا اپنے یتیم بھتیجے کا دلی بٹنے سے انکار کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر چچا کی مالی حالت کم نہ ہو اور بھتیجے کی پرورش و پرداخت کا بلوچ نہ برداشت کر سکتا ہو تو اس کی درخواست پر یتیم و مال سے مناسب امدادی وظیفہ بطور استحقاق اُسے دیا جائے گا۔ چچا پر فرض ہے کہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کی اپنی اولاد کی طرح پرورش و پرداخت کرے۔ حکومت کی نظائیر

اور عدلیہ دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چچا کو اس ولایت کے لیے مجبور کرے۔

ان دونوں احکام کو یعنی وصیت اور ولایت کو دیکھیے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ قانونِ وراثت نے یتیم پوتے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُس کو ہر طرح تحفظ عطا کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسے مرحوم باپ کا جانشین قرار دے کر وارث کیوں نہ قرار دیا گیا؟ تو اس میں بہت سی خرابیاں تھیں منجملہ ان کے دو خرابیاں تو ظاہر ہیں: ایک یہ کہ جو بیٹا مورث کا زندہ ہے وہ بغیر کسی وجہ کے آدمی وراثت سے محروم ہو جاتا اور اس امکان سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چچا کے دل میں جو یتیم بھتیجی کی محبت ہوتی ہے وہ اس کے مقابلے کی وجہ سے متاثر ہوتی، حال آں کہ پوتے کو یہ بہر حال اپنے چچا ہی کی ولایت میں جوان ہونا اور پر دان چڑھنا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی باپ کی وراثت کا مستحق ہے۔ یہ اصول ہی قائم نہیں رہتا اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً زید کے دو فرزند تھے۔ ایک حامد اور دوسرا محمود، حامد کا ایک فرزند ہے علی۔ پہلے حامد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے متردک مال میں حامد کے بھائی محمود کو حامد کے فرزند علی کے ہونے کی وجہ سے کوئی حصہ نہ مل سکا اور وہ علی کے باپ حامد کی وراثت سے محروم ہو گیا۔ اب تھوڑے دنوں کے بعد محمود کے باپ زید کی وفات ہوئی تو محمود اپنے باپ کا وارث ہوا۔ علی اپنے باپ حامد کا وارث ہوا تھا۔ اور محمود محروم ہو گیا تھا تو یہ کیسا انصاف ہوا کہ محمود کے باپ زید کا وارث علی ہو اور علی کے باپ حامد کی وراثت سے محمود محروم ہو پھر بھی چچا ہونے کی وجہ سے علی کی ساری ذمہ داری محمود پر عائد ہو جاتے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں ملتے ہیں۔ اس کے لیے بیٹا اور بیٹی کی کیفیت پر غور کیجیے۔ بیٹے کو اپنی بیوی اور بال بچوں کا کفیل ہونا ہے یا اس وقت کفیل ہے، اُس کو مالی استواری کی ضرورت بیٹی سے زیادہ ہے۔ بیٹی اور اُس کی اولاد کی کفالت اُس کے شوہر کے ذمے ہے، خود اُس کی اپنی ذات کا بار بھی اُس پر نہیں ہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہوتی کہ اخراجات کا بوجھ جس پر ہے اس کے برابر حصہ پاتا جس کا اپنا بوجھ بھی دوسرے شخص پر ہے۔ کوئی دانش منداں سا غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے قرین انصاف اور تقاضائے ضرورت دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ بیٹے کو بیٹی سے دو گنی وراثت ملے۔

غرض یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے ہر رخ کی اصلاح فرمائی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ معاشی زندگی کی اصلاح نہ فرماتے۔ انسان کی ساری حرکت صرف معاشی نہیں ہوتی ہے، لیکن ہر انسان کے اعمال میں معاشی جملہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ آپ نے بڑی توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور ایسی معاشی اصلاحات جاری فرمائیں جن کی وجہ سے حقیقتہً ایک نمونہ کا صالح معاشرہ پیدا ہو گیا۔ کاش کہ ہم مسلمان اپنی غفلت سے بیدار ہوں اور پھر سے ان ساری اصلاحات پر خلوص کے ساتھ عمل کر کے نمونے کا معاشرہ پیدا کر دیں۔

# تربیت اخلاق میں تعلیم و تربیت کا مقام

جناب محترم الحاج کفایت اللہ

”ایک عربی شاعر نے کہا ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:  
جس کے دل میں درد رہتا ہے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کرتا ہے جس سے اس کا درد دور ہو جاتا ہے۔“  
صاحبان فکر و نظر ہی نہیں، وکراچی سے طورخم تک افراد ملت اس کے شاہد ہیں کہ حکیم محمد سعید اور ان کے رفقاء ہمدرد کو عرصہ دراز سے ملت کے انتشار و ذہنی و فکری اور اس کے نتیجے میں انتشار اور اخلاق علی کا بے حد تعلق ہے۔ پس انھوں نے مذاکرہ ملی اخلاقیات نمونی کا اہتمام کیا۔ آج ملک بھر کے درو مند حلقوں کی نگاہیں اس مذاکرہ ملی پر مرکوز ہیں۔ اور وہ یہ جانتے کے لیے بے تاب ہیں کہ ملک کے ممتاز علماء و اہل علم اصلاح اخلاق کے سلسلے میں کیا علاج تجویز کرتے ہیں۔ اور مجھے جب یہ دعوت نامہ ملا تو آنے میں بھی خوشی ہوئی۔ وہ اس لیے کہ میرے ذہن کے مطابق مجھے اصلاح اخلاق کا ایک سہل نسخہ معلوم ہے یہ خیال کے مطابق میرا تجربہ کردہ علاج کچھ ایسا ہے کہ جب آپ اس کو لے کر ملک عزیز کے گوشے گوشے میں پھیل جائیے تو انشاء اللہ تعالیٰ ملک میں اصلاح اخلاق کی صورت احوال میں بستی کے نمایاں آثار دکھائی دیں گے۔ اس سے قبل کہ میں وہ علاج آپ کو بتاؤں میں اس کے سہل پن کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنا پسند کروں گا۔  
بہا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں بڑی واضح ہوتی ہیں لیکن دماغ پہلے سے کچھ ایسے دقیق مسائل میں الجھا ہوتا ہے کہ وہ واضح اور نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اب اچھے اور بُرے اخلاق ہی کو بھیجے! کون نہیں جانتا کہ کونسی چیز بُری ہے اور کونسی اچھی۔ خود قرآن کریم گواہ ہے:

فَالْقَبِيْهَا فُجُوْرًا وَّلَقَوْهَا -

(پھر ہم نے اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی،

وَهٰذَا يٰۤاٰلِیْنَ دِیْنِ -

(ہم نے انسان کے لیے خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے ہیں،

مقصود و مطلوب یہ ہے کہ جہاں تک اچھے اور بُرے اخلاق کا تعلق ہے تو یہ تصورات تو ہمارے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں۔ ان تصورات سے تو ہماری فطرت آشنا ہے۔ پس مذاکرہ

قائم میں توجہ اخلاق کے بجائے اصلاح کی طرف ہونی چاہیے، اور اصلاح بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اشارات کے عین مطابق۔ میں اپنے اس عہد پر قائم ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق اصلاح اخلاق کے سلسلے میں علاج آپ کو بتاؤں گا رانشاء اللہ، لیکن اس سے قبل تشریف اخلاق کے سلسلے میں تعلیم و تربیت کے کردار پر بھی میں نے کچھ گفتگو کرنی ہے۔

اصلاح اخلاق کے لیے ایک منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں مکتبوں، مدرسوں، سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، مسجدوں، خانقاہوں کی امداد حاصل کرنی ہوگی۔ لیکن اس وقت میں چار اداروں کے کردار کے بارے میں کچھ کہنا پسند کروں گا کہ میرے نزدیک اصلاح اخلاق میں یہ ادارے بے حد مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ اور میرا ایمان ہے کہ اگر یہ چاروں ادارے مل کر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری پوری کریں تو تعلیم و تربیت کا مقصد آئیں یعنی تشریف اخلاق حاصل ہو سکے گا۔ یہ چار ادارے حسب ذیل ہیں:

۱۔ گھر کی درسگاہ

۲۔ سماج کی درسگاہ

۳۔ اصطلاحی درسگاہ (مدرسہ، سکول، کالج، یونیورسٹی)

۴۔ حکومت و ریاست

اب ہم ترتیب وار ایک ایک ادارے کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے کہ وہ تعمیر اخلاق کے سلسلے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں یا انہیں ادا کرنا چاہیے:

## گھر کی درسگاہ

یہ غالباً ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ یوپی کے صدر مقام لکھنؤ میں ایک انسانی بچہ جو بیڑیوں کے بیٹھ میں پلاتھا اور بیڑیوں کی طرح چلتا پھرتا اور بولتا تھا اور کھانا پیتا تھا۔ ہسپتالی میں داخل کیا گیا تھا۔ اس بچے کی تعلیم و تربیت کی بہت کوشش کی گئی، مگر سب بے سود۔ یہ بچہ اخلاقی لحاظ سے تو درکنار، ظاہری حرکات و سکنات کے اعتبار سے بھی انسان نہ بن سکا۔ یہ المیہ اسے اس لیے پیش آیا کہ اس بچے کو ابتدا میں انسان بننے کی تربیت نہیں ملی تھی۔ اس اتفاقی مثال سے آپ گھر اور والدین کی تعلیم و تربیت کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہونے ہی خارجی دنیا سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدائی پندرہ سالوں میں بچہ جو کچھ اپنے ماحول سے جذب کرتا ہے وہ اس کی آئندہ کی ساری زندگی کی اساس و بنیاد بنتا ہے۔ زبان و طرز معاشرت ہی میں نہیں اخلاق، عمل، تہذیب اور مذہب میں بھی بچہ بالعموم اپنے والدین اور گھر کے ماحول کے تابع ہوتا ہے۔ رسول اللہ نے اس

حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :

ما من مولود الا يولد على الفطرة فابواه يهودانه او  
ينصرانه او يمجسانه -

ترجمہ: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس گھر کی درس گاہ نے اگر ٹھیک کام کیا تو تعلیم و تربیت کی صحیح اور مستحکم بنیاد پڑ گئی۔ اور اب اس بنیاد پر صحیح عمارت کی اونچی سے اونچی منزل تعمیر کی جاسکتی ہے۔ والدین نے جب بھی اپنی ذمہ داری پہنائی اور پوری کی ہے تو ان کی گودوں میں حضرات اسماعیل، اسماعق اور یعقوب علیہم السلام جیسے انبیاء اور عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر اور حسین ابن علیؑ جیسے صلحاء و جالبانہ پروان چڑھے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے والدین کی تربیت کی اہمیت اس شعر میں کیا خوب واضح کی ہے :

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی  
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندگی

لیکن اگر گھریلو ماحول فاسد ہو جائے تو دنیا ایسے شیطین سے بھر سکتی ہے جو دنیا کے امن و سکون کو غارت کر دیں۔ کسی ماہر نفسیات نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا کے ظالم اور مفسد انسان دراصل شریہ اور گریڈے ہوئے بچے ہیں، جن کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار آگئی، اور انھوں نے دنیا کو ظلم و فساد سے بھر دیا۔

## سماج کی درس گاہ

انسان کی دوسری تعلیم وہ ہے جو اسے اپنے ماحول اور معاشرے سے ملتی ہے۔ سماج کے اثرات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ان سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ پریس، رسائل، اخبارات، کتابوں کی ہمنات، سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ذرائع آمد و رفت کی بے انتہا سہولیات، تحریکات، تنظیمات نے پوری دنیا کو ایک سماج بنا دیا ہے۔ اب موجودہ سماج کی کن کن فتنہ سازیاں کا ذکر کیا جائے اور ان سے بچ کر آدمی کہاں جاسکتا ہے۔ حسنِ عریاں ہے کہ ہمارا ہر طرف سے اغوا طے کیے ہوئے ہے۔ سینما کے فحش گانے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور رومانی، فحش اور ڈاکہ زنی کی فلمیں نوجوانوں کے اخلاق کو کردار کا ستیا ناس کر رہی ہیں۔ ان حالات سے مدد و ہوش اور سر مست ہو کر اگر نوجوان جنسی انار کی کاشکار ہو جائیں تو کیا اس کی ذمہ داری میں سماج برابر کا شریک نہیں؟



اگر سماج کی اصلاح کی جائے تو وہ اصلاح اخلاق کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک صالح معاشرہ انسان کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو کتابوں کے ذخائر اور رسمی درس گاہوں کی لفظی تعلیم نہیں دے سکتی۔ اس واسطے انسانیت کے سب سے بڑے معلم و مربی صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج کی اصلاح کو انسان کا اہم فریضہ اور ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ جب بھی سماج میں کوئی بُرائی سر اٹھائے اسے فی الفور کچل دیا جائے۔

من رای منکم منکر فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی بُرائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے یا زبان سے بدل دے یا دل سے گویہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

### حکومت و ریاست

اصلاح اخلاق کے سلسلے میں سب سے مؤثر حکومت و ریاست کا ادارہ ہے۔  
الناس علی دین ملوکہم

ترجمہ: لوگ اپنے فرمانرواؤں کے طریقے پر چلتے ہیں۔

پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی درست ہے اور آئندہ بھی حقیقت رہے گا۔ حکومت جس طرف چاہتی ہے لوگوں کو ہٹکائے جاتی ہے۔ اگر حکومت کا نظام اور اس کی پالیسی صحیح ہو تو غیر معمولی ذرا لُح اور وسیع ترین دائرہ اثرات کی حامل ہونے کے باعث وہ پورے سماج کو درست کر سکتی ہے۔ لیکن اگر حکومت کا نظام فاسد ہے تو وہ پورے سماج کو تعلیمی نظام سمیت، فاد و طغیان کے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ قرآن مجید ایک صالح حکومت کا تعارف ان الفاظ میں کرتا ہے:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَتَوْا بِالصَّلَاةِ وَآتَوْا الزَّكَاةَ  
وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو ہم زمین میں اقتدار بخش دیتے ہیں تو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

## اصطلاحی درنگاہ

اصطلاحی درسگاہ وہ ہے۔ جسے مدرسہ، سکول، کالج یا یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ انسان علوم و فنون میں آکر حاصل کرتا ہے۔ یہیں اس کی خواہیدہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، اور یہیں پر تربیت پاکر وہ اپنے سماج، اپنے ملک و قوم بلکہ دین کا معلم بن سکتا ہے یا مفسد اور مضل۔ تعلیم و تربیت کی سب سے اہم اور مرکزی کڑی معلمین ہیں۔ لہذا تعلیم ناقص ہو، تعلیمی پروگرام ادھورا ہو، درسگاہ کا ماحول موزوں نہ ہو، لیکن اساتذہ کی شخصیتیں پرکشش اور بہتر ہیں تو ان ساری کیوں کی تلافی ممکن ہے۔ مگر اساتذہ صحیح نہ ہوں تو یہ کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی ہیں دینی درسگاہوں سے ایسے اساتذہ کو بچنے کی کڑی نگرانی دینا چاہیے جو ہمہ وقت ہمارے طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں کہ اسلام کوئی ہڈا بٹہ حیات نہیں، نہ یہ کوئی تہذیب رکھتا ہے نہ تمدن، اور یہ کہ اسلام سیاسی اور معاشی لحاظ سے ایک چلا ہوا کارہ توں ہے۔ ایسے اساتذہ سے بڑھ کر عالم اسلام اور اسلامی اخلاق کا غلام کوئی نہیں۔

پیشتر اس کے کہ اب اس علاج کی طرف لوٹوں جس کا ذکر میں نے اوائل میں کیا تھا، میں اپنے دعا کی وضاحت کے سلسلے میں تاریخ اسلام سے محض دوسرے واقعات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

ستوڑوں کا ایک حقیقہ، ایک ادنٹ، ایک غلام، ایک لکڑی کا پیالہ ہمارے کمر اور اپنی جگہ حضرت عثمان غنیؓ کو مدینہ کا عامل مقرر کیے حضرت عمرؓ سفر فلسطین پر روانہ ہوتے ہیں، کبھی غلام ادنٹ کی مبارک پٹہ کہ جلتا اور فاذق اعظمؓ ادنٹ پر سوار ہوتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس۔ تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں سے کون ہے جو حضرت عمرؓ فاروقؓ کے اس عظیم کردار کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔

اب دوسرا واقعہ سنئے! بلکہ آپ اسے متعدد بار سن بھی چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؓ ایک رات دیا جلا کر کام کر رہے تھے اور دیا بیت المال کا تھا اور وہ کوئی سرکاری کام کر رہے تھے کہ اتنے میں کوئی صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے گفتگو شروع کی یہ گفتگو ذاتی معاملات کے متعلق تھی۔ تو آپ نے کہا:

”ذرا ٹھہراؤ! پھر آپ نے دیا بجا دیا اور کہنے لگے کہ یہ بیت المال کا دیا ہے جیل اس

میں بیت المال کا چل رہا ہے، اس لیے ذاتی گفتگو میں یہ دیا نہیں جلی سکتا۔“

یہ دو مثالیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اصلاح اخلاق آپ چاہتے ہیں تو آواز دینے سے بات نہیں بنے گی۔ ان ہر دو واقعات میں آپ نے دیکھا کہ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہر ایک نے اپنے کردار کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ نہیں کہا کہ سادگی اختیار کرو۔ مسلمان کو اپنا مہبائی اور مساوی سمجھو، بلکہ ستودہ کا تھپکا بھر کر باری باری ادب پر سواری کر کے اور پیدل چل کر علما سادگی اور مساوات کا مظاہرہ قائم کر کے رہتی دنیا تک مثالی قائم کی۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ نہیں کہا کہ بے ایمانی نہ کرو، سرکاری اختیارات اور اموال کو ذاتی استعمال میں نہ لاؤ بلکہ یہ علما کر کے بتایا اور تنہا کیا۔

اگر آپ اخلاقیات نبویؐ کو ملک عزیز میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں تو جیسے میں نے عرض کیا علاج بہت آسان ہے۔ آپ سب کو چاہیے کہ اپنے اپنے گھروں، اپنے اپنے محلوں، اپنے اپنے دفاتروں اور اپنے اپنے فرموں میں آج سے ہی اخلاق کا مظاہرہ کیجئے۔ شنیدہ ہے کہ آج کل یورپ میں یہ دعا چلی نکلی ہے کہ : O GOD , REFORM THE WORLD , BUT START WITH ME :

العقاد مذکورہ اپنی جگہ درست، تقاریر بھی حیات ملی میں ایک مقام رکھتی ہیں، قراردادیں بھی اپنی انادیت رکھتی ہیں، لیکن علاج صرف اور صرف یہی ہے۔ کیونکہ کہنے والا کہتا ہے لیکن اگر خود عمل نہ کرے تو صرف یہ کہ اس کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ایسا کردار اللہ تعالیٰ پر بھی بہت گراں گزرتا ہے۔ جیسا ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا تَفْعَلُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كُبِرَ مَقْتًا عَنِ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

اخلاقیات نبویؐ کیا ہے ؟ اس بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس قدر مختصر ترین الفاظ میں فرمایا :

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ

یعنی وہ قرآن کے عملی پیکر اور تفسیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسوہ حسنہ سے ان کا دلوں میں اس قدر انقلاب بپا کر چکے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ان کی قوم سے نہ زیادہ بہتر اور زیادہ صالح اور کوئی ایسی قوم نہ تھی جو ملی وحدت اور باہمی اعتماد کا قابل تقلید نمونہ پیش کر سکتی ہو۔ ان کے ایک فرد کا پیمانہ تمام ملت کا پیمانہ قرار پاتا تھا۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو کسی قیمت پر فریاد جاسکتا ہو۔ یہ اس ذہنی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے اپنی

گدڑی میں پھپکا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کر دیتا ہے۔ لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا نام ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں اس لیے منین بتاتا کہ تم میری تعریف کرو گے، جب کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اور میں اس کے ثواب پر راضی ہوں۔ یہ اس قوم کا کہ دار ہے جو مالِ غنیمت پر ٹوٹ کر اُسے لوٹا کرتی تھی اور جس پر سورہ الفال شاہد ہے۔

یہ قانونِ فطری ہے کہ جنگ فوجیں نہیں تو میں لڑا کرتی ہیں اور قوموں کا وہ زمانہ سہری ہوتا ہے کہ جب ان کا ہر فرد مجاہد بننے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ آئیے اللہ تعالیٰ و تبارک کی بارگاہ میں انتہائی عجز و انکسار سے یہ دعا کریں کہ یہ مذاکرہ ملی، اخلاقیاتِ نبوی کو عام کرنے کا ذریعہ بنے تاکہ نازک وقت آنے سے پہلے ملتِ پاکستانیہ اس فرمانِ ربانی کا مصداق بنے :

وَكَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ  
کتنی ہی قلیل جاعتیں ہیں جو اذنِ اللہ سے جماعتِ کثیرہ پر غالب آئیں۔

# اخلاقی تحریک — کیوں اور کیسے

جناب محترم پروفیسر رحیم بخش شاہین

اس وقت ہماری معاشرے میں اخلاقی کی جو حالت ہے اس کو دیکھ کر ہر آدمی پریشان ہے۔ اور اہل پاکستان کے اخلاق کا موانہ نہ کبھی امریکا اور برطانیہ کے لوگوں کے اخلاقی سے کہتا ہے اور کبھی جرمنی اور جاپان کے باشندوں کے اخلاق سے۔ کبھی اہل چین کی اخلاقی ترقی کا ذکر کرتا ہے اور کبھی تقسیم برصغیر پاک و ہند سے پیشتر کے زمانے ہی کو اخلاقی لحاظ سے بہتر اور برتر قرار دیتا ہے۔ یہ ساری تگ و دو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔ ہر درد مند آدمی کو حال کے آئینے میں مستقل کا چہرہ انتہائی بھیانک نظر آتا ہے۔ ہر شعبہ حیات میں یہی قطر آ رہا ہے کہ اس میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ چکی ہے۔ صنعت و حرفت سیاست و ریاست، ادب و صحافت اور تمدن و معاشرت سب طرف اخلاقی بگاڑ اپنی انتہائی بھیانک صورت میں نظر آتا ہے۔

معاشرے کی معاشی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگوں میں سودی کاروبار کا ابلیسی خون گردش کر رہا ہے۔ سسہ بازی، ذخیرہ اندوزی، اشیائے ضرورت کی مصنوعی قلت پیدا کرنے اور قیمتوں میں بلا جواز اور من پسند اضافہ کرنے کے رجحان نے ہماری تجارتی اور کاروباری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ناقص اور مضرت اشیاء کا اشتہار بازی کے ذریعہ سے فروخت کرنا ذہانت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے۔

سیاست و ریاست کی جو حالت ہے اس کی تفصیل ہمارے تقریباً ۳۷ سالہ دورِ آزادی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر کہ و مہ پر اہم نشر ہے۔ اگر کسی کو اعداد و شمار اور متعلقہ واقعات سے آگاہی مطلوب ہو تو زیادہ دُور جانے اور عمیق مطالعے کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، سابق حکومت کے چند سالوں کی کارکردگی موجودہ حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے قرطاسِ بدیع میں دیکھی جاسکتی ہے۔ الزام تراشی، غنڈہ گردی، دھوکہ بازی اور جعل سازی سیاست کا طرہ امتیاز بن گیا ہے۔ اس طرح کی سیاست سے شہر پاکر انتظامیہ نے سرخ فیٹہ اور رشوت کا ہو

چکہ چلا رکھا ہے اس سے بھی سب لوگ بخوبی واقف ہیں۔

ادب و مصافحت کی دنیا میں کذب و افترا اور عریانی و فحاشی کی حکمرانی ہے۔ اخبارات جس مکروہ انداز میں لوگوں کو لچر اور فحش فلموں کا شیدائی بنا رہے ہیں اور مختلف تقاریب میں شامل ہونے والی خواتین کی عریاں و نیم عریاں تصاویر سے منہی خواہشات بھڑکانے میں مصروف ہیں وہ انتہائی پریشان کن ہے۔ ڈائجسٹوں کی ایک بڑی تعداد پورے مشنری جذبے سے قوم کی اخلاقی روایات کی شکست و ریخت میں مصروف ہے، یہ ڈائجسٹ نہ صرف یہ باور کر رہے ہیں کہ زندگی زنی، زر، زمین کا دوسرا نام ہے بلکہ مغربی تہذیب اور ہندو مذہب و رسوم و عقائد کو دلکش صورت میں پیش کرنے میں بھی یہ ڈائجسٹ ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں، کوشاں ہیں۔

تمدن و معاشرت کی حد تک، حصولِ زر کی بے لگام دوڑ میں شرکت کا اثر یہ ہوا ہے کہ شرم و حیا، عفت و پاکدامنی، امانت و دیانت، انوث و محبت اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ صفات دم توڑ رہی ہیں اور بے حیائی و بے شرمی، عصمت و فروشی، خیانت و بددیانتی، عداوت و دغا صمت، خود غرضی و نفس پرستی کو غلبہ حاصل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسی خبریں بھی سننے میں آتی ہیں کہ جن میں انسانی ہمدردی، دیانت اور فرض شناسی کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان مثالوں کی حیثیت تاریک رات میں چمکتے ہوئے شنگھوں کی سی ہے، ان سے تاریکی مٹ نہیں سکتی اور پھر اسلامی معاشرے کو جس اخلاقی معیار کا مالک ہونا چاہیے، اس کے لحاظ سے یہ مثالیں لائق ذکر بھی ہیں۔ تعلیم کے شعبے کی طرف آئیں تو وہاں بھی حالت کچھ مختلف نہیں۔ پولیس کا مقصد قانون کی حفاظت ہے اور کچھریاں حصولِ انصاف کا ذریعہ ہیں لیکن قانون کی مٹی کس طرح پولیس کے ہاتھوں پلید ہو رہی ہے اور کچھریوں میں حصولِ انصاف کتنا مشکل، پیچیدہ اور مہنگا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اخلاقی بدحالی کے اس سیل بے پناہ میں عام آدمی تنگ کی طرح بہا جا رہا ہے۔ اس میں اگر کوئی قوتِ مدافعت تھی بھی تو وہ دم توڑتی جا رہی ہے۔ اُس نے سمجھ لیا ہے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا عبث ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اخلاقی بے راہروی ان کی معاشرتی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ وہی شخص کامیاب و کامگار ہے جو رضا کارانہ طور پر اس کا ساتھ دے لہذا وہ بھی زمانے کے ساتھ چلنا ضروری سمجھتا ہے خواہ اس کے لیے اس کو بڑی سے بڑی اور پاکیزہ سے پاکیزہ اخلاقی قدروں کو قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس عالم میں جب نفاذِ اسلام کی آواز کان میں پڑتی ہے تو ہر دردمند مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا محض قانونی سازی اور اجرائی احکام سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ ”نہیں“ اس کے لیے لازماً ذہنوں کو تیار کرنا پڑے گا اور اخلاقی اصلاح کا ہم چلائی پڑے گی۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مسئلہ بذاتِ خود گہرے غور و فکر ہی کا متقاضی ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال بار بار آتا ہے کہ اس ہمہ گیر اخلاقی انحطاط کا سبب کیا ہے اور کیا اس کو ختم کیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو اس کے لیے مناسب طریق کار کیا ہوگا؟ اگر دس آدمیوں کے سامنے یہ سوالات رکھے جائیں تو آپ کو کم و بیش دس ہی جواب مل جائیں گے اور غالباً ہر جواب دوسرے سے مختلف ہوگا۔ ”نکرہ کس بقدر ہمت دوست“، ہر شخص اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں بات کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس مسئلے کے بارے میں مختلف آراء کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب سیاست ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما کسی قسم کے ضابطہ اخلاق کے قائل نہیں۔ گورنری اقتدار ان کا مسلح نقطہ ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے ہر طریقہ جائز بنا لیتے ہیں۔ دوسرا آدمی یہ رائے دیتا ہے کہ اخلاقی گراؤ کی اصل ذمہ دار حکومت ہے۔ حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو عوام کو خواہ مخواہ غیر اخلاقی ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تیسرا آدمی معاشرتی ماحول کے دباؤ کو اخلاقی بد حالی کا باعث قرار دیتا ہے۔ معاشرے کا اجتماعی رویہ، محفوض رسوم اور رواج انسانی اخلاق کے سارے کس بن نکال دیتے ہیں۔ چوتھا آدمی اس اخلاقی انحطاط کی بنیاد معاشی ناہمواریوں اور اقتصادی نا انصافیوں میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غربت افلاس انسان کو چوری، ڈاکہ زنی، عصمت فروشی، رشوت خوری، خیانت وغیرہ پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے خیال میں معاشی فارغ البالی سے ہر قسم کی اخلاقی خرابی کا سدباب کیا جاسکتا ہے۔ پانچواں آدمی ذرائع ابلاغ کو جملہ اخلاقی پستیوں کی جڑ قرار دیتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاستدان، حکمران، قانون، معاشرتی رسم و رواج، عزت و اخلاص، دولت و امارت اخلاق عامہ کی پستی یا بلندی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سیاستدانوں کے مکرو و فریب، حکمرانوں کی نفس پرستی و کذب پروری، قانون کی بے عملی، منکر کا اخلاق دشمن رجحان، عزت کا احساس، امارت کا نشہ، اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما وغیرہ کی بُری تلقین اس پستی میں اضافے کا سبب ہے۔ یہ سب چیزیں پست اور مذہوم اخلاقی صفات کو تسلسل اور دوام بخشے داتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب سے

بڑھ کر تباہ کن زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس میں حیوانیت کو انتہائی خیال کیا جاتا ہے۔ شکم پروری اور نفس پرستی تہذیب و شائستگی کے ہزاروں سال پر پھیلے ہوئے طویل سفر کا حاصل قرار پاتی ہے۔ یہی وہ خطرناک نقطہ نظر ہے جو اس وقت بڑی سرعت سے ہمارے معاشرے پر غلبہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔

اخلاقی حسن انسان کی فطری حس ہے، قدرت نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس میں نیکی اور بری کا شعور بھی ودیعت کر دیا ہے۔ انسان فطری طور پر جانتا ہے کہ کون سی بات اچھی ہے اور کونسی بُری۔ اسی طرح وہ اخلاقی صفات کی خوبی و خرابی سے بھی باخبر ہے۔ پھر مذہب عالم نے بھی اخلاقی قدروں کے بارے میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔ یہی وسیع ہے کہ اچھی اور بُری اخلاقی صفات تمام انسانوں پر بالکل واضح ہیں۔ اس کے باوجود ہر دور کے انسان نے ان صفات کی معنویت کو اپنے ذاتی مفادات اور جاہلی تعصبات کے تحت محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو اخلاقی لگاؤ رہا وہ اس نے پورے معاشرے کو ہلاکت و تباہی کا لقمہ ترنا دیا اور یہ معاشرے تاریخ کا جزدہن گئے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے بھی ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اخلاقی جیسے راہروی کا یہ سلسلہ عمر حاضر کی زبردست علمی و فلسفیانہ ترقی کے باوجود جاری ہے۔ اقوام مشرق مغربی اقوام کی مادی ترقی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ وہ اپنی اصلاح اخلاق کے لیے بھی مغربی اقوام کی طرف دیکھ رہی ہیں، حالانکہ وہ قومیں خود زبردست اخلاقی انتشار سے دوچار ہیں جن کی تہذیبی ترقی کے افسانے عام و خاص کی زبان پر ہیں۔ جو قومیں ترقی سے ہلکنار ہیں اور علم، اخلاق اور تہذیب میں دنیا کی قیادت و سیاست کی دعویدار ہیں تقریباً وہ سب بنیادی طور پر خدا، وحی اور رسالت کے تصور سے محروم ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب ایک غیر عقلی رویہ ہے اور اگر اس پر ایمان ضروری ہے تو پھر یہ انسان کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اجتماعی مسائل سے مذہب کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، سنی کہ اخلاق کی اصلاح و تعمیر کے سلسلے میں بھی وہ مذہب کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر میں امریکا سے ایک اخلاقی تحریک شروع ہوئی جس نے بعد ازاں یورپ کے ممالک کو بھی متاثر کیا۔ اس کے مقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی کہ انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، قومی ہوں یا بین الاقوامی ایسے اخلاق کی اہمیت پر زور دینا جس میں مذہبی عقائد یا مابعد الطبیعی خیالات کا کوئی دخل نہ ہو۔

اس طرح کی تحریکوں کے فروغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ خیر، مسرت، کمال اور حتیٰ وغیرہ کی باتیں



کرنے کے باوجود یہ قومیں اور ان کے فلسفی ان چیزوں کی اصلیت و حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے۔ ان سب باتوں کے متعلق ہر منکر کا نقطہ نظر دوسروں سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے۔ اخلاق حسن و قبح کا معیار کیا ہے؟ خیر و شر کے علم کا ماخذ کیلئے؟ اخلاقی قوانین کی پشت پر کون سی قوت کار فرما ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو انسان کو ان اصولوں کی پابندی پر آمادہ کرتے ہیں؟ ساری سوچیں اور سارے فلسفے ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس تمام مار سائی کی وجہ یہ ہے کہ سوچنے والے ذہن کا ثنات، انسان اور حیات ایسی بنیادی حقیقتوں کے بارے میں صاف نہیں ہیں۔ کا ثنات کا خالق کون ہے؟ کا ثنات کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب تک ان باتوں کا صحیح اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا، اخلاق کے کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام نے ان بنیادی حقائق کا مطالعہ بھی مذہب اور وحی کی رہنمائی کے بغیر کیا ہے۔ وہ کا ثنات اور زندگی کی روحانی بنیاد کا انکار کرتی ہیں اور مادہ پرستی پر فخر کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اخلاق کی تعمیر کی اہم بنیاد سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک اخلاق ایک روحانی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو شخصی اور گردہ بے مفادات کے تابع ہے لہذا انھوں نے اخلاق کی اصلاح اور تعمیر کے لیے قومی، وطنی، نسلی، طبقاتی، تجارتی اور کاروباری اغراض و مقاصد کا سہارا لینے میں عافیت خیال کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اخلاق کے لیے کوئی عالمگیر، مستقل اور مستحکم بنیاد مہیا نہیں کر سکتی۔ اس طرز عمل نے اخلاق کے دوسرے، ترسے معیار قائم کر دیے ہیں، ہر شخص اور ہر گروہ اپنا الگ اور منفرد معیار رکھتا ہے جو نہ صرف دوسرے اشخاص اور گروہوں سے مختلف ہوتا ہے بلکہ باہم متصادم بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک کے باشندے، ایک ہی قوم کے افراد اور ایک ہی معاشرے کے ارکان اخلاق کے جدا جدا اصولوں کے قائل ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک آدمی ایک ذہین اور قابل، جج، وکیل، استاد، سیاستدان اور تاجر ہے لیکن دوسری طرف اچھا انسان نہیں ہے۔ اس کی نجی اور شخصی زندگی ایک اخلاقی اصول کے تابع ہے اور اجتماعی اور معاشرتی زندگی دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ پھر وہ جس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے باہمی معاملات ایک اخلاقی اصول کے مطابق سرانجام پاتے ہیں لیکن دوسرے گروہوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اس کے اصول تبدیل ہو جاتے ہیں! پھر یہ سب لوگ اپنی قوم کے ساتھ جو اخلاقی رویہ اختیار کرتے ہیں دوسری قوموں کے ساتھ اس سے قطعی مختلف رویہ اپنانے میں فخر

محسوس کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں نقل و خو نیز می اور معاشی لوٹ مار کا بازار گرم کرنے والے لوگ دی ہیں جو اخلاقی کے دعویدار ہیں۔ اس اخلاقی زوال کے عالمگیر اثرات مغربی اقوام پر جس طرح مرتب ہو رہے ہیں اس کا اندازہ خود مغربی مفکرین کی تصانیف سے ہو سکتا ہے۔ وہ اس صورت حال کو انتہائی پزیرا نشان کن اور مایوس کن قرار دیتے ہیں لیکن اس کا کوئی مدد ان کے پاس نہیں ہے۔

امریکا اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور وہ سب سے زیادہ مہذب و متمدن ہونے کا دعو ا کرتا ہے۔ وہ زندگی کی بنی اساسوں، رٹگنیوں اور رعنائیوں سے ہمکنار ہے ان کا فرق ذکر کیا سن کر ایشیائی لوگوں کی دال ٹپکنے لگتی ہے، لیکن اخلاقی اعتبار سے وہ کس منزل پر ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو ۱۳ جولائی ۱۹۷۷ء کی شام کو رونما ہوا۔ آسمانی بجلی گرنے سے نیویارک کے بہت سے ٹرانسفارمر جل گئے جس کی وجہ سے پورے شہر کی برقی رو معطل ہو گئی برقی رو کا معطل ہونا اتنا شہر میں قیامت آگئی۔ شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔ لغین جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ لوگ ان میں پھنسے ہوئے تھے، کوشش کے باوجود نکل نہیں سکتے تھے۔ لوگ موم بتیاں تلاش کر رہے تھے لیکن اندھیرے میں موم بتی مل رہی تھی نہ دیا سلائی۔ گھروں کے اندر سہو حالت تھی وہ تو الگ رہی اصل قیامت بناروں اور کاروباری مراکز میں بپا ہوئی۔ سماج دشمن عناصر نے اس تاریکی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور زبردست لوٹ مار مچائی۔ اس اندھیرے میں نہ تو دکاندار اپنے مال کی حفاظت کر سکتا تھا نہ چور پکڑ سکتا تھا۔ ہزاروں دکانوں، اسٹوریوں اور تجارتی عمارتوں میں ڈاکے ڈاکے گئے اور کروڑوں روپے کا سامان لوٹ لیا گیا۔ شہر میں آتش زنی کی سولہ وارداتیں ہوئیں۔ پچھتے ستو عمارتیں اس آتش زنی سے شدید متاثر ہوئیں، لاکھوں کاریں پوری ہو گئیں شہر کے ہر محلے میں شراب کی بوتلیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ مختلف علاقوں میں ان سماج دشمن عناصر نے گھروں میں گھس کر نہ صرف ڈاکے ڈالے بلکہ کئی محلے سے مجرمانہ حملوں کی اطلاع بھی ملی۔ بعض مقامات پر غنڈوں نے پولیس کا باقاعدہ مقابلہ بھی کیا جس سے ۱۳۲ پولیس والے زخمی ہو گئے۔ چھوٹے دکاندار تو بالکل تباہ ہو گئے۔ ان تمام تر وارداتوں کے سلسلے میں پولیس نے تقریباً تین ہزار تین سو افراد کو گرفتار کیا۔

یہ تو نمونہ ہے امریکی تہذیب کا۔ اب آئیے برطانیہ کی طرف جس کی اخلاقی برتری کے لغو تہذیب کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ برطانیہ نے جس طرح اہل مشرق کو حرم و آزار کا نشانہ بنایا، استعماری مفادات کے لیے جس طرح مشرقی اقوام کو باہم لڑایا وہ ایک الگ داستان ہے، حالی ہی میں دناں غیر مقامی لوگوں پر جس طرح ظلم و ستم کیا گیا اس سے برطانیہ کے اخلاقی برتری کے لغو کی اہلیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ اخلاقی انتشار اور افراطی امریکا اور برطانیہ ہی کا خاصہ نہیں ہر وہ معاشرہ اور قوم اس کا شکار ہوگی جس میں اخلاق کی تعمیر کے لیے روحانی عقائد اور مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈالا جائے گا۔ اخلاق کی بہترین بنیاد وحی کے عالمگیر اور ابدی اصول بن سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس وقت تک انسانیت کے لیے مفید نہیں بن سکتا جب تک اس کی بنیاد وحی ربانی پر نہ رکھی جائے۔ وحی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ انسانی اغراض کو ایک بڑے نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور یہ نصب العین ہے اللہ کی خوشنودی، اور یہ نصب العین بہت سی دوسری چیزوں سے وابستہ ہے، یعنی رسالت پر ایمان، آخرت کا عقیدہ، جزا و سزا کا یقین وغیرہ ان سب کے مجموعے کو ہم ایمان کہتے ہیں۔ اسلام پہلے ایمان کی دعوت دیتا ہے اور پھر اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

زندگی کی ہر تعمیر سے پہلے عقائد کی تعمیر ضروری ہے انسانی اذنان و دلوں جب سچے عقائد کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر فکر و عمل کے میدان میں انقلاب لانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اصلاح کا یہ فطری طریقہ ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے یہی طریقہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے کائنات اور حیات کے بارے میں انسانی ذہن کو غلط قسم کے خیالات اور توہمات سے نجات دلانی شروع کی۔

کائنات کے متعلق اسلام یہ حقیقت ذہن نشین کرتا ہے کہ اس کا ایک خالق ہے، وہی اس کا انتظام کرنے والا ہے، وہی سب مخلوقات اور انسانوں کا آقا و مالک ہے، ہر چیز فانی ہے لیکن خالق ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی ہے۔ وہ حکیم اور قادر مطلق ہے، وہ ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، انسان اس کا بندہ اور نائب ہے اور اپنے ہر کام کے لیے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس عارضی دنیا کے بعد دوسری دنیا یا آخرت لازماً آئے گی جس میں دنیا کی زندگی میں اس کی جملہ مساعی کا مکمل حساب ہوگا۔ اس کے مطابق وہ عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا مستحق ہوگا۔ دنیا کی زندگی دراصل امتحان کی ہمدست ہے۔ انسان کی سہولت کے لیے کائنات کی ہر چیز مسخر کر دی گئی ہے۔ اس کو نہ صرف اپنے جسم پر اختیار عطا کیا گیا ہے بلکہ نیکی بدی، اطاعت و سرکشی کی راہیں بھی اس کو سمجھا دی گئی ہیں۔ اس کی ابدی فلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی منشا کے تابع کر دے اور اس کے دل میں ہر وقت یہ احساس جاگتا رہے کہ اس کا واسطہ ایک ایسی ہستی سے ہے جو اس کی حرکات و سکنات ہی نہیں اس کے خیالات و احساسات کی باریک سے باریک تفصیل سے بھی بخوبی باخبر ہے اور بلند و سزا دینے کی پوری قدرت بھی رکھتی ہے۔

کائنات وحیات کا یہ تصور اس خیر اور بھلائی کو بھی متعین کرتا ہے جس کے لیے انسان کی ہر سعی و کوشش وقف ہونی چاہیے اور وہ کائنات کے رب کی خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں سمجھائی گا یہ تصور انسان کی اخلاقی زندگی کا محور ہے۔ اس تصور کی روشنی میں اخلاقی صفات اپنی فطری اور اصلی صورت میں متعین طور پر سامنے آتی ہیں۔ رضائے الہی کو مقصود قرار دینے سے اخلاق کو نہ صرف بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی نشوونما کے امکانات روشن تر ہوتے ہیں بلکہ ذاتی مفادات اور زمانی تغیرات سے بالاتر اخلاقی اقدار قائم ہو جاتی ہیں۔ کائنات وحیات کے اس تصور میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جس کا کسی بھی اخلاقی قانون اور ضابطہ کی پشت پر ہونا ضروری ہے۔ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور عالم غیب ہونے کا تصور آخرت کی بانی ہے۔ اللہ کے غضب کا ڈر اور ابدی زندگی کی خرابی کا خوف اخلاقی قانون کا دائمی پشتیبان ہے۔ یہ خوف حب انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر اس قانون کی تعمیل کے لیے کسی پولیس، عدالت اور جیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک راستہ عامہ بھی اس اخلاق کے حق میں تیار کرتا ہے اور حکومت کو بھی اخلاق کی نگرانی کا ذمہ دار بناتا ہے لیکن ان سب ذرائع سے بڑھ کر وہ اللہ کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے عقیدے کو مستحکم بنانا ضروری سمجھتا ہے۔ جب یہ عقیدہ مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر اخلاق کی عمارت ناقابل شکست بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے۔ افراد معاشرہ کسی قانون، پولیس اور عدالت کے بغیر خود ہی ایک دوسرے کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت میں سرگرم رہتے ہیں، یہی چیز ہے جو زندگی کی ہر سرگرمی کو دنیا کے دائرے سے نکال کر دین بنا دیتی ہے جو دیوانی اور فوجداری مقدمات کو صرف عدالتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتی بلکہ آخرت کی نجات کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے۔

یہ بنیادی تصور وہ محرکات بھی ہوتا ہے جو انسان کو اخلاقی قوانین کے مطابق عمل کرنے پر ابھارتے ہیں۔ اللہ کو اللہ ماننا اس کی اطاعت و بندگی پر راضی ہو جانا اس کی مرضی و منشا کو مقصد حیات بنانا ان قوانین کی تعمیل کے اصل محرکات ہیں، جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ اس کے رب نے ان کا حکم دیا ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں اس کے لیے آخرت کی ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل مضمّن ہے۔ اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہونے کا تصور انسان کو اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے غضب سے خوفزدہ رکھتا ہے، لہذا وہ دنیا کی عارضی زندگی میں ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر کے آخرت کی کامیابی اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔ پھر اسلام نے اخلاقی قوانین کا ماخذ بھی ہتیا کر دیا ہے۔

اس نے اخلاقی صفات کو محض عقل، علم، تجربہ، خواہشات نفس کے بجائے ایک واضح اور معین ذریعے پر منحصر قرار دیا ہے اور وہ ہے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ۔ یہ دونوں چیزیں مل کر اسلامی قانون اخلاق کے لیے ماخذ مہیا کرتی ہیں۔ یہ ماخذ شگامی، علاقائی یا گروہی نہیں بلکہ مستقل، دوا می اور عالمگیر قدر و قیمت کا مالک ہے اور زمانی و مکانی تغیرات سے محفوظ ہے۔ اس ذریعے اور ماخذ سے ہمیں جو ہدایات ملتی ہیں وہ ہر علاقے، ہر نسل اور ہر دور کے انسانوں کے لیے لائق تعمیل اور قابل عمل ہیں۔

پیغمبر اسلام اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے رہنما بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سے دنیا کو جو اخلاقی نظام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے جامع کامل اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں ہماری زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے کر قوموں کے مابین تعلقات کے لیے واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس نظام کی موجودگی میں کسی دوسرے ذریعے سے اخلاقی ہدایات لینے کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ اسلام نے نہ صرف اعلا اور بلند اخلاقی صفات کو صفات الہی کا عکس قرار دے کر بندوں کو خدائی اخلاقی صفات اپنانے کی تلقین کی بلکہ ان صفات کو سہل الحصول اور مرغوب بنانے کے لیے عبادات کا نظام بھی قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی عبادات کے متنوع فوائد میں لیکن ان کی ایک اہم غرض و غایت اخلاق حسنہ کی تربیت بھی ہے۔ یہ عبادات انسان کو اپنے نفس پر قابو پانے کے قابل بناتی ہیں، اس کے معروف پر عمل کرنے اور منکر سے بچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

عبادات کے نظام سے کام لے کر حضور نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو ان تمام صفات سے متصف تھی جن کی تلقین قرآن مجید نے کی اور جن کا عملی نمونہ حضور نے پیش فرمایا۔ صحابہ کرام کی اس جماعت نے صدق و صفاء، امانت و دیانت، ہمدردی و غمکداری، ایثار و قربانی، اور عدل و انصاف کی ایسی مثالیں قائم کیں جو آنے والے لوگوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ اور مینار نور کا کام دیں گی۔ قرآن کی تعلیمات، حضور کے اسوہ حسنہ اور صحابہ کرام کی زریں مثالوں نے ہر دور کے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اسلامی اخلاق کے یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے اُس دور میں بھی ہمارے معاشرے میں بلند اخلاقی قدروں کو سہارا دے رکھا تھا جو ہمارے زوال کا دور تھا۔ علم و فن، تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت کے میدان میں ہم دوسری اقوام سے پیچھے رہ گئے تھے لیکن مجموعی طور پر ہمہماثل تعلق

اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے قطع نہیں ہوا تھا مگر گذشتہ صدیوں کے طویل غیر ملکی تسلط سے ہماری قوتِ مدافعت کو جو ضعف پہنچا اس نے غیر اسلامی افکار و نظریات کی تبلیغ کی راہ ہموار کر دی۔ اس تبلیغ نے سب سے زیادہ ہمارے بنیادی عقائد کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی۔ ہمارا جہاں طبقہ رسم و رواج کی جگہ نئی دلیوں میں پھنس کر رہ گیا اور جہاں ذہن طبقہ اسلام دشمن قوتوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوا۔ مغرب کی مادی ترقی نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اس کے نزدیک ازکار رفتہ اور فرسودہ قرار پائیں۔ مادی ترقی کے مقصود اور متعبر مال و وجاہ کے جذبے نے ہماری اخلاقی اقدار کے سارے نظام کو تباہ و بالا کر دیا۔ آج ہم کسی سے ہنستے بولتے ہیں، کسی کو سلام کرتے ہیں، کسی کی غیریت دریافت کرتے ہیں، اظہارِ غم کرتے ہیں یا نمائشِ مسرت کرتے ہیں تو اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ ڈیل کاری کی کٹا بوں کے تازہ ترین ایڈیشن کے مندرجات پر پورا اتارنے کے لیے! ہم اگر کسی کو تحفہ دیتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ حضورؐ کا فرمان ہے کہ ”ایک دوسرے کو بدیہ بھیجا کرو تو آپس میں محبت پیدا ہوگی اور دلوں کی دورت دور ہوگی“ (مشکوٰۃ) بلکہ اس لیے کہ اس طرح ہمیں کسی سے مالی فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے۔ یہ طرز عمل ہمارے اس طبقے کا ہے جس نے نہ جانے کن کن یونیورسٹیوں سے علمِ دینی کی کیسی کیسی سندیں لے رکھی ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت سے ہمارے عوام کا متاثرہ ہونا قدرتی عمل تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اب شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہو جو اس مہیب اخلاقی بحران سے دوچار نہ ہو۔ ہمارے کسان، مزدور، استاد، وکیل، عالم، رہنما، کارکن اور حاکم سب اخلاقی افلاس اور بے مایگی میں مبتلا ہیں، یہی وجہ ہے کہ کھیتوں، کارخانوں، تعلیم گاہوں، عدالتوں، انتظامی دفاتروں وغیرہ میں گہا گہی ہونے کے باوجود قوم جہاں سے جلی تھی آج بھی وہیں کھڑی ہے۔ ہماری مثال قدمِ داستانوں کے ان شہزادوں کی ہے گوہرِ مقصود کی تلاش میں بڑے جوش اور جذبے سے نکلتے ہیں لیکن کسی خبیث سن کی قید میں آکر پتھر کے بُت بن جاتے ہیں! مایوسی کی لکڑی نے ہمارے وجود کے ارد گرد ایسا جال اتار دیا ہے جس نے ہمیں اپنے انجام کے مشاہدے سے محروم کر دیا ہے۔ وقت کا ہر لمحہ سانپ کی طرح ہمیں ڈس رہا ہے اور ہر گھڑی ناگن کی طرح پھنکارتی سنائی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ہمت نادر ہیں، ناموافق حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، اخلاقی بے راہروی سے سمجھوتہ کر لیں اور اخلاقی صفات کی ترویج و ترقی کے اس منصب سے دست بردار ہو جائیں جس کے لیے حضورؐ کی امت کو مقرر کیا گیا ہے؟ میرا جواب ہے: ہرگز نہیں جب تک

ہمارے سینوں میں ایمان کی مشعل فروزاں ہے ہمیں تاریکیوں کے خلاف جنگ کرتے رہنا ہے۔  
ہمیں اپنی حد تک، اپنی سمت کے مطابق صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد ضرور کرنا  
ہے۔ ایک چینی کہاوت میں کہتی اچھی بات کہی گئی ہے :  
”تاریکی کو کو سننے کے بجائے ایک دیا جلا لینا بہتر ہے“

موجودہ حالات کے تناظر میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے کئی گنا زیادہ  
بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ حکومت نے پاکستان کے مقصد و وجود کی تکمیل کی غرض سے اسلامی  
نظام کے قیام کے لیے لائق ذکر پیش رفت کی ہے۔ اس نے معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے  
کے لیے زکوٰۃ اور ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ  
کے ضمن میں ضروری اقدامات کیے ہیں۔ قومی وقار اور تشخص کے لیے اردو زبان اور قومی لباس کی  
ترویج کے لیے کوششیں کی ہیں۔ حکومت کی ان باتوں کو لوگوں نے جس طرح سراہا ہے اس سے ان  
کی اسلامی نظام سے محبت اور قومی تشخص سے لگاؤ کا پرتوش اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس موقع  
پر ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی بیج کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر اس کو بونے  
سے پیشتر زمین میں صحیح طور پر پل نہ چلا یا گیا ہو اور زمین کو جھار جھکاڑ سے پاک نہ کیا گیا ہو  
تو اس بیج سے مطلوبہ فصل حاصل نہ ہوگی۔ اس حقیقت کو ایک اور طرح یوں سمجھا جاسکتا  
ہے کہ دودھ ایک خالص اور مکمل غذا ہے لیکن اگر معدہ اس کو سہم کرنے کی صلاحیت سے  
محروم ہو تو وہ جسم پر مطلوبہ فوائد مرتب نہ کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم کسی نظام کو قبول کرنے  
کے لیے ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار نہیں ہے تو محض قانون کے نفاذ سے اس نظام کے فوائد اور  
برکات منظر عام پر نہیں آسکیں گے۔

اسلام ایک پاکیزہ نظام حیات ہے، یہ اپنے نفاذ کے لیے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ  
دلوں اور دماغوں کو جہالت اور جاہلیت کی خرابیوں سے پاک کیا جائے۔ جن صورتوں میں طریق  
کار اپنایا تھا۔ آپ نے اہل ایمان کا پہلے تذکرہ کیا اور پھر ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور  
ان کو اسلامی احکام و ضوابط پر عمل کرنے پر آمادہ کیا۔ اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ اخلاقی  
ترسیت کا کام جاری نہ رکھا گیا تو اسلامی نظام قانون کی کتابوں میں تو محفوظ ہو جائے گا لیکن  
عمل کی دنیا میں اس کا سکھ نہ چل سکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس وقت اخلاقی بحران سے دوچار ہونے کے باوجود بے حسی کا شکار نہیں  
ہیں، ہمیں احساس ہے کہ ہم ان اخلاقی اوصاف سے محروم ہیں جو امت مسلمہ کا طرہ امتیاز رہے

ہیں۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو مجتمع کر لیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے ہاں اخلاقی بے راہروی اس لیے عام ہو رہی ہے کہ شرکی قوتیں بے لگام ہیں، منظم ہیں اور جارحانہ اقدامات کر رہی ہیں؟ جبکہ اخلاقِ حسنہ کے شدید انتشار ہیں اور ملافعانہ جلد جہد پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں سورۃ والعمرہ کو سرزبان بنانا چاہیے۔ ارشادِ ربّانی ہے :

وَالْعَصْرُ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ اَلَا الْاِنْسَانُ اَلَمْ يَكُنْ اَمْسًا وَعَمِلًا  
الصَّدَقَاتِ ۝ وَلَوْ اَصْرًا بِالْحَقِّ ۝ وَلَوْ اَصْرًا بِالصَّبْرِ ۝

ترجمہ : زمانے کی قسم۔ انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

صحابہ کرامؓ کی نظر میں اس سورت کی اہمیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن حفص الدارمی ابومدنیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں جب در آدمی ایک دوسرے سے ملتے تھے تو اس وقت تک جدانہ ہوتے تھے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ والعصر نہ سنالیتے تھے؟ اس سورت میں عالمگیر اور ہمہ گیر خسارے سے بچنے کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ ایمان لائیں، عمل صالح کریں اور دوسروں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کریں۔ اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کو برداشت کریں اور دوسرے ساقیوں کو صبر کی تلقین کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام اور اصلاحِ اخلاق کی اہم ہم کو کامیاب بنانے کے لیے چار صفات اپنانے کی ضرورت ہے : ایمان، عمل صالح، نصیحتِ حق اور تلقینِ صبر۔ یہ چاروں صفات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ نصیحتِ حق میں تعلیمِ اخلاق اور تلقینِ صبر میں تعمیر کردار کا مفہوم بھی پانا جاتا ہے۔

یوں تو اصلاحِ اخلاق ہم سب کی ذمہ داری ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ مؤثر اور فعال کردار تعلیم یافتہ افراد ادا کر سکتے ہیں۔ ان میں استاد، عالم، ادیب، شاعر، صحافی، حکیم، ڈاکٹر اور وکیل وغیرہ سب شامل ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہر شخص دوسرے شخص کی طرف اور ہر شیعہ کے لوگ دوسرے شعبوں کے لوگوں کی جانب دیکھتے رہیں ہر شخص اور گروہ کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے، اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اور سب سے پہلے خود اپنا علاج کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کا فریضہ بھی سراجِ مہم دینا چاہیے۔ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی سے نہ تو



عوام پہنچ سکتے ہیں نہ محکم، نہ اخبارات و رسائل کے مالکان پہنچ سکتے ہیں نہ ذرائع ابلاغ کے کارپردازان۔ اگر اخلاق کے علمبرار چاہتے ہیں کہ وہ معاشرے میں ایک مظلوم اقلیت بن کر نہ رہ جائیں تو اس نین معروف اخلاقی قدروں کی ترویج کے لیے مسلسل جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا۔

## نوٹ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے:

- |                              |                                 |
|------------------------------|---------------------------------|
| (۱) اخلاق اور فلسفہ اخلاق    | از مولانا حفظ الرحمن سیوٹا ندوی |
| (۲) اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر | از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی |
| (۳) سیرۃ النبیؐ، جلد ششم     | از مولانا سید سلیمان ندوی       |
| (۴) زادِ راہ                 | از مولانا جلیل احسن ندوی        |
| (۵) پیامِ انسانیت            | از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی |
| (۶) تزکیۃ نفس                | از مولانا امین احسن اصلاحي      |

# عدل اجتماعی — تصور و نفاذ

جناب محترم ڈاکٹر امان اللہ خان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ  
 وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ  
 خَلَقْنَا تَفْضِيلًا" (سورة الاسراء) ۷۰

اور بے شک ہم نے افراد نسل انسانی کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری  
 میں سواریاں عطا کیں اور انہیں پاک چیزوں سے رزق دیا نیز بہت سی  
 ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو فضیلت عطا کی۔

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ  
 وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (سورة الحديد) ۲۵

(اور بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ  
 کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کے سہارے کھڑے ہو جائیں)۔

”سوشل جسٹس“ یا ”عدل اجتماعی“ کی اصطلاح عمر حاضر میں بڑی ہر دو لغت زیر ہوئی ہے،  
 اور بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا تصور ہے جو تہذیب حاضر کا وضع کردہ ہے۔

یہ بات حقیقت پر معنی نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ مختلف نظامات بالخصوص اسلامی نظام  
 حیات اور نبوی تعلیمات سے ناواقفیت ہے۔ سوشل جسٹس کے جدید تصور اور عدل اجتماعی  
 کے اسلامی تصور کا جب یہ نظر غائر تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ  
 مغربی تصور ادھوراء نامکمل اور نسل انسانی کے لیے حقیقی معنوں میں نفع رسا نہیں۔

اس کے برعکس نبوی تصور عدل تمام پہلوؤں کے لحاظ سے کامل ہے اور اس میں افراد  
 نسل انسانی کے نفع، ان کی اصلاح اور تعمیر و سکون کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔

کتاب ”SOCIAL JUSTICE“ کے مشہور مصنف بالڈون (R.W. BALDWIN)

مغربی تصور کی اہمیت اور ترویج کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

“ JOINTLY WITH ECONOMIC GROWTH, SOCIAL JUSTICE HAS BECOME THE FAVOURITE THEME OF POLITICAL PLATFORMS, ALMOST SUMMARY DEFINITION OF THE ACCEPTED GOAL OF MODERN SOCIETY. YET JUSTICE ITSELF IS ESSENTIALLY A QUALITY OF THE BEHAVIOUR OF ONE MAN TO ANOTHER, THAT IS OF MAN IN SOCIETY, SO THAT ALL JUSTICE IS SOCIAL JUSTICE ..... ”

“ SOMETIMES THE TERM MAY BE USED TO DISTINGUISH MORAL OR NATURAL JUSTICE FROM THE LEGAL JUSTICE OF THE LAWS ENFORCED BY PARTICULAR STATES. MORE OFTEN, HOWEVER, IT IS PROBABLY MEANT TO DESCRIBE JUSTICE IN THE BROAD FIELDS OF SOCIAL AND ECONOMIC POLICY, AS CONTRASTED WITH THE JUSTICE IN PERSONAL AND PRIVATE AFFAIRS WHICH THE LAW COURTS OF ALL AGES AND COUNTRIES HAVE TRADITIONALLY ADMINISTERED ” ( PAGE 1 )

اجتماعی انصاف کے حصول کو جدید سوسائٹی کا بنیادی مقصد قرار دینے والی تہذیب مغرب اس مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہے اہل دانش بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں اور وہ اس ناکامی کے اس اہم ترین سبب سے بھی آگاہ ہیں کہ وہ اذکار و تصورات اور نظام جن کی بنیاد خالص عقلی اور مادی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ پُر غلوں، پُر اشارہ اور نفع رساں رویہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ تجربے اور تاریخ نے اس

بات کی پوری پوری شہادت دے رکھی ہے۔

شورجی نارہ جرمین مفکر مغرب کی مادی والحادی تہذیب کے پیدا کردہ انسان سے مکمل طور پر ناپسندیدہ ہو کر اسی لیے پکار اٹھا:

“MAN IS WOLF OF MAN”

بالذات اجتماعی انصاف کے حصول کے سلسلے میں جس انسان پر کام کا آغاز کرتا ہے وہ بھی پیدا نشی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے۔

“JUSTICE ACCEPTS THAT MEN ARE SELFISH,  
BUT STIPULATES THAT ONE SELF IS AS IMPORTANT  
AS ANOTHER, AND THEREFORE REGULATES THEIR  
CONFLICTING INTERESTS.” (PAGE 230)

اس کے برعکس اسلام نے جس انسان پر کام کا آغاز کیا وہ عزت دار ہے، خدا کا نائب ہے، اعلیٰ ترین امانت کا حامل ہے اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کا مصداق اور ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَوَّلَىٰ كَاخْطَابٍ یافتہ!

اجتماعی عدل کی اگر یہ تعریف کی جائے کہ یہ ایک ایسے تصور کا نام ہے جس میں انسانوں کے معاشرتی، قانونی و عدالتی، معاشی اور سیاسی حقوق و فرائض کی نشانی دہی کی جاتی ہے تو بے عمل نہ ہوگا۔ اس تصور کے قیام سے مقصود ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اعتدال، توازن اور امن ہو۔ جو خوف سے پاک ہو، جس میں انسانوں کو ان کے مذکورہ بالا حقوق حاصل ہوں، ان کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت ہو۔ اور ان حقوق کو پامال کرنے والوں کو ناکام بنانے کا پورا پورا انتظام ہو۔

ہماری یہ خوش بختی ہے کہ اجتماعی انصاف کے ان چارہاں پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف قرآن و سنت کی واضح تعلیمات موجود ہیں بلکہ اس کا عملی نمونہ اس معاشرے کی صورت میں موجود ہے جو سرکارِ دو عالم مادی و جہاں رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل دیا تھا۔

## اصلاح فرد

اے اپنے نے فرد کی روحانی و اخلاقی اصلاح و تعمیر پر سب سے زیادہ توجہ فرمائی اور اپنے ساتھیوں کے دلوں کو روحانیت سے بھر دیا۔ رنگ و نسل، خاندان، علاقے اور وطن کے امتیازات کو مٹا دیا۔ انھیں عظمت و عزت کے ایک نئے تصور سے آگاہ کیا، انہی و حریت کی تشکیل دے ماسیس کی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ..... (نساء: ۱)  
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ..... (مجادلہ: ۱۳)

حدیث: لا فضل لعربی علی عجمی ..... (مسند احمد بن حنبل)  
انسانوں کو یہ سب حقوق انقلاب فرانس اور یو این اد کے بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر سے صدیوں پہلے عطا ہوئے۔

## قالونی وعدالتی انصاف

عدل کے بارے میں قرآنی آیات لا تعدوا دین۔ ان کے حوالے سے عدل کا اعلیٰ ترین معیار قائم ہوا۔

قانون کے سامنے مساوات کی عملی مثالیں موجود ہیں۔ عدلیہ و انتظامیہ کی علاحدگی اسلامی تعلیمات کا جزو ہے۔

## معاشی انصاف

- معاشی اصول و تعلیمات اسلام کے پورے نظام کا ایک اہم حصہ۔
- معیشت کی اساس اخلاق پر رکھی گئی۔
- نفع رسانی کا اصول "اما ما ینفیع الناس فیسکت فی الارض"۔
- گردش دولت و اکتار و استحکام کی ممانعت۔

- حلال و حرام کی تمیز، ربا کی حرمت ، حوس و بخل کی ممانعت ۔
- محنت کی عظمت و اہمیت ۔
- زکوٰۃ ۔ اتفاق فی سبیل اللہ ۔ قرضِ حسنہ ۔
- اجتماعی کفالت عامہ ۔
- معیشت کو درہم برہم کرنے والے جملہ غامر کا سدباب ۔

## سیاسی انصاف

۱ وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنکم

فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم

۲ "امرهم شورى بينهم"

تکمہ داغ و کلکم مسؤل عن رعیتہ " (الحدیث)

عدل اجتماعی کے اس واضح ، جاندار اور انتہائی نفع رسا تصور پر نبوی معاشرہ قائم ہوا۔ خلافت راشدہ بھی اس کا ایک گرہ قدر عملی مثال ہے۔  
صالح مسلمان حکمرانوں نے بھی ان تعلیمات پر حتی الامکان گامزن ہونے کی پر غلوص کوشش کی۔

## دورِ حاضر میں اس کے نفاذ کی عملی تجاویز

فرد کی اصلاح ، تعلیم و تربیت اس انداز پر ہو کہ اس کا دل روحانیت سے بھر جائے  
کیونکہ دین کا مقصد ایک روحانیت بھرا دل ہی پیدا کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری رہنمائی وہ عظیم طریق تعلیم و تربیت اور دستور تزکیہٴ نفوس کرتا ہے جسے معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔

۵ فرد کی تعمیر شخصیت میں ہمارا نظام تعلیم اور بالخصوص انصاف تعلیم بڑی بنیادی اہم فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

جب تک جملہ انصاف تعلیم کی اساس اسلامی اصولوں پر نہیں اٹھائی جاتی اور اسے  
الحادی مادی و لادینی اصول و انداز کی زد اور یلغار سے بچا نہیں لیا جاتا منتشر  
اور الجھا ہوا ذہن رکھنے والے طلبہ و افراد پیدا ہوتے رہیں گے جن سے اجتماعی عدل

پامال ہوتا رہے گا۔

۵ فرد کی روحانی تربیت و ارتقا کے بارے میں ذرائع ابلاغ کو اپنی ذمہ داری مستعدی سے پورا کرنی چاہیے۔

۵ علمی اور فکری سطح پر جدید مادی و المادی تہذیب کو پورے طور پر دبے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔

۵ قلوب و اذیان پر ہونے والے منفی اثرات کا موثر سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلے میں نہ صرف مغرب سے آنے والے بدعتی پر مبنی لٹریچر پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ملک میں مکھڑے جانے والے پر بھی۔

۵ اجتماعی عدل کے قیام کے لیے منظم اجتماعی اور فعال ادارے بنانے کی ضرورت ہے جن کی اساس نبوی تعلیمات ہوں اور جن کا انداز بھی نور نبوت سے مستفید ہو۔ نیز موجود اداروں کی تشکیل نو کا اہتمام بھی ہو۔ فلاح عامہ اور معاشرتی بہبود کے پروگراموں کو اولیٰ زیادہ منظم، وسیع، فعال اور حقیقی معنوں میں نفع رسا بنانے کی ضرورت ہے۔

اعتساب و تانوں کی قوت بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار سرانجام دے سکتی ہے۔

## اخلاق

نبوت ہے اکتساب فیض کی شرط اور علامت

بجنب محترم پروفیسر حافظ احمد یار  
تَحْنِ الْعَفْوُ وَأَمْزُ بِالْعَرْفِ وَأَكْغَرُ عَنْ عَيْنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف ۱۹۹)  
سیرت نگاران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر  
اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ  
کی بعثت کے لیے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا ؟  
مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ”ثورة الاسلام وبلل الانبياء“ کا آغاز ہی اس  
طرح کیا ہے :

في تاريخ العالم وقصص الحضارة الانسانية وفي اخبار العرمان  
و ابناء المدنيات القديمة والحديثة صفحات غامضة  
والغائر معقدة يقف الباحث والقارئ حيا لها صدها  
حائرا .....

.... ومن هذا الالغاز المعقدة اختيار العناية  
الالهية بجزيرة العرب لتكون مسرحا لافوار النبوة  
ومصدر الرسالة الانسانية ومهد الحضارة العربية ؛  
دينا في تاريخ ، انساني تمدن کی داستان اور قدیم و جدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے  
ہی ناقابل توجیہہ واقعات اور پسلی یا معہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں  
سمنے آتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر یا سن کر آدمی جو سیرت رہ جاتا ہے۔ ....  
..... اور اسی قسم کے ناقابل فہم معمول میں سے یہ پھینتان بھی ہے  
کہ آخر اللہ تعالیٰ نے افوار نبوت و رسالت کی تجلی کا ہ بنانے کے لیے جزیرۃ العرب  
کو ہی کیوں منتخب کیا ؟ ( لطفی ص ۱ )

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً سوال دیتے ہوئے یہ سوالیہ درپا ہے :



بِمَا اخْتَارَهُمُ اللَّهُ لِيَكُونَ لَهُمْ مَصَدَقٌ مِنْ دِينِهِ وَ مِنْبَعُهُ  
و مِنْبَعُهُ دُونَ مَا تُخْلَقُ بِهِ ؟

آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین  
کا سرچشمہ اور اس کا مرکز و منبع بنانے کے لئے کیوں چن لیا ؟ (لفظی ص ۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں عربوں کی خصوصیات اور  
خیرالام بننے کی صلاحیت کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب میں بحث کی ہے۔ اس  
موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ”نبی رحمت“ میں  
کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے : ”محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب  
میں کیوں مبعوث ہوئے ؟“

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لیے  
اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف  
اسباب و دلالت گنوائے ہیں مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص  
اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرت سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک  
محفوظ رکھا۔

یہ سوالات کہ آخر اللہ نے اُس وقت کی تمام مذاہب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر  
عرب کے ان گناہ صحرائیوں کو اس منصبِ عظیم کے لئے کیوں چن لیا ؟ اگر یہی نبیؐ  
ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک  
میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے ؟ اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ  
ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعہ سے ہوا ؟ — جو وقت کی ”بہترین طاقتیں (SUPER  
POWERS)“ تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی بہترین امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے  
سکتی تھی ؟ کیے جاسکتے ہیں۔

بظاہر یہ سوالات غور نظر آتے ہیں اس لئے کہ مصاححِ کلیۃ اللہ کا احاطہ انسان کے  
بہن کی بات نہیں ہے۔ اور اسی لیے خود قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ  
اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام ۱۲۴)  
- اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالے  
کیا جائے۔

اس انداز پر فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبیؐ سے انتساب اور اسلام اسلام کے فخرہ ماننے بے حد و حساب کے باوجود ان کے فیوض و برکات سے اکتاب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ ————— کیا ہم کہیں عہد جاہلیت کے سیود و بنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو مسخر نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتاب فیض کی شہرہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

کہیں فساق کے اخلاق اپنا کرم آیات مندرجہ ذیل کا مصداق تو نہیں بن رہے مثلاً:

کَالَّذِينَ اتَّكَبُوا الْكُتُبَ مِنْ قَبْلِ فَطَالِ عَلَيْهِمُ الْأَمْدُ فَتَسْتَفْتِيهِمْ فِي شَيْءٍ مِنْهَا

قلوبہم۔ وکثیر منہم فاسقون (المحید: ۱۶)

ان لوگوں کی طرح جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک نبیؐ مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان کی اکثریت فاسقوں کی ہے۔

وَمَا يَنْضِلْ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۚ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ

بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ

فِي الْأَرْضِ - وَلَئِنْ هُمُ إِلَّا خَاسِرُونَ (البقرہ: ۲۷)

اور وہ اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے تو ان بد عمل لوگوں کو تو پکا قولی قرار

کیے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن جن تعلقات کے بوڑے رکھنے کو

خدا نے فرمایا ان کو توڑتے ہیں اور زمین میں بد عنوانیاں پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ

(آخر کار) نقصان اٹھائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کا پلٹ

دی وہ عجائبات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلبی ماہیت اور تاریخ عالم

کے اس سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہم گہری اور

وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت نگار ظہور اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب

کی خصوصاً درمی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت ————— بلکہ ان سب حالتوں کی

ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے

مجھے یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم و بیش سیرت یا

تاریخ اسلام کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل اور اساسی

وجہ کا تجزیہ اور تذکرہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اور اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دور کے رسم و رواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معنایہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے، بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔ \_\_\_\_\_ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس مومنوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہب عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ نامے معارف (انسائیکلو پیڈیا) کے ذریعہ سے اپنی معلومات میں اضافے کا موقع ملا جن کا شاہ صاحب کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرت انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا منظر معلوم ہوتا ہے۔

یہاں بوجہ قلت وقت حجتہ اللہ البالغہ کے اس اقتباس اور اس کے ترجمے کو حذف کیا جاتا ہے جو حجتہ اللہ کے مکتبہ المثنیٰ بغداد کے ایڈیشن کی جلد اول کے صفحہ ۲۲ - ۲۳۰ سے لیا گیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل و تفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی، تن آسانی اور دنیوی لذائذ و منافع کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتساب فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الائم بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے (جیسا کہ صحابہ کرامؓ کی صورت میں ہوا) یہ تو ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ \_\_\_\_\_ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیت الہی نے ان اقوام کو اس منصب عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام ردائیل و فضائل پر ایک نظر ڈالیں جو فیضان نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر اسے ”شبہ ملت“، ”عرب کا تاریک دور“ اور ”فساد بر و بجر“ وغیرہ عنوانات کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام، سنگدلی و سفاکی، چوری اور زہرینی، قتل و غارت، بے حیائی و بدتمیزی، زنا اور فواحش، نسی تعصب و غرور، قمار بازی و شہاب نوشی اور دغتر کشی و

سود خوری میں ضرب المثل تھے اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معری نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظام اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقی حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی فیاضی اور سخاوت کا منظر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندی عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (جہلائی)، امانت، مدنی الحدیث (راست گوئی) اور عفاف (پاکدامنی) کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاق حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلب، حب نہاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکام شمار کیا۔ مشہور حدیث: "خیار کمر فی الجاہلیۃ خیار کمر فی الاسلام" (الجامع العقیقہ ۲۵ ص ۹۵) میں اسی "تحویل قبلہ اخلاق" کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی "خیار کمر کی تفسیر "خیار کمر احاسنکم اخلاقاً" سے کی گئی ہے (الجامع الصغیر ۲۵ ص ۹۵)۔

دور جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک مثال تاریخ نے "حلف الفضول" کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جہل کے مکان پر منعقد ہونے والے اس حلف میں (حسین کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض شریف خانوادوں کے نمائندوں نے یہ دیکھا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم اور نا انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار ممبر یا غاموش تہ شان کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ مظلوم کی علی اور مظلومین مدد کریں گے۔

یہ حلف جسے سیرت نگار "اکرام خلف" و اشرفہ سمع بہ فی العرب" (عربوں کی تاریخ کا سب سے شرفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں۔ ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و

مقام دیوں تھے :

فتعاقدوا و تعاھدوا الا یجدوا بمکة مظلوماً من اھلھا  
و غیر ھم ممن دخلھا من سائر الناس الا کالوامعہ و  
کالنوا علی من ظلمہ حتی ترد علیہ مظلمتہ ۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۴ - ۱۳۳)

انھوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی  
وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے ۔ اور  
ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کینے کیے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔  
کہا جاسکتا ہے بلکہ لیا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرہ نفاذ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف حرم مکہ  
میں مظالم کی روک تھام اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا۔ تاکہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ  
ہونے پائے۔ (طبری ص ۱۴۵)

مگر حضرات! کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم  
ہے؟۔ چلیے اپنے وطن یا شہر کی سالک کی خاطر ہی سہی۔ سالانہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔  
پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدے کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دہلی اور  
بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن کثیر  
جلد ۱ ص ۶۰ - ۲۵۹)۔

آج یوں اور اسلامی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ الغاف اور حق کو کس طرح  
اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں، اسے سامنے رکھیں تو حلف العنقولی منعقد کرنے والوں کی  
اخلاقی قوت، ان کی فطرت سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الہام کے ہر اہل دستور میں شمولیت کے شرف  
کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہان خود بھی ربع ۲۰ سال، عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدے میں شامل  
ہوئے تھے۔ آپ اس معاہدے سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و  
ستائش کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں  
تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظت حق  
اور اعانت مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے بھی کچھ نیچے

ہی کے درجے پر ہیں۔ بقول امین دویدار (صورہ ۱۱۳، اہل عرب کی مثل ایک ایسی زنجیر زین کی تھی جو کاشت و نگہداشت کے نہ ہونے کے باعث خود رو خاردار سبھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوتِ نم سے محروم نہیں ہوا تھا۔ بادیِ برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو تربیت دیکر مکارمِ اخلاق کی بندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور مستفاد ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ (کافوا احق بہا و اھلھا) (الفج ۲۶)

ہمارے اس موقف کی۔ کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے لیے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ————— ٹائڈ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔ سب سے پہلے ام المؤمنین خدیجہ کا معاملہ دیکھئے وہ جاہلیت میں اپنی پاکبازی کے باعث ظاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔

كانت تدعى في الجاهلية بالطاهرة لشدّة عفافها

وصيانتها (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۸) (حاشیہ)

وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاکدامنی کے باعث ظاہرہ کہہ کر لپکاری جاتی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی رغبت کا باعث بھی آنحضورؐ کے اخلاقی محاسن تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپ کو گھر بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا۔

یا ابنِ عم! انی رغبت فیک لقرابتک و سطتک فی قومک و امانتک  
و حسن خلقک و صدق حدیثک (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹)

اے میرے چچا زاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔

ازاںجملہ یہ کہ آپ سے میری برادری کی رشتہ داری بھی ہے۔ آپ اپنی قوم میں صاحبِ عزت بھی ہیں ان سب پر مستزاد آپ کی امانت، اخلاق اور راست گفتاری ہے۔

میل و محبہ کے نزول اور کعبشت کے ابتدائی ایام میں ہوا واقعات و حالات پیش آئے تھے

ان کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی :  
 كلا والله ! ما يخزيك الله ابدا، انك لتصل الرحم وتحمل الكل  
 وتكسب المعدوم وتقوي الضيف وتعين على نوائب الحق -

(زبور البیاری ص ۳۴)

ہرگز نہیں بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے  
 ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور  
 راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اُن کے بارے میں بھی

سیرت نگار لکھتے ہیں :

..... کان (ابوبکر) .....  
 سر جلا تا جوا اذا خلق و معروف .....  
 ..... حضرت ابوبکرؓ ..... ایک .....  
 یا اخلاق اور نیک دل تا جبر تھے ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنے کے بیان میں  
 ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آکر ابوبکر صدیقؓ بھی آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو  
 ایک دن کے فاصلے پر انھیں ابن الدغنے ملا (اصل نام سبیع بن ربیع تھا اور وہ اس وقت  
 احابیش کا سردار تھا، جو ایک مجموعہ قبائل تھا، اس نے پوچھا این یا ابوبکر۔ کہ تم کہاں چلے؟  
 جب انھوں نے بتایا :

انصرحنی قومی فأذنی و ضیقوا علیّ -

کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھے بہت ہی اذیت  
 پہنچائی اور سخت مصیبت میں ڈال دیا۔

تو ابن الدغنے نے کہا :

ولیمہ؟ فواللہ انک لتزین العشرینہ و تعین علی نوائب  
 الحق و تفعل المعروف و تکسب المعدوم و ارجع فأنت فی جوارى

(ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳ - ۴۲)

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سبحان آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلیے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں ہم ان دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ تمام بظن اولین صحابہ کرام میں قبی از اسلام ہی کسی نہ کسی خاص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ہی ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپ کے ”خلق عظیم“ ہی کی وہ سبھک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ آنحضرتؐ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے (عیون الاثر ج ۱ ص ۷۷) مگر حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کے صاحب خلق عظیم ہونے کا تعلق بھی آپؐ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیات نبویؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ:

وانک لعلى خلق عظیم

کہ آپؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلم امر ہے (کو کو رس کے ہند کی حیثیت حاصل ہے اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ سے مروی مشہور حدیث:

کان خلقہ القرآن

کہ آپؐ کا اخلاق تو قرآنِ عظمیٰ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اخلاق کی تشکیل اور مکام کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی — مگر حضرات! قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ وانک لعلى خلق عظیم سورہ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورہ القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی مکی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ (وانک لعلى خلق عظیم) آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن کریم نے پیش کی ہے۔

اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۃ یونس اور سورۃ عنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی



دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)

قرآن حکیم کا آپ کے خلقِ عظیم کو بطور دلیلِ نبوت پیش کرنے سے مدحیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں از الجملہ :

۱ - اولاً یہ کہ - اہل مکہ و جو جاہلیتِ عرب کے رذائل و فضائل کے نمائندہ قرار دیے جاسکتے ہیں، میں اتنی اخلاقی سرسِ ضرورت تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کیے جاسکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کے اخلاقِ عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی صورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہٗ رذائل ہو، چاہے وہ کتنا ہی صاحبِ جاہ و مال ہو اُسے ہیچ سمجھو۔ فرمایا :

فلا قطع کل خلاف مہینہ ہمار، مشاء بنسیمہ منع للخیار  
معتدا شیمہ علی بعد ذالک زیمہ ان کان ذامال و بنین

القلم ۱۴ - ۱۰)

ہرگز نہ دلو اس شخص سے جو تمہیں کھانے والا، پست فطرت، طعنہ جو، چغل خور، مانع خیر، دھاندلی باز، بد عمل، جفا کار اور ساتھ ہی بد اصل بھی ہے۔ محض اس بنا پر (جو بدی بنا پھرنا ہے) کہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مخالفینِ خلقِ عظیم اور ان آیات میں بیان کردہ رذائلِ تسو کے تغایر اور تباہی کو (CONTRAST) سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

۲ - ثانیاً یہ کہ - اس آیت (وانک لعلی خلق عظیم) کے مضمون اور اس کے زمانہٗ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ قبل از بعثت ہی صاحبِ خلقِ عظیم تھے۔

محمد عزت دروزہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :

وهذا یعنی الخلق العظیم الذی کان علیہ النبی علیہ السلام و  
ستحق بهذا الشاء الربانی، قد کان تعلیٰ بہ قبل البعثة  
وهو الذی آھلہ لا مصطفاء والہمة العظمی واللہ اعلم  
بحیث یجعل رسالذہ (التفسیر الحمدیہ ج ۱ ص ۴۵)

اور یہ خلقِ عظیم جس کی بنا پر آنحضورؐ اس شانِ ربانی کے مستحق ٹھہرے۔ اس سے آپ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے۔ بلکہ اسی چیز نے آپ کو اس برگزیدگی

اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے

کہ اس کی رسالت کے لیے کون اور کتنا موزوں ہے ؟

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضورؐ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے تدریجاً نمودار UNFOLD کیا ہے۔ قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کے خدو خال فی مکمل تصویر کشا ہے۔ اور اسی لیے آپؐ کی ذات گرامی کو امت کے لیے ”اسوۂ حسنہ“ قرار دیا۔ خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۳۔ ثالثاً یہ کہ — اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوت محمدیؐ (علی صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی و نقلی دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس کے لیے عہد رسالت اور قرن اول کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف وہی مجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ ایک قرآن دوسرے اخلاق النبیؐ۔ ابتداءً اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا، یا نبیؐ کا خلق عظیم دیکھ کر۔

اہل مکہ خلق محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے — مابعد النبیؐ ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت مبارکہ لانگ لعلی خلق عظیم، کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف اخلاقیات نبویؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر واجب استطاعت، فرض عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

۴۔ رابعاً یہ کہ — آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور موثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لیے اس کے غلبہ کا دور ثانی لانے کے لیے اور فیوض و برکات نبوت کو پھیلانے کے لیے صرف اور صرف گرمی گفتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سمینار نہیں، بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ اور تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی — اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے امت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً ہی صرف اخلاقی تطریباتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا۔ اور توحید و رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محض اخلاق سے عملاً مرتب ہونا مسلمانوں کی ایک لازمی خصوصیت — یا بالفاظ دیگر نبوت سے

اَلکتاب فیض کی علامت قرار دیا ایسی کہ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عمد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام کے کارنامہ نائے نبیات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریافت احوال کے لیے مکہ بھیجا۔ تو اس نے واپس جا کر آنحضرت کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

انه يا صر بالمعروف وينهى عن المنكر ويأمر بكمارم الاخلاق (طبقات ج ۴ ص ۲۲۴)

وہ بھائی کا حکم دیتا، برائیوں سے منع کرتا ہے اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔

یہاں اخلاق کے ضمن میں ”تعلیم، تلقین یا تبلیغ وغیرہ کے بجائے امر کا لفظ قابل غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوت عمل سے ہے۔ یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

۲۔ ہجرت حبشہ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابوطالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تقصیر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدائی سے شروع ہو گیا تھا بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اَلکتاب فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آجاتی تھی۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابل غور ہیں۔ کہا:

ايها الملك كنا قوما اهل جاهلية نعبدا الاصنام و  
نأكل الميتة وناقي الفواحش و نقطع الارحام و نلبي الجوار  
و يأكل القوى منا الضعيف .....  
حتى بعث الله رسولا منا لعرض  
نسبه و صدقه و امانته و عفافه .....  
فدعانا الى الله لنوحده و نعبده و لا نشرك به شيئا ..  
ويا مرنا بالصدق الحديث و الايام

الامانة. وصلة الرحم وحسن الجوار والكف عن البحارم  
والدماء ونهاها عن الفواحش وقوى الزور واكل مال اليتيم  
..... فآمنابه .....

واستبعنا ..... وحررنا ما حرم علينا  
وحللنا ما احل لنا - (سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱ - ۱۸ ملخصاً)  
اسے بادشاہ! ہم پروردہ جاہلیت قوم تھے، بتوں کو پوجتے، مردار کھاتے  
اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور عیالوں  
کو دکھ دیتے تھے اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو بچاؤ کرکھا جاتا۔  
..... پھر اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے  
خاندان حسب و نسب اور جس کی سچائی، امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے  
سے واقف تھے .....

انھوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت  
دی ..... اور انھوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا  
کرنے، رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے، پڑوسی سے حسن سلوک کرنے،  
نا جائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں،  
جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا .....  
بس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی .....  
جو انھوں نے حرام قرار دیا اسے حرام مانا اور جو انھوں نے حلال قرار دیا اس  
کو حلال تسلیم کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ  
آپ زمانہ جاہلیت کے اصحاب مکارم و محاسن کی قدر دانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو  
بظہرِ استحسان دیکھتے تھے۔

- ۱۔ عبد اللہ بن جعدان ربانی شلف الغفول (کو آپ نے کئی دفعہ تعریف بھرے الفاظ  
سے یاد فرمایا۔ حالانکہ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ حسن آدمی نے (ایمان لاکر) زندگی میں ایک  
دفعہ بھی: اللھم اغفر لی خطیئتی یوم الدین نہ کہا جو اس کی مغفرت کیسے ہو؟
- ۲۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی

مفتی - اُس نے آنحضرتؐ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی :

یا محمد! هلک الوالد و غاب الوالد - فان رأیتان تخلی  
عنا فلا تشمت بی احیاء العرب فان ابنتہ سید قومی وان ابی  
کان یحیی الذمار و یدفک المعانی و یشبع الجائع و یکسو العاری  
و ینقیوی المضعیف و یطعم الطعام و یفرج عن المکروب و لم یدر  
طالب حاجة قط . . . . .  
اُنا بنت حاتم طییء -

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :

یا جارية هذا صفته المؤمنین حقاً ولو کان ابوک اسلامياً  
لترحمنا علیہ - نخلوا عنها ! فان اباها کان یحب مکارم  
الاخلاق واللہ یحب مکارم الاخلاق

حضور میرا باپ زمانہ فدیہ گزارہ - اگر مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل  
عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں میں اسنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں -  
میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا وہ نیک شہرت کا مالک تھا، مہمان نواز  
کرتا تھا اور بھوکوں تنگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا - اور اس نے کبھی کسی  
حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا -

میں حاتم طائیؓ کی بیٹی ہوں

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

یچی ! یہ باتیں (جو تونے بیان کیں) یہ تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں -  
اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے - پھر حکم دیا  
اسے رہا کر دیا جائے - کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا - اور  
اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے -

یہ سن کر ایک صحابی البور بدہ بن نیدار کھڑے ہوئے اور سوال کیا - یا رسول اللہ کیا  
مکارم اخلاق آپ کو - اسفند پسند ہیں تو آپ نے فرمایا :

والذی نفسی بیدہ لایین نخل احد الجنة الا بحسن الخلق -  
(سیرۃ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۳۲ ملخصاً)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی ایک آدمی بھی جنت میں  
”محسن عقی کے بغیر نہیں جائے گا۔“

جب بھی ہم مکالم اخلاق اور اخلاقیات نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار  
کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لیے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب فوری  
ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا احتیاطی حکم  
عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تغیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ”اجتناب کبائر“ اور ”مسابقت  
الی الخیرات“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ فکفر عنکم سیئاتکم وندخلکم  
من خلا کریماً

یعنی بن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے  
بچتے رہو گے تو تمہارے پھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقام عزت  
میں جگہ دیں گے۔

۲۔ وکل وجهۃ حق مولیٰہا فاستبقوا الخیرات

اور ہر ایک قوم کا ایک مرکز توجہ (ملحق نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی  
ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق  
ن تربیت اور تکمیل کے لیے اسی ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے سب سے پہلے ان اصولی اور  
بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔  
ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے۔ اور ایسے شخص میں نبوت سے  
اکتساب فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آئے جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ  
تھا۔ نبی سے تعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام قبول کر لینا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی  
یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار  
کریں۔ اسلام لانے کے بعد مسلمان کسلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہوتے جانا  
اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور  
ہے۔

انکہ از صدق و امانت بے خبر اور تمہید رسالت بے خبر  
کار او گفتار بے کیفِ عمل اور نیامِ علم بے سیفِ عمل  
لذتِ ایمان فزایدِ درِ عمل مردہ آں ایمان کہ ناید درِ عمل (اقبال)  
نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصودِ بعثتِ  
نبویؐ کہا گیا ہے۔  
حدیث شریف ہے،

بعثتُ لاقمہ مکارمِ الاخلاق  
(دینی روایہ) ومحاسن الاعمال

میں مکارمِ الاخلاق کو یا محاسنِ الاعمال کو، مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔  
مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلا درجے تک نہ پہنچ سکتا فیضِ نبوت سے  
یکسر محرومی نہ سہی، کم نصیبی کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموزِ بے خودی میں  
گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا،

انکہ مہتاب از سرانگشتش دو نیم رحمت اور عام و اخلاقش عظیم  
از ہمارش زنگ و لو باید گرفت بہرہ از خلق او باید گرفت

ایک حدیث میں (جس کا متن اس وقت مستحضر نہیں) آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے مال اپنا  
درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے؟ اتنا  
ہی اس کے مال تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے مال ہمارا درجہ کیا ہے؟ دیکھو کہ مصطفیٰؐ سے بعد ہی تو بولہبی ہے (تو یہ دیکھ لینا چاہیے  
کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبویؐ سے کتنا حقہ پایا ہے؟ اس لیے کہ نورِ مولائے حقؐ نے فرمایا:

ان احبکم الیّ و اقر بکم منی یوم القیامۃ احسنکم اخلاقاً و  
ان ابغضکم الیّ و البعد کم منی یوم القیامۃ مساویکم اخلاقاً  
(مشکوٰۃ طبع دمشق ص ۷۹، ۸۰)

قیامت کے دن تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند اور میرے زیادہ قریب وہ  
ہوں گے جو تم میں سے بلحاظِ اخلاق زیادہ اچھے ہوں گے اور قیامت کے دن تم میں  
سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہوں گے جو تم میں  
سے بلحاظِ اخلاق زیادہ بُرے ہوں گے۔

## مفتاح المراجع

اس مقالے کی تیاری میں جو کتابیں سامنے تھیں ان میں سے اکثر کا ذکر متن میں حوالہ دیتے وقت مختصر نام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کی وضاحت ذیل میں کی گئی ہے۔ کتابوں کے نام اسی ترتیب سے ہیں جس طرح مقالہ میں وہ وارد ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے حوالے سورۃ کا نام آیت نمبر کے ساتھ دیے ہیں۔

لطفی : لطفی جمعہ کی کتاب : ثورۃ الاسلام وطلی الانبیاء طبع قاہرہ ۱۹۵۹ء  
نبی رحمت : مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تالیف کا (اردو ترجمہ) طبع لکھنؤ ۱۹۷۸ء  
حجۃ اللہ البالغہ : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف۔ ایڈیشن مکتبہ المشی بخداد سنہ ۱۴۰۰ھ

الجامع الصغیر : مولفہ جلال الدین سیوطی طبع مصر سنہ ۱۴۰۰ھ  
ابن ہشام : سیرت رسول اللہ تصنیف عبدالملک بن ہشام طبع مصر (تحقیق السفا  
- وغیرہ) ۱۹۵۵ء

بجواہر : بجواہر البخاری : تلخیص بخاری از مصطفیٰ عمارہ طبع مصر ۱۳۷۶ھ

التفسیر الحدیث : تالیف محمد عزت دروزہ۔ طبع مصر ۱۹۶۲ء

طبقات : الطبقات الکبریٰ تالیف محمد بن سعد طبع بیروت ۱۹۷۰ء

ابن کثیر : السیرۃ النبویہ تالیف حافظ ابن کثیر تحقیق مصطفیٰ عبدالواسع طبع بیروت ۱۹۷۶ء

رموز : رموز بے خودی (ثنوی) علامہ اقبال طبع لاہور سنہ ۱۴۰۰ھ

مشکوٰۃ : مشکوٰۃ المصابیح تالیف ابن الخطیب تبریزی طبع دمشق ۱۹۶۱ء

سیدہ صور : صور من حیاۃ الرسول تالیف امین دویدارہ طبع مصر ۱۹۵۴ء

- م م عیون الاثر : ابن سید الناس کی سیرۃ پر تالیف طبع بیروت ۱۹۷۸ء



# اجتماعی عدل

جناب محترم ڈاکٹر سید معین الحق

اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے، اور ہر جہت کے متعدد پہلو ہیں۔ اہم سے ہر ایک اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے نیز ان اثرات کی روشنی میں جو اسلامی معاشرے کی تشکیل و ترقی میں نمایاں ہوتے رہے ہیں یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کا مختصر بیان بھی ایک ایسے مقالے میں جس کو پیش کرنے کے لیے وقت محدود ہو، سمونا ممکن نہیں، اس لیے اس مقالے میں صرف چند ان خصوصیات اور واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے اسلام میں اجتماعی عدل اور مساوات کے تصور اور اس کی عملی شکل کا تاریخی پس منظر میں اندازہ لگانے کے سلسلے میں مدد مل سکتی ہے۔ اسلام تاریخ عالم کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ اس نظریہ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر شواہد موجود ہیں لیکن ہم اس موقع پر صرف چند واقعات کی طرف اشارہ کریں گے۔ اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں معاشری اور فکری تاریخ کے بعض پہلوؤں کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا، خاص طور پر ان خامیوں کا جن کی جڑیں بعثت نبویؐ کے وقت معاشرے میں اتنی گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں کہ اخلاقی معیارات عملی طور پر تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اس بحث کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ انسانی مساوات اور اجتماعی عدل کا ہے، چونکہ نسل انسانی ایک ہی باپ کی اولاد سے وجود میں آئی تھی یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں سب انسان، حقوق اور حیثیت کے لحاظ سے برابر ہی رہے ہوں گے، لیکن زمانہ ماقبل تاریخ کے طویل ادوار میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا عوامل اور محرکات تھے جن کے باعث انسان، غریب اور امیر اور کمزور اور طاقتور لوگوں کے طبقوں میں تقسیم ہوتا گیا۔ بہر حال تاریخی معلومات کی روشنی میں جب سے ہمیں انسانی زندگی کی حالت نظر آنی شروع ہوتی ہے تو یہ طبقاتی تقسیم صاف اور نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اینیشٹ لاء (ANCIENT LAW) کے مشہور مصنف مین

(MAINE) کی اس رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ غلامی کی ابتدا انسان کی اس پیدا نشی اور حیاتی نصل کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے کی قوت اور صلاحیت کو اپنے آرام اور فائدے کے لیے استعمال کرنا

چاہتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاں ایک طرف عیاشی آرام طلبی، اقتدار کی ہوس اور خود غرضی پھیلی جاتی ہے، دوسری طرف مساوات انسانی کا تکمیل اور اس کو قائم کرنے کی کوششیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ جاسکتا ہے کہ قدیم تمدن اقوام کی معاشری زندگی پر ایک بدنامہ داغ طبقاتی تقسیم تھی، اور اس پہلو کا بدترین مظاہرہ غلامی اور اس کی وسیع پیمانے پر تجارت کی شکل میں موجود تھا۔ غلاموں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کی دیگر منقولہ جائیداد کی طرح ملکیت سمجھے جاتے تھے اور ان کو (آقاؤں کو) ہر طرح کا، حتیٰ کہ جان لینے کا بھی حق تھا۔ طبقاتی تقسیم کا اثر امیر اور غریب طبقوں کی حیثیت اور اہل اقتدار اور عوام کی زندگیوں کے نمایاں فرق میں بھی نظر آتا تھا۔ سلطنت روم میں ایک طبقہ خصوصی اختیارات اور حقوق کا مالک تھا اور عام لوگ ان سے محروم تھے اور پلےین (PLEBEIAN) کہلاتے تھے اور ہمارا برصغیر قواسم لحاظ سے سب سے زیادہ طبقاتی تقسیم کا شکار تھا۔ یہاں ذات کی تقسیم انتہائی حد کو پہنچ گئی تھی اور معاشرے میں اس کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئی تھیں کہ آج تک وہی کیفیت موجود ہے اور خدشات کے لوگ اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطرناک طبقاتی تقسیموں نے مختلف علاقوں کے معاشرہ کو مساوات انسانی تکمیل بلکہ ذکر تک سے محروم کر دیا تھا، اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ طبقاتی تقسیم کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، بلکہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

اسلام جو انقلاب لایا اس کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ اصحاب سیر اور مسلم مورخین نے زمانہ جاہلیت کے صرف عرب معاشرے کی خرابیاں اور نقائص تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی بعثت اصلاح عالم کے لیے تھی۔ جیسا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝

(الانبیاء ۱۰۷)

سے صاف ظاہر ہے۔ تاریخ عالم کی بعض تحریکات و عوامل کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کے علاوہ جنہوں نے دین اسلام قبول کیا، دیگر اقوام نے بھی اسلام کے لائے ہوئے بعض انقلابی اصولوں کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ کے طلبہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے تین بنیادی اصولوں یعنی اخوت مساوات اور آزادی کا مطالبہ یورپ میں فرانسیسی انقلاب یعنی ۱۷۸۹ء کے بعد کیا گیا، لیکن اسلام ان اصولوں کو ساتویں صدی میں منہا چکا تھا۔

## القلاب اسلامی

اب ہم اسلامی انقلاب کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان کے ذکر سے پہلے یہ واضح کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس عظیم انقلاب کے عظیم المرتبت قائد کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ جس اصول کی تعلیم دی جاتی تھی اس پر بدرجہ اتم خود انھیں اپنی تمام اور اجتماعی زندگی میں عمل فرماتے تھے۔ مصنف کے اخلاق و کردار کی تفصیلات ہمیں حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ نے اپنی زندگی کی بنیاد فقر پر رکھی اور ہر وہ زحمت برداشت کی جس کا غریب آدمی کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وسیع فتوحات کے بعد بھی جب غنیمت کا مالِ بکثرت مدینہ آتا تھا، آپؐ نے اپنے اصولوں سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا، حکمرانی کے لوازمات یعنی تخت و تاج، رٹائشی محل اور قیمتی پوشاک وغیرہ تو کیا آپؐ نے اپنے لیے خصوصی نشست کا رواج بھی نہیں ڈالا۔

اسلام کی سب سے پہلی اور بنیادی تعلیم عقیدہٴ توحید پر مبنی تھی۔ ہم اس کے متعلق چند امور کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے دینی پہلو پر یعنی شرک اور بت پرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے لیکن دنیوی امور پر اس کے اثرات کا جائزہ بہت کم مصنفین نے لیا ہے، دوسرا اہم اصول جو قابلِ غور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلق یا موجودہ دور کے محاورے میں انگریزی زبان کی اصطلاح :

(SOVEREIGNTY OF ALLAH) سے متعلق ہے۔ مغربی تہذیب اور تصورات سے ہو لوگ متاثر

ہیں وہ ہمارے ان نظریات یا مخصوص دنیوی امور میں ان پر عمل پیرا ہونے کے خیال سے سخت چرلخ پا ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیب نے خود کو ان پیچیدگیوں سے محفوظ رکھنے اور دنیوی امور میں مطلق العنانی بہتے کے لیے یہ اصول ایجاد کیا کہ مذہب کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ الفاظ دیگر انہوں نے سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے علاحدہ اور بے تعلق تسلیم کر لیا۔ یہ ان کے لیے ممکن تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی خدا کا دیا ہوا نظام حیات نہ تھا، اسلام نے ہر خلاف اس کے جو نظام دیا ہے وہ دینی اور دنیوی دونوں زندگیوں کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کی نظر میں ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس اہم نظریہ کے تحت متعدد مسائل پر بحث کی جاسکتی ہے اور تاریخ کی روشنی میں اس کا وسیع پیمانہ پر تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مقالہ میں ہم مساوات اور اجتماعی عدل کے صرف چند گوشوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدائی حصے میں ذکر کیا گیا ہے، الٰہی تاریخ کے مختلف ادوار میں جو تہذیبیں اور تمدنی نظام ہائے زندگی منظرِ عام پر آئے اور ان کی سرپرستی میں جو معاشرے وجود پذیر ہوئے ان کی مشترک اور

نمایاں خصوصیت طبقاتی تقسیم انسانی نظر آتی ہے۔ اس کی جڑ اور بنیاد ان کی، جس جہتی خواہش میں ملتی ہے کہ وہ خود کو دوسرے لوگوں سے بہتر اور بالاتر سمجھتا ہے اور دوسروں کی محنت اور کارکردگی کے فوائد اور نتائج اپنی عیاشی اور آرام طلبی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ طبقاتی برتری قائم کرنے کے لیے مختلف اصول بنائے گئے جن میں نسل و رنگ، زبان، علمی استعداد اور طاقت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برصغیر میں آریائی تہذیب کی سرپرستی میں جس معاشرہ نے جنم لیا اور پروان چڑھا اس میں پیشہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، ایک اور ذریعہ اس طبقاتی تقسیم کا پروہتائی نظام

ر PRIESTHOOD تھا۔ تاریخ آج سے ناواقف نہیں کہ ہندوستان میں برہمنی برتری اور یورپ میں کلیسا اور ریاست کی کشمکش سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں تک حکمرانی کے اصولوں کا تعلق تھا، ان عوامل نے شاہی مطلق العنانی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان حالات میں جمہوریت کا تو ذکر ہی کیا، جمہور کے حقوق کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ حکمران کے الفاظ قانون بلکہ قانون سے بالاتر تصور کیے جاتے تھے، اور اس کے درباری اور فوجی سردار وغیرہ درجہ بدرجہ خصوصی حقوق اور امتیازات کے مالک بن جاتے تھے یا بنا دیے جاتے تھے اور عوام ہر طرح سے ان کی زبانتوں اور مطالب کے نیچے پیستے رہتے تھے۔

اب دیکھیے کہ اسلام کی انقلابی تعلیمات اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اخلاق و اعمال نے انسانیت کے نام پر چھپائے ہوئے ان داغوں کو کس طرح کھیر مٹا دیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم معاشرہ میں بعد میں یہ خوبیاں رونما ہوئیں لیکن فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان لوگوں کو چاہے وہ حکمران ہی کیوں نہ ہوں خطا کار اور گنہ گار ٹھہرایا اور اکثر ظالم اور جابر حکمرانوں کی انھوں نے مخالفت بھی کی، نظریہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت نے اس خطرناک صورت حال کا خاتمہ نظری طور پر تو ہمیشہ کے لیے کر دیا، عملی لحاظ سے اس کا خاتمہ فوری طور پر عرب میں ہوا۔ اب حکمران سے لے کر غریب اور معذور ترین شخص ایک ہی سطح پر، یعنی خدا کی حاکمیت کے تحت آگیا۔ قانون کے بنیادی اصولی ذریعہ وحی اور رسول اکرم کی تشریحات اور عملی زندگی کے لباس میں انسان تک پہنچ گئے۔ ان کی اہری حیثیت اور بالادستی پر کسی کو حرف گیری یا ان میں ترمیم کی کوئی دگنہ نش نہیں رہی۔ ان نظریات کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی مطلق العنانیت خواہ وہ فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قطعی طور پر ختم ہو گئی۔

ازمنہ قدیم اور قرون وسطیٰ میں ملکیت کی تاریخ پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں نے کیسے کیسے مظالم اور نا انصافیاں کی ہیں۔ دورِ حاضر میں پارلیمانی طرز

حکومت کو آزادی اور مساوات انسانی کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض ممالک میں پارلیمان کے قانون سازی میں لامحدود اختیارات سے کس قدر عجیب و غریب نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہم بعض اخلاق سونہ اور رنگ و نسل کے امتیازات سے لگا سکتے ہیں۔ یہ صورت حال اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ بعض انسانوں یا جماعتوں کو دوسروں پر برتری حاصل ہے، نسل پرستوں کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے پر فوقیت صرف اس بنا پر حاصل ہے کہ وہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ عدم مساوات کی یہ شکل اسلامی نظام میں اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور انسان اس دنیا میں صرف اس کا نائب، یا قرآنی الفاظ میں، ”خلیفہ“ ہے اور اس کے دیے ہوئے قوانین کی حد سے باہر نہیں جاسکتا۔ قرآن نے یہ نظریہ پیش کر کے کہ اللہ کے نزدیک بڑی کا صرف ایک ذریعہ تقویٰ ہے، انسانی مساوات کے نظریہ کو اس طرح قائم کر دیا کہ اس میں اب کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ متعلقہ آیت الحجرات - ۱۳ لے کی بہترین وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجة الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں ان الفاظ میں فرمائی:

”وگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ آدم علیہ السلام ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخی کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔“

اس موقع پر آپؐ نے غلاموں کے متعلق یہ حکم دیا:

”تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔“

بعض مفسرین نے اس آیت (الحجرات - ۱۳) کی شان نزول یہ بتلائی ہے کہ آنحضرتؐ مدینہ کے بازار میں جا رہے تھے تو آپؐ نے ایک حبشی غلام کو دیکھا جو کہ رانا تھا کہ مجھے صرف وہ شخص خریدے جو مجھ کو پانچوں نمازیں رسول اللہؐ کی اقتدا میں ادا کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ اس شرط پر اس کو ایک شخص نے خرید لیا۔ وہ غلام بیمار ہوا تو رسول اللہؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب وہ مر گیا تو آپؐ اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غلام کے مقابلہ میں حیثیت یا پیدائش کے لحاظ سے اس کے آما کو بڑی حاصل نہیں۔

غلامی کو فوری طور پر بند کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کوئے عالمی تجارت کا ایک اہم مسئلہ بن چکا تھا۔ لیکن رسول اللہ نے غلام کو آزاد کرنے اور اس کو جملہ حقوق، جن سے دوسری قوموں نے اس کو محروم کر دیا تھا، دلوانے کے لیے مختلف طریقوں سے نصیحت فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں غلام کی حیثیت دوسرے معاشروں سے قطعی طور پر مختلف ہو گئی۔ یہاں یہ خاندان کے ایک فرد کی طرح تھا اور اگر وہ باصلاحیت ہوتا تو ترقی کے لیے تخت و تاج کا مالک بھی بن جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان معز الدین غوری (د ف - ۶۳ | ۱۲۰۶) سے اس کے ایک امیر نے اظہارِ اسوس کرتے ہوئے ذکر کیا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں جو بعد میں اس کے تخت کا مالک ہو۔ سلطان نے فوراً جواب دیا کہ اُس کے ہزاروں غلام اس کے بیٹے ہی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اُس کے کسی غلام سلطنت کے مختلف علاقوں پر حکمران ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے صفحات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمیں نمایاں شخصیتیں ملیں گی جو ابتداءً غلام تھیں لیکن بعد میں اعلیٰ مراتب و مناصب پر فائز ہو گئیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ سلطان فیروز تغلق نے جس کے پاس غلاموں کی بہت بڑی تعداد تھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا تھا۔ ایسے واقعات کی لا تعداد مثالیں ہمیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دوسری قوموں میں جو غلام کی حیثیت اور غلامی کا تصور تھا اس کا اسلام میں غلام کے تصور سے کوئی متبادل نہیں ان دونوں میں حرف لفظی مماثلت ہے۔

اس مختصر مقالے کے اختتام سے پہلے ہم اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں کہ قرآن پاک کے احکامات نے اسلامی معاشرے پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ اخوت اور مساواتِ انسانی کو ہر نظام میں ضروری سمجھے۔ یہاں آزادی، مساوات اور اخوتِ انسانی بے معنی الفاظ نہیں۔ مطلق العنانی کسی شکل میں بھی خواہ وہ ایک فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قابلِ برداشت نہیں۔ ان تمام تعلیمات کا عملی زندگی میں مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد صرف نفاق اور دنیوی مہبود پر ہی نہیں بلکہ انسانی اخلاق کے اعلیٰ معیارات پر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

”میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔“

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ خطبہ مذکورہ کے مختلف حصے سیر اور حدیث کی کتابوں میں کہیں کہیں مذکور ہیں۔ دیکھو علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ - جلد ۲ - مزید دیکھو ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۸۵۔

# میدانِ جنگ اور اخلاقیات نبوی

جناب محترم بریگیڈیئر گلزار احمد

اخلاق، انسان کے اس طرز عمل کا نام ہے جو وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ روا رکھتا ہے اور جس کے اثر کے تحت اجتماعی زندگی کے دوران اس سے مختلف اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کا طرز عمل اس کے اخلاقی کا پتہ دیتا ہے جو اس فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے جس پر وہ اپنی زندگی کو استوار کرتا ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد انسان کے ایمان و یقان پر مبنی ہوا کرتی ہے جسے اس نے اپنے معبود کے متعلق اپنے قلب و ذہن پر ثبت کیا ہوتا ہے۔ فلسفہ زندگی اپنا مستقل مقام نہیں رکھتا، اس کا وجود ایسی مستقل بنیاد پر ہوتا ہے جو دلائل و براہین سے ماورا ہو کر انسان اور خالق کائنات کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

جس انسان کا ایمان ہو کہ یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے اس کی تخلیق کا مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے، وہ اس کائنات کی وسعتوں، اس کی بلندلیوں، اس کے عجائب اور ان کے اندر مضمحل قوتوں کو ہمہ وقت لگا ہوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جو ہوں کائنات پر اس کا غور و فکر بڑھے گا اسی مناسبت سے اس کے قلب و ذہن پر خالق کائنات کی بزرگی اور قوت کا تصور گہرا ہوتا جائے گا۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ہر قول و فعل خالق کائنات کے احکام کے تابع رہے گا۔

جو انسان خالق کائنات کے وجود کا منکر ہو گا یا خالق کائنات کے تصور کو شرک و شکوک کے نتیجے میں دھندلا دے گا اس کے ذہن سے جبر و سزا اور عمل و احتساب کا خیال محو ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہر عمل منتہائے مقصود بن جاتا ہے اور انسان ہر رُکاوٹ، ہر خوف، ہر طرح کی پرسش اعمال کے خیال سے آزاد ہو کر اپنے شب و روز کو صرف خواہشات نفس کے تابع بناتا ہے اور یوں غیر ذمہ دارانہ رویہ کو حاصل زندگی کا مقام عطا کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے فلسفہ زندگی کی تہ ایمان و یقان کی مضبوط بنیاد سے عاری

ہوتی ہے۔

خاتم الرسل، سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نظام زندگی کی بنیاد رکھی اس کی اساس وحدت خداوندی پر ہے۔ اس کے علاوہ اس نظام زندگی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ نظام زندگی خود خالق کائنات کا عطا کردہ ہے۔ وحدت خداوندی اور حاکمیت اللہ العالمین پر استوار کیے ہوئے نظام زندگی کو حضور آدمیؑ نے اپنی پوری زندگی پر محیط کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو قیامت تک کے لیے ہر موقع و محل پر کمال اخلاقیات کا مقام رکھتی ہے۔ اس بے مثل زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہر پہلو اپنی جگہ پر مکمل مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان ہی مختلف پہلوؤں میں سے اہم ترین پہلو جنگ، یعنی میدانِ کارزار کی زندگی کا پہلو ہے۔ جنگ خاک و خون سے نبرد آزما ہونے کا نام ہے۔ اس کے دوران جذبات کی شدت پر قابو رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ آج کی اس مجلس میں اس بات کا مطالعہ مقصود ہے کہ حضور سرورِ کونین رحمۃ اللعالمین نے میدانِ جنگ اور اس سے متعلق امور کے دوران کس طرح کے اخلاقی بطور مثال پیش کئے۔ بادی النظر میں عجیب سی بات محسوس ہوتی ہے کہ جو ہستی سراپا رحمت ہے، جو محبت و شفقت کا پیکر ہے، جو رحم و کرم میں کمال انسانی کی مثال ہے، جو عفو و درگزر اور عطا و بخشش میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور جس نبردِ دیرتر انسان کو خالقِ بن و بشر نے رحمۃ اللعالمین کے خطاب سے نوازا ہے، ان کے اخلاقیات کو اس پس منظر سے متعلق کیا جائے جو قتل و خون اور تباہی و بربادی کا منظر ہو۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقیات کا یہی پہلو سب سے زیادہ توجہ طلب ہے اس لیے کہ جنگ کے دوران انسانی تیور غضب اور غصے کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور افراط و تفریط یا نا انصافی سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر خون کی ندیوں کی موجودگی میں رحم و کرم اور عفو و درگزر سے کام لینا ہی حقیقی معنوں میں اخلاقیات کی معجزہ نما مثال بنایا جاسکتا ہے۔

اہل عرب اور خاص طور پر ان کے شعرا اپنے باپ دادا کی شجاعت کی داستانیں انتہائی رنگ آمیزی سے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں داستان طرازی زیادہ ہوتی تھی اور حقیقی شجاعت کم تر اور وقتی۔ اہل عرب لوٹ مار قسم کے غزوہ کے عادی تھے۔ وہ ہر استقلال لڑائی کے عادی نہ تھے اور اس لیے صف آرا لڑائی کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بدر و احد کی لڑائیاں جس طور پر لڑی گئیں وہ اس خیال کی شاہد ہیں۔ علاوہ بریں میثاقِ مدینہ کی



شق نمبر ۲۴ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عرب کا ہر باشندہ دلیر نہ تھا مگر اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے والا ہر فرد صبر و استقلال کی وجہ سے بہادری کا مظہر بن گیا تھا۔ دورِ جدید میں مستشرقین سے استفادہ کرنے والے مسلمان مفکرین بھی اس گرمی کا شکاہہ ہو گئے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابیوں اور آپ کے اخلاقیات کی بنیاد اہل عرب کی شجاعت، ان کی مہمان نوازی اور ان کے مضبوط کردار پر استوار ہوئی تھی۔ یہ خیال انتہائی مگرہ کن ہے۔ قرآن پاک تازہ وار دینِ حلقہٴ اسلام کا موت کے خوف سے گر گر پڑنے کا ذکر کرتا ہے۔ غزوہٴ تبوک تک ایسے افراد موجود تھے جو جنگ میں عدم شمولیت کے لیے بھانے بناتے رہے۔ اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیانہ خصائل، آپ کی بے مثل جرات اور آپ کے صبر و استقلال کی اساس آپ کے گرد و پیش پر نہیں تھی بلکہ خالق و مالک کائنات کی مشیت اور نہ نظر آنے والے ارادوں کا اسے نتیجہ تصور کرنا چاہیے۔

آپ کے والد ماجد کا انتقال آپ کے پیدا ہونے سے قبل ہو گیا تھا۔ آپ والدہ ماجدہ کی شفقت سے بھی نا آشنا رہے تھے۔ دادا کو بھی قدرت نے اتنی مہلت نہ دی کہ سیادت و قیادت کے طور طریقے سکھائے جاتے۔ چچا تو کفالت کی ذمہ داریوں سے بھی بمشکل عہدہ بردار ہو سکتے تھے۔ یعنی آپ حقیقی معنوں میں اسی تھے۔ علاوہ ازیں آپ از اوّل تنہائی پسند تھے اور جوانی کے ایام کا زیادہ حصہ غارِ سرا میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں عرب کا ماحول یا عرب کی داستانوں کا اثر کیسے ہو سکتا تھا۔ وہاں تو تصور کائنات اور انتہاک در خالق کائنات ہوا کرتا تھا۔ آپ کے اخلاق اس پوشیدہ امرِ ربی اور مشیتِ خالق کائنات کے نامعلوم استوار ہوئے تھے جس نے لفظ کن کے بعد سے آدم اور ان کی اولاد کی پیش رفت اور تربیت ان خطوط پر کی تھی جن کی آخری کڑی، آخری دین، آخری وحی اور آخری رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر تاقیامت نسلِ انسانی کے لیے مشعلِ راہ بنی رہی تھی۔

جنگِ فرد کی زندگی پر تو اثر انداز ہوتی ہی ہے، اجتماعی سطح پر معاشرتی دھاروں کو بدلنے اور نیا رخ دینے میں بھی جنگِ انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہجرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے مکہ والوں نے اعلانِ جنگ کے بعد مدینہ پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ جنگ نو سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کے دوران ریاست و مملکتِ مدینہ کے تمام تر وسائل ملت و مملکتِ اسلامیہ کے دفاع و تحفظ کے لیے استعمال کئے گئے۔ اس طویل جنگ کے سائے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے مدنی دور پر چھائے رہے۔ ظاہر ہے کہ ریاستِ مدینہ کے انتظامی،

معاشی اور معاشرتی امور پر حالت جنگ کے اثرات پڑتے رہے ہوں گے خُذُوا حِذْرَکُمْ کا یہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا، یعنی زندگی کے ہر پہلو کی حفاظت اور ملت کے ہر فرد اور اس کی ہر شے کا تحفظ۔ یورپ کا عالم انسانی ملی جنگ (NATIONAL WAR) کی اصطلاح سے انیسویں صدی عیسوی میں نیولین کی جنگوں کے ذریعہ سے روشناس ہوا، مگر دنیائے اسلام کو حضور پروردہ کوئین صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ صدیاں قبل ملی جنگ کے جزئیات سے آگاہ فرما چکے تھے۔ اس جنگ اور اس کے ہر غزوہ کے دوران ملت کے ہر فرد کی دولت اور اس کی ذات کو ہر ممکن طریقے سے استعمال میں لایا گیا۔ اس لیے اس جنگ کو بہر معنی ملی جنگ یعنی (TOTAL WAR) بھی کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے جنگ، فرد اور معاشرہ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے کہ جنگ کے مطالبات نہ ماٹہ امن کے مطالبات سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اور فرد و جماعت کو اپنی زندگی اور اس سے متعلق نظریات کو حالات جنگ اور مطالبات جنگ سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ ۹ سال کے طویل عرصے کی جنگ کا اثر یہ ہوا کہ جنگ کے سایہ تلے مرتب ہونے والے معاشرے کے افراد کے کردار و اخلاق کی تربیت مادی برتری نے ایسے خطوط پر استوار کی تھی کہ وہ عین میدان کارزار میں شفقت و محبت اور رحم و کرم کے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے اور زمانہ امن کے صلح کن ماحول میں عزم و استقلال اور انتہائی شدت سے کلہرئ حق کی پاسداری اور تحفظ کرتے رہتے تھے۔ یہی مکمل کردار تھا جس کے اظہار نے خیر البشر خاتم المرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور ان سے صدیوں بعد آنے والے نام لیوان رسول مکی و مدنی نے بھی جنگ ختم ہوتے ہی بدترین مفتوح دشمن کا عزت و آبرو، اس کے مال و متاع اور اس کے زن و مرد کو مکمل آزادی عطا کر دی اور جنگ کے دوران کی شدت جذبات کو نفرت کی جانب تسخیر نہ کرنے دیا۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوتا رہا کہ جس مادی برتری کی سیرت کے مطابق عمل کرنا وہ اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے اس نے عمر بھر کے دشمنوں کو کا تشیب لکھا لیکم کہہ کے سینے سے لگالیا تھا اور ان کے لیے زمانہ مابعد جنگ کو حسین اور خوش رنگ بنا دیا تھا۔ جنگ کو فتح تو ہر سپہ سالار کر سکتا ہے مگر زمانہ مابعد جنگ کی فتح صرف اولین سپہ سالار فوج اسلامیہ کا خاصہ رہا ہے۔

جس نظام زندگی کو عملاً آپ الناسیبت کے سامنے پیش کر رہے تھے، اس کے فلسفے

کی بنیاد وحدت و حاکمیتِ خداوندی پر استوار ہوئی تھی اور خالق کائنات کا حکم تھا کہ ”جب میری راہ میں سفر کر رہے ہو تو چاہے وہ دفاعی جنگ کا سفر ہی کیوں نہ ہو زیادتی سے بچے رہنا۔ اس لیے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ یہ لافِ عتد و اکام حکم ہی تھا کہ جس کی روشنی میں آپؐ نے عمر بھر کے دشمنوں کو کالتشربیب کلمہ الیوم کہہ کے بندہ بے دام بنالیا تھا۔

اسلام کی بنیاد ہی حاکمیتِ خداوندی پر ہے۔ یہ ایسا اساسی نکتہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے اسے ميثاقِ مدینہ میں بھی شامل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاستِ مدینہ کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرا دیا گیا تھا کہ اس ریاست میں قانونِ خداوندی نافذ ہو گا تو یہ ہر معنیٰ میں درست ہو گا۔ مگر بحیرہ میں حضورؐ کی جانب سے عطا کردہ ميثاقِ مدینہ کی شق ۲۸ کے الفاظ ہیں:

”اگر اس دستاویز سے متعلق تمہارے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو معاملہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو پیش کیا جائے گا“

ميثاقِ مدینہ میں یہ بات بھی مصدقہ طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ حاکمیتِ خداوندی کے اثر اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اخلاق مضبوط ہو گئے تھے۔ اس اہم اور تاریخی دستاویز کی شق نمبر ۲۸ کے الفاظ ہیں:

”چونکہ مسلمان اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے (جنگ کے دوران) دوسروں کی نسبت ان کا صبر و استقلال قوی تر ہوتا ہے اور انہیں اللہ کی جانب سے ہدایت عطا ہوتی ہے۔“

صبر و استقلال کو تو اللہ تبارک تعالیٰ، اللہ کی جانب سے عطا کردہ نعمت قرار دیتا ہے اور وہ مگر ہر اللہ پر ایمان لانے اور اس کے نازل کردہ احکام کے مطابق زندگی کو سمست عطا کرنے کا۔ آپؐ نے یہ صبر و استقلال ہر میدانِ جنگ میں دکھایا اور دیکھا گیا، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نصرت سے فتوحات حاصل ہوئیں۔ احد اور بنین کے دو اہم میدانوں میں جب لڑائی کا رخ مسلمانوں کے خلاف تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل بہادری نے فوج کو دوبارہ یکجا کیا اور دونوں موقعوں پر حالات یکسر بدل گئے۔

یہ اخلاقیات نبویؐ کا وہ پہلو ہے جو فنِ جنگ کے ماہرین سمجھنے سے غافل رہے ہیں کہ

آپؐ نے کسی طرح کی جنگی تربیت، تجربہ یا مشاہدہ کے بغیر بگڑے ہوئے حالات کو سوار نہ کے لیے جس طرز عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ کس طرح حاصل کیا تھا۔ اخلاقیات نبویؐ کا یہ پہلو وحدتِ خداوندی پر مکمل ایمان کا نتیجہ تھا۔ غارِ ثور کی تنہائیوں میں، بدر کے دوران پختہ کار کماندار کی سب مغبوطا گرفت کے وقت، اُحد کے میدان میں دشمن کے قیامت خیز گھوڑے کے باوجود، غزوہٴ احزاب میں خندق کھودنے سے لے کر عرب کے اجتماعِ عظیم کے منتشر ہونے تک، حدیبیہ کی تا حد شہادت بیعت کے فیصلہ پر غور کرتے ہوئے، خیبر کے بارہ قلعوں کی تسخیر کے دوران، اور حنین کی تنگ وادی میں دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے بالمقابل اخلاقیات نبویؐ کے مبرور استغلا کی بنیاد خالق رب العالمین پر وہ حکم ایمان تھا جو تا قیامت عاشقانِ ختمِ الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مینارِ نور بن کر ہدایت کے سامان مہیا کرتا رہے گا۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان اعلانِ جنگ کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے معرکے پابھونچے تھے مگر پہلا صفِ آراء معرکہ بدر کے مقام پر ہوا۔ اس روز قریش مکہ کا لشکر باجے گا بجے اور جذباتِ اجمارنے والے رزمیہ و رجزیہ اشعار کی صداؤں کو بلند کرتے ہوئے مدینہ کے مسمیٰ بھر مجاہدوں پر حملہ کے لئے آگے بڑھا۔ سراپا رحمتؐ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک لڑائی کا باقاعدہ آغاز نہ ہو بدر کے واحد چشمہ سے دشمن کو پانی پینے سے نہ روکا جائے۔ کہاں خون کی ندیاں بسنے کا یقین اور کہاں دشمن کو اپنے قبضے میں لیے ہوئے چشمہ سے پانی پی کر تازہ دم ہونے کی اجازت! دشمن کے غصے کے مقابلے میں رحم و کرم کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر! یہی اخلاقیات نبویؐ کا وہ پہلو ہے جسے ”خلقِ عظیم“ کا نام دیا گیا ہے۔

بدر کی لڑائی مابعدِ جنگ کی اخلاقیات کی مثال بھی پیش کرتی ہے۔ بدر میں قریش کے شتر قیدی لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ سلوک کیا گیا۔ حضور اقدسؐ نے احترامِ آدمیت کا جو بلند مقام قائم کیا ہے وہی بغائے انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ان جنگی قیدیوں کو جس آسانی سے اور جن آسان شرائط پر آزاد کیا گیا وہ دورِ جدید کے لشکر سازوں اور کارپردازانِ حکومت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

جنگی قیدیوں کا سوال یہ خیال بھی ذہن کے پردے پر اُبھارتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ حضور اقدسؐ تو دشمن کے قیدی حاصل کر لیتے تھے مگر آپؐ کی نوسارِ جنگ کے دوران آپؐ کا ایک آدمی بھی جنگی قیدی نہ بنایا جا سکا۔ یہی نہیں بلکہ راقم الحروف کے مطالعہ میں ایسی ایک مثال بھی نہیں

آئی کہ دورِ شنیعینؓ میں دنیا کی دو بڑی مملکتیں کسی مسلمان سپاہی کو میدانِ جنگ میں قیدی بنا سکی ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو حاکمیت خداوندی پر ایمان رکھتے ہوں وہ قرآن و سنت کے علاوہ کسی دوسرے قانون کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کے تحت زندگی گزارنا قبول کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں شکست کھا کر غیر اللہ کے قانون کو قبول کرنا کفر کے مترادف ہے۔ دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ کی مسلمان افواج کا یہ عمل اخلاقیاتِ نبویؐ کے پر تو کے طفیل تھا۔

غزوہٴ احزاب کے دوران جب پورے عرب کے قبائل کا طوفانِ اندکِ مدینہ اور اسلام کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا اس وقت آپؐ کے فیصلہ کے مطابق نصف شہر کے گرد نو ہزار گز لمبی خندق کھودنی تھی۔ اس دفاعی تیاری کے دوران آپؐ نے اپنی فوج کے ادنیٰ ترین سپاہی کے ساتھ مل کر جو معائب برداشت کیے اور جس صبر و استقلال سے تقریباً ایک ماہ کے محاصرے کے دوران ہی کما نذرِ اعظم کے فرائض انجام دیے وہ اخلاقیاتِ نبویؐ کی صورت میں مساداتِ انسانی کا ایسا درس ہے جس پر دہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں جو الہیت و حاکمیتِ خالقِ العالمین اور رسالت و نبوتِ مصطفویؐ پر ایمان رکھتے ہوں۔

حدیبیہ میں قیام کے دوران حضرت عثمانؓ سفیر کے طور پر مکہ گئے تھے انھیں واپسی میں غیر متوقع دیر لگ گئی۔ افواہ مشہور ہو گئی کہ مکہ والوں نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ آپؐ نے فوراً صحابہؓ سے ”بیعتِ ہمدانِ شہادت“ لی اور کلاماً سنتے ہوتے ہوئے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سفیر کا قتل ریاست و مملکت کی حاکمیت کے خلاف للکار کے مترادف تھا۔ جو حاکمیت اللہ کی قائم کردہ حدود کی مطابقت میں قائم کی گئی ہو اس کے سفیر کا قتل اللہ کی حاکمیت کو للکارنے کا مقام رکھتا ہے اور وہ اعلانِ جنگ سے بڑھ کر جنگ کا آغاز نہ متصور ہوتا ہے۔ اسی لیے خاتم النبیینؐ کے لیے اس مسئلے میں صحیح نشانِ قائم کرنی تھی تاکہ مابعد کی مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کے لیے نشانِ راہ واضح رہے۔ آپؐ کے اس عزم کی منہ میں وہ محکمِ ایمان باللہ تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ عین میدانِ جنگ میں اخلاقیاتِ نبویؐ کے اس فیصلے کو احترامِ ذاتِ مومن کا مقام حاصل ہے۔ جب حضرت عثمانؓ صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور مکہ والوں نے آپؐ کے اس عزم کو دیکھ کر دس سال کے لیے جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کی تو آپؐ نے یہ جنگ بندی اور وقتی صلح چند ایسی شرائط پر قبول فرمائی جو بادی النظر میں مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آ رہی تھیں۔ مگر اللہ ربہم حکم تھا کہ جب دشمن صلح کی جانب جھکے تو تم بھی اس جانب جھک جاؤ۔“

اللہ کے اس حکم کی موجودگی میں آپ صلح کی پیش کش کو ٹھکرا نہ سکتے تھے۔ سرور کونین کا یہ فیصلہ اتنا اہم ہے کہ خالق ارض و سمانے اسے نفع کے نام سے یاد فرمایا ہے اور وعدہ فرمایا تھا کہ اس فیصلہ کے محرک بننے والے اصحاب خاتم الرسل جنھوں نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہادنا شد شہادت کی تھی انھیں جلد ایک جنگی نفع سے نوازا جائے گا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ جلد پورا ہوا۔ صادق الموعد رسول آخر الزمان نے اس وعدہ پر یقین رکھتے ہوئے آنے والے غزوہ کے لئے سولہ ہزار کی جمعیت کے خلاف صرف ان چودہ سو اصحاب کو ساتھ جانے کی اجازت دی جنھوں نے نبوی کے درخت کے سائے میں ریاست مدینہ کی آزادی کی ضمانت اور حاکمیت خداوندی کی شہادت کے طور پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

جنگ آزما ہونے والے اور تباہی کا عزم لے کر حملہ کرنے والے دشمن کے خلاف عفو و درگزر سے کام لینے کے لیے جس بلند اخلاقی ضرورت ہوتی ہے وہ اولین سپہ سالار افواج اسلام کے علاوہ تاریخ جنگ میں کہیں نکل نہیں آتا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جاسوسی، فتنہ و فساد، بغاوت اور درپردہ دشمن کی مدد کرنے کے مرتکب ہوئے تھے، مگر آپ نے انھیں بخش دیا اور ان کی تمام منقولہ دولت ان کو ملے جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح سریہ ذات الطلاع غزوہ ستین و طائف، سریہ قطیفہ اور سریہ یثرب کے قیدیوں کو معافی مانگنے پر بغیر فدیہ کے بخش دیا۔ تاریخ جنگ میں کئی سپہ سالاروں نے جنگیں جیتی ہیں اور دشمن پر حکومت کے ذریعہ سے نئے قوانین اور نیا نظام عاید کیا۔ مگر یہ تبدیلیاں ہمیشہ بحیر قبول کی گئیں۔ حضور واحد سپہ سالار میں جنھوں نے جنگ جیتنے کے بعد مابعد جنگ زمانے کو بھی کامیابی سے سر کیا۔ آپ نے پرانے معاشرتی نظام کو یکسر بدل دیا تھا اور اک نیا سیاسی و اقتصادی نظام دے کر ایسے انقلاب کا آغاز کیا تھا جو آج صدیوں تک کم و بیش ہماری ہے اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اب تک ان چودہ صدیوں میں جہاں کہیں یہ نظام زندگی نافذ کیا گیا وہاں خوش حالی اور امن و سکون میں اضافہ ہوا اور ہر مقام پر اس کا غیر متقدم کیا گیا۔ میدان جنگ میں اخلاقیات نبوی کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ آپ کے نقش قدم پر چلنے والے، آپ کی سنت کو برقرار رکھتے ہوئے، عفو و درگزر سے کام لیتے رہے ہیں جب مسلمان دیر غارتی میں بیت المقدس میں داخل ہوئے تو کسی کا بال بیکانہ ہوا۔ مگر جب عیسائی

اسی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو شہری آبادی کے خون کی ندیاں بھائی گئیں مگر چھپا نوے سال بعد جب مسلمان دوسری بار اس شہر میں داخل ہوئے تو پھر بھی امن و امان اور عفو و درگزر کی ہی فرادانی نظر آئی۔

عیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ایک بار پھر اس مقدس سرزمین سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ اس بار پھر مظالم کی انتہا نہ رہی جواب بھی جاری ہیں۔ سوالی پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہر مقام پر اور ہر دور میں جنگ کے نتیجے میں مظالم ڈھائے گئے مگر جب مسلمانوں نے جنگ فتح کی تو انہوں نے رحم و کرم کی بارش کر دی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ مسلمان سپہ سالاروں کے سامنے ہمیشہ سنت خاتم المرسل صلی اللہ علیہ وسلم رہی ہے اور دیگر ادیان کے فاتح کسی ایسی مثال کو سامنے رکھنے سے قاصر ہیں۔ میدان جنگ میں اخلاقیات نبویؐ کا یہ کمال ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپؐ کی سنت بنی نوع انسان کو رحم و کرم اور عفو و درگزر کا سبق دے رہی ہے اور اللہ کا دیا ہوا رحمہ للعالمین کا لقب اتنا ہی زندہ و پائندہ ہے اور رہے گا جتنا کہ اور سارا کلام ربانی ہے۔

# معلم اور تعمیر کردار

سیرت طیبہ کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر احمد مدنی الدین

قرآن و سنت میں معلم اور تعمیر کردار کا ذکر بکثرت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ معلم ہے اور انبیاء بھی معلمین ہیں۔ انبیاء کرام کی معللانہ حیثیت کی تعلیم و تربیت کا خلافتِ کریم نے خصوصی اہتمام فرمایا ایشاد ہے :

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء کا علم دیا۔ (البقرہ: ۳۳)۔  
پھر فرمایا :

رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔ (الرحمن: ۱-۲) اور پھر سورہ علق میں فرمایا :

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر ہو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے۔ جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو

خون کے قطرے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھا کیجیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے دیکھے پڑھوں کی قلم سے تعلیم دی اور عموماً انسان کو (دوسرے

ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ (علق: ۱-۵)

اللہ تعالیٰ نے نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرمایا۔ پروردگار عالم نے نبی کریم کو روشن چراغ (سراجاً منیراً) کہا۔ حدیث نبوی ہے :

ادبہی ربی فأحسن تادیبی

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم کا ماسب نبوت میں تعلیم دینا خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم کے دوسو الوں پر الکشاف کروں گا۔

”حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں۔

اور ان لوگوں کی صفائی کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔“ (آل عمران: ۱۶۴)



”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیرہ سے) پاک کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور دانشمندی (حکمت) سکھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے“۔ (جمعہ: ۲)

خود پیغمبر اسلامؐ نے معلم کہلاتے ہوئے ہمیشہ خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے۔ جس کا ترجمہ یوں ہے :

(ایک مرتبہ) رسول اللہؐ دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد ہوئی تھیں آپؐ نے فرمایا : دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں مجلسوں یا اجتماعاتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا تعالیٰ سے دعا کر رہی ہے۔ اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور دوسرے لوگ سودہ دینی بصیرت حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھا رہے ہیں۔ لہذا یہ لوگ بہتر ہیں۔ اور میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں (والہما بغنت معلماً)

آخری معلم کی حیثیت میں آپؐ نے اپنے مشن کی وضاحت یوں فرمائی :

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

میں تو اس لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں )

ایک اور جگہ فرمایا :

إِنِّي أُرِيكَ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

(میرا مقصد اصلاح معاشرہ ہے جتنا مجھ سے ممکن ہو۔ اور نہیں ہے میری

توفیق مگر جو خدا مجھے دے)

ان ارشادات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضورؐ کے پیش نظر تعلیم اسلامی کے دو پہلو

رہے : ایک پہلو کے اعتبار سے وہ محض فرد کی اصلاح و تکمیل ہے۔ لیکن دوسرے پہلو کے لحاظ سے

وہ ایسی اصلاح و تکمیل ہے جس کا نتیجہ معاشرتی بہبود ہے۔ ایک معلم کی حیثیت سے فرد کی

انفرادی زندگی اور اس کی حیاتیات اجتماعیہ کی اصلاح ہمہ وقت آپؐ کے پیش نظر رہی۔ اس

اعتبار سے آپؐ کی مساعی کا مقصد فرد کی ایسی تعمیر کر دینا تھا جس سے وہ انفرادی اور

اجتماعی طور پر کائنات کے لیے رحمت بن سکے۔ اسی لیے حضورؐ نے ایسی تعلیم اور ایسے علم سے

پناہ مانگی جس کا اثر انسان کی عملی زندگی پر نہ ہو۔  
 اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ ۝  
 (اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے)

## معلم کا معیار

دنیا کے آخری معلم کی حیثیت سے آپؐ نے معلم کا ارفع ترین معیار نہ صرف وضع فرمایا بلکہ اس کی عملی تفسیر زندگی بھر پیش کی۔ معیار کے عناصر حسب ذیل ہیں:

- الف۔ معلم کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔
- ب۔ اس کی ہر زبانانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔
- ج۔ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

معلم کا یہ مختصر مگر جامع معیار تربیت اساتذہ کا سرعنوان ہونا چاہیے۔ اور دورِ حاضر کے مسلمان اساتذہ کی علمی کم مائیگی اور تدریس سے بے رغبتی کا علاج یہی ہے کہ ان کے نظام تربیت کو مذکورہ معیار کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جائے اور اس پر سختی سے کار بند رہا جائے، تاکہ اصلاح اعمال کا عمل سہل اور سریع ہو۔ یہ اس معیار کی عملی تفسیر ہے۔

تصور کی درس گاہِ اعظم کو دیکھو تو معلوم ہوگا۔ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ خود معلم کی ذات پوری جامع ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ قائم ہے۔ اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

جہاں حضورؐ نے معلم کے لئے ایسا جامع معیار عملاً پیش کیا، دنیا کے آخری معلم نے اپنی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، امرتہ بانی اور حکم فطرت اور کتاب و حکمت کی آمیزش کی۔ آپؐ کے پیش رو انبیاء کی تعلیم میں یہ آمیزش نہیں ملتی۔ حضورؐ نے نہ صرف علم کے لیے ایک ابدی اور جامع معیار عملاً پیش کیا بلکہ قرآن حکیم اور اپنے طرز عمل سے اصول تعلیم و تدریس بھی وضع فرمائے۔ ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۴۳-۴۴

الف - کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جلتے ہو؟ (لقبرہ: ۴۴)

ب - تو اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت سے بلا - (نحل: ۱۲۵)

ج - تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا - (طلہ: ۴۴)

د - اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات (نساء: ۶۳)

س - اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں فرماتے -

س - فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا فضائل کی طرف مائل ہو۔

ص - رذائل کو قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا اس سے روگردان ہو۔

ط - خاص خاص لوگوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر ان کو خاص خاص طور پر نصیحتیں فرماتے -

ع - مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے -

ن - حضورؐ ایک سوال کرتے - سوال سن کر لوگ متوجہ ہوتے - مگر اس سے پہلے کہ لوگ

جواب دیں حضورؐ خود ہی جواب دیتے -

ق - کبھی حضورؐ آپ ہی آپ سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے - حاضرین اس بار بار

کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے - اور مشتاق ہو کر پوچھتے - جس کا اثر

ان کی دلگدگی میں سرایت کر جاتا -

ل - بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے کلام کے مقصد کو ذہن نشین کرتے -

یہ فرصت خاصی طویل ہے - مذکورہ اصولی تعلیم و تدریس سے اس حقیقت کا اندازہ

بخوبی لگایا جاسکتا ہے - کہ دنیا کے آخری معلم نے اصولوں کا ایک ایسا ضابطہ عملاً پیش

فرمایا جس کے تحت تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے جاہل افراد انسانی معراج کی رفعتوں

کو چھونے لگے - ہمارے تدریسی مسئلوں اور تعلیمی کوتاہیوں کی چارہ گری مذکورہ رہنما اصولوں

کی روشنی میں بسہولت ممکن ہے - افکار مغرب کی خوشہ چینی آخر کب تک؟ بالخصوص جب ان

افکار و تجربات کی بنیاد محدود احوال و کیفیات پر ہو -

## اسلامی نظام تعلیم

حضورؐ نے جہاں معلم کے لئے عملی معیارات مقرر فرمائے اور تعلیم و تدریس کے مؤثر

اصول وضع فرمائے، وہاں اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی تصورات کی نہ صرف نشان دہی

فرمائی بلکہ ان تصورات کی اپنے اسوہ حسنہ سے توضیح بھی فرمائی - ان بنیادی تصورات کا تعلق

دین، انسان، علم و معرفت، حکمت، عدل، اعمال و آداب، تکمیل انسانیت سے ہے۔ ان تصورات پر انسان غور کرے تو اسے بہت کچھ مل سکتا ہے تصور دین سے اسے مقصد حیات حاصل ہوگا۔ تصور انسان سے علوم انسانی کی بے کراں۔ تصور علم و معرفت سے تجربات و مشاہدات وغیرہم۔

محدود وقت کے پیش نظر میں نے معلم کی حیثیت سے حضور کے تین تعلیمی احسانات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ ان کا محض اعادہ کر دوں۔ یہ تین تعلیمی احسانات ہیں: معلم کے لئے ایک جامع معیار، چیدہ چیدہ اصولی تعلیم و تدریس اور اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی تصورات۔ ان تینوں میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے ان کی آفاقی، اخلاقی اور روحانی اساس۔ بد قسمتی سے یہی اساس ہمارے موجودہ نظام حیات میں مفقود ہے۔ اور اس کے باعث مختلف شعبہ ہائے حیات تضادات و انتشارات کا شکار ہیں، جن میں شعبہ تعلیم بھی شامل ہے۔ معلم انسانیت نے اپنے بے مثال معلمانہ کردار و عمل سے ایک مختصر عرصے میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کا ہر فرد جذبہ عمل، قوت تخلیق اور عرفانی حق سے سرشار تھا۔ آپ نے ان امور کی سبھی وضاحت کی کہ قرآنی تعلیمات حصولی علم، تحقیق و تدقیق، مادی ترقی، سائنسی ایجادات کی کوئی حدیں مقرر نہیں کرتیں۔ صرف ان کے حصول اور استعمال کو پابند آداب کرتی ہیں تاکہ سیات انسانی کو مادی اقدار کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی اقدار پر قائم کیا جاسکے۔ ماضی یا موجودہ دور میں تعلیم کی مادی اور روحانی، اخلاقی اقدار کے مابین عدم توازن نے ہی انسانوں اور معاشروں کو تباہ کن بحرانوں سے دوچار کیا ہے۔ ہماری سوچ اور ہمارے عمل میں غائر پرستی اور غائر پسندی اس وجہ در آئی ہے کہ اجتماعی اعتبار سے آج کا عالمی معاشرہ خود بینی و خود اگہی کی صفات سے کم و بیش محروم ہے۔ توہین اور معاشرے ایسے اصول و نظام ہائے تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں جو انہیں مخصوص نظریہ کردار کے حامل افراد کو مہیا کر سکیں۔ لیکن تعلیمی نظریات اور مادی سمولتوں میں بے پناہ پیش رفت کے باوجود ہر معاشرہ ہر قسم کے بحرانوں سے دوچار ہے۔ تعلیم ہی کو ایسے۔ بڑھتی ہوئی تعلیمی سمولتوں کا مسئلہ، معیار تعلیم کا مسئلہ، وسائل کی کمیابی کا مسئلہ، ریاست کے اساسی نظریے کی ترویج کا مسئلہ، مروج نظام تعلیم کی صلاحیت و اہلیت کا مسئلہ بین الاقوامی تعلیمی پیش رفت سے استفادے کا مسئلہ، زیر تعلیم نسل کی خالی یا اغمی، تاریک جانی، کم نگاہی، بے یقینی اور تشنہ لبی کا مسئلہ، اور نظام تعلیم کی محکومی و تقلید اور زوال تحقیق کا مسئلہ۔ میرے نزدیک یہ آخری دونوں مسئلے ہماری فوری توجہ کے طالب ہیں۔

ہمارے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے معاشرے بھی کم و بیش ایسے ہی تعلیمی حالات و کوائف سے دوچار ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں تعلیم کے میدان میں عالمی سطح پر ایک ایسی سوچ ابھر رہی ہے جو تعلیم کی میکائیکی تو ضیع کے ساتھ تعمیر کردار پر زور دے رہی ہے۔ آج کے دور میں اہل فکر و نظر ہر تعلیمی مرحلے میں تعمیر کردار کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں۔ اور مغرب و مشرق کے قابل قدر ادارے اپنے مضامین میں اس امر کی واضح نشان دہی کر رہے ہیں۔ کیونکہ معاشرے کا تعداد مادی فوائد و ترقی کے حصول کے باوجود نا آسودہ ہیں اور ان کا مستقبل مبہم و غیر یقینی۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جدید دور نے انسان کو محض ایک تخلیقی فعلیت تک محدود سمجھا۔ حالانکہ انسان تخلیقی فعلیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی فعلیت بھی ہے جو خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ لہذا کسی بھی نظام تعلیم میں ان دونوں اقسام کی فعلیتوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ضروری ہے۔ اور معلم انسانیت نے اپنے اسوہ حسنہ، طلب علم اور تربیت خاص سے صحابہ کرام کے لیے اس کا اہتمام کیا۔ آپ معلم انسانیت کے مذکورہ تینوں تعلیمی احسانات کا استحصال کریں۔ تو آپ کو یہ محسوس کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ ہر مرحلہ میں فرد کی اصلاح اور حیات اجتماعیہ کی بہبود آپ کے پیش نظر رہی۔

تعمیر کردار کا سرچشمہ اعتقادات ہیں۔ اور اس کا مظہر عادات و اطوار، جب تک اعتقادات درست نہ ہوں عادات و اطوار صحیح نہیں ہو سکتے۔ افکار بدلنے ہی سے اعمال میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہی نکتہ خاص تھا حضورؐ کی تعلیمات کا اور بعد کے مسلمان منکرین نے اس نکتے کی تصریحات کر کے دنیا پر عظیم علمی احسانات کیے۔ جن کی مثال مستقبل میں بھی ملنا محال ہے۔

جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ انسان کی تخلیقی فعلیت کے ساتھ ایک روحانی اور اخلاقی فعلیت بھی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر معلم انسانیت نے تعلیم کے مقاصد کی بنیاد دینی امور و عقائد اور دنیوی مقاصد دونوں پر رکھی۔ اور فرمایا:

”تم میں افضل ترین وہ نہیں جو اس دنیا کو دوسری دنیا کی خاطر نظر انداز کر دیتا ہے۔ یا آخرت کو اس دنیا کی خاطر۔ بلکہ افضل وہ ہے جو دونوں کے لیے کام کرتا ہے۔“

تعلیم کی جو دینی اساس آپ نے مقرر فرمائی اس میں خدا پر ایمان، قرآنی حکیم بطور سرچشمہ علم و ہدایت۔ خدا کے نزدیک انسانوں کا برابر ہونا۔ ایمان کی صفات پر یقین و عمل وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح تعلیم کے دنیوی مقاصد میں آپ نے حسب ذیل امور شامل فرمائے:

- ۱ - علوم محمودہ کے لیے سعی بلیغ کرنا۔
- ب - مظاہرات فطرت کا گہرا تجرباتی مطالعہ کرنا۔
- ج - ہر فرد کے لیے تعلیم کے موزوں، مساوی مواقع فراہم کرنا۔
- د - اختیاری مضامین کا انتخاب طالب علم کی ذاتی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کی روشنی میں کرنا۔

- ۲ - حصول علم و فن کے لیے باضابطہ تدریس و رہنمائی کا اہتمام کرنا۔
- ان مقاصد کے حصول اور انسان کی تخلیقی، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کی تربیت کرنے اور انھیں کا علم بڑے کارآمد کے لیے تربیت یافتہ کا ضابطہ وضع فرمایا۔ جس میں ضروری ہے کہ استاد کو قرآن حکیم کی جزئیات کا پورا پورا علم ہو۔ اور وہ عمومی اور سائنسی علوم کے علاوہ دھڑانی صلاحیتوں کا بھی حامل ہو۔ تربیت یافتہ کے لیے مسلمان مفکر و نصابی اصول منضبط کیے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں :
- ۱ - تعلیم کے باب میں صاحب شریعت کی اقتدا کرے۔
  - ب - شاگردوں پر شفقت کرے اور انھیں اولاد کے برابر سمجھے۔
  - ج - شاگرد کو نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرے۔
  - د - جہاں تک ممکن ہو شاگرد کو بری عادتوں سے کنایت اور پیار کے ذریعے منع کرے۔
  - س - استاد جو علم سکھاتا ہو، شاگرد کے دل میں اس علم کے مقابلے میں دوسرے علوم کی برائی پیدا نہ کرے۔

- س - شاگرد کے سامنے بیان کرنے میں اس کی سمجھ پر کفایت کرے۔
- ص - استاد اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہو۔ اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

ان مختصراً بیان کردہ اصولوں پر نظر کریں۔ تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ اصول دین فطرت کے تقاضا اور انسانی اہلیتوں کو سامنے رکھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ اور تاریخی عالم گواہ ہے، کہ استاد جب تک ان پر کاربند رہے، انھوں نے بے بدلی عالموں اور قابل رشک انسانوں کی تخلیق کی۔ یہ فطری اصولی تعمیر کردار ہم نے اکثر نظائر ذکر دیے۔ اور جدید نظریات تعلیم میں ان کا دخل عمل برائے نام رکھا۔ البتہ دینی مدارس میں ان اصولوں کی پابندی کسی طور پر ہو رہی ہے اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ عقائد و نظریات کی پختگی کے اعتبار سے دینی مدارس کے

فنا ضلین عام تعلیمی اداروں کے نا ضلین سے بہتر ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی افراتفری کے اس دور میں ان اصولوں کا وقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کی قابلِ فہم صورت کی ضروری اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل درآمد کا اہتمام کیا جائے۔

## تربیتِ اساتذہ

مسلمان اہل فکر نے جہاں مطالعہ سیرتِ پاک کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت کے لیے کچھ اصول منضبط کیے وہاں انھوں نے معلمِ انسانیت کے کردار و عمل کی روشنی میں طلبہ کی سیرت کی نشوونما اور اخلاقی تربیت کے لیے کئی ایک مفید اصول متعین کیے اور ان کی تفصیلاً تشریح کی۔ یہاں چند ایک کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

”بچے کی تہذیب و تربیت ایک نہایت ضروری امر ہے۔ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کے پاس ایک امانت ہے۔“

- بچے کے لیے سب سے زیادہ ضروری پاکیزگی نفس ہے۔
- ۱۔ بچے میں پہلے غذا سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیم کی ابتدا کھانے کے آداب سے کر لینی چاہیے۔
- ب۔ بچے کو محنت اور مشقت کا عادی بنایا جائے۔
- ج۔ بچے کو سادہ اور سفید کپڑے پہننے کا شوق دلایا جائے۔
- د۔ جب بچہ کوئی اچھا کام کرے تو تعریف کر کے اس کا دل بڑھانا چاہیے۔ اور اس کو انعام و صلہ دینا چاہیے۔
- ۴۔ دن کے وقت سونے سے منع کرنا چاہیے۔
- و۔ اس بات پر کڑی نظر رکھنی چاہیے کہ بچہ کوئی کام چھپا کر نہ کرے۔
- ج۔ ہر دور کچھ پیدل چلنا اور ورزش کرنا بچے کے لیے ضروری ہے۔ نیز مناسب کھیل کھیلنے کا موقع دیا جائے۔
- ی۔ اپنے پڑھنے لکھنے کے عمدہ سامان پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اس امر کی بچے کو سخت تاکید کی جائے۔
- ک۔ بچہ غریب ہو تو اسے بتایا جائے کہ کسی سے کچھ لینا حوصلہ مندی کے خلاف ہے۔
- ل۔ جب تک کسی ایک فن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل نہ کر لے کسی دوسرے فن

کی طرف توجہ نہ دے ۔

ن - تمام علوم کی تحصیل کا مقصد خوشنودی خدا ہے ۔

ق - جتنے بھی عمدہ علوم ہیں ، ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے ۔

بظاہر مذکورہ اصول معمولی معلوم دیتے ہیں ۔ مگر ان کی بنیاد طویل انسانی تجربات اور امور ربانی اور احکام فطرت پر ہے ۔ اس لیے ان کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں ۔ بشرطیکہ ان پر اساتذہ خلوص سے عمل کریں ۔ دراصل بچے کی فطرت اس درجہ پیچیدہ نہیں جس قدر مغربی اہل فکر نے تاثر دینے کی کوشش کی ہے ۔ فطرت انہی تمام تربوتی قلمونیوں کے باوصفہ سادہ ہے اور دینے ہی بچے کی فطرت ۔ یہی وجہ ہے کہ معلم انسانیت نے تعلیم افعال اور تعمیر کردار کے لیے قرآن کریم اور اپنے کردار و عمل سے جو اصول منضبط کرائے ان کی افادیت اور تاثیر کسی بھی شک و شبہ سے بالا تر ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عصری تقاضوں کی روشنی میں انکی تصریحات مرتب کریں ۔ ان کی موزوں اشاعت و تبلیغ کریں اور انھیں تعلیمی نظام کے مختلف مدارج کا ضروری جز بنائیں ۔ حصول و اشاعت علم و فن کے عمل کو مؤثر اور منظم بنائیں ۔ اس سلسلے میں ضروری سہولتوں کو انسانی حقوق کی روشنی میں عام کریں ۔ اس سارے عمل میں سیرۃ النبی اور صحابہ کبار کے علم و عمل سے استفادہ کریں ۔



# اخلاقیات نبوی

جناب محترم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

جس نقطہ نظر سے یہاں نبوی اخلاقیات (جس کا ماخذ علم یا تو وحی ہے، کی وضاحت مطلوب ہے، اسے انسانی استعداد کی نرٹیدہ اخلاقیات سے متمیز کیے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ ہمارے تاریخی سرمایہ علم میں ہمارے معلمین اخلاق نے انسانی اخلاقیات اور نبوی اخلاقیات میں جو التباس پیدا کر دیا ہے اس کو رفع کیے بغیر نہ تو دونوں قسم کی اخلاقیات کے درمیان امتیازات واضح ہو سکتے ہیں اور نہ نبوی اخلاقیات تک رسائی ممکن ہے۔ اس لیے امتیازات کو سمجھنے کے لیے بحث کی ابتدا انسانی استعداد کی نرٹیدہ اخلاقیات اور اس کے فکری پس منظر کے تجزیے سے کی جاتی ہے۔

## اخلاقیات قدما کے نزدیک

اخلاقیات شعور اخلاقی کا علم ہے۔ یہ ایک نصب العین یعنی منتہائے مقصود (غایت) کا علم ہے غایت خیر کہلاتی ہے۔ اس لیے اخلاقیات خیر کا علم ہے۔

## کائنات اور انسان کی خیر

لیکن خیر کے تصور کو بالذات یعنی اپنے بے طمعنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے یا اسے مختلف اسناد کے سوالوں سے قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ کائنات کی خیر ہو سکتی ہے (افلاطون) یا عالم من حیث الکل کی غایت، جس کی طرف انسان اور اس عالم کی عظیم حرکت میں ہر چیز کو محیط ہے۔ یہ اس کائنات کے ایک جزو کی خیر ہو سکتی ہے۔ یعنی انسان کی خیر بحیثیت انسان۔ یہ اس کی فطرت من حیث الکل کی خیر ہو سکتی ہے جس میں اس کی صحت، فادغ البالی، مسرت، تندیب، علم وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ یا یہ فطرت انسانی کے کسی مخصوص پہلو کی خیر ہو سکتی ہے، یعنی انسان کی خیر اس کے کردار کے حوالے ہے۔

## ۔ مابیت غیر کی جستجو اور ماقبل سقراط فلاسفہ

اب مابیت غیر کی جستجو، یعنی اخلاقیاتی جستجو تادم فکر میں ان تمام مدارج کو لیے ہوئے ہے۔ ماقبل سقراط فکر کا تعلق فلسفہ نظری سے ہے۔ فلسفہ عملی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ کائنات کیسے؟ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ مابیت غیر کیا ہے؟ بہر کیف جو کوئی کل حقیقت پر غور کر رہا ہے۔ یعنی فلسفی۔ وہ اس عالم میں انسان کے، یعنی اپنے مقام و منصب پر غور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نکتے (یعنی انسان کے تعلق) پر غور و غور مذہبی اور اخلاقی غور و غور کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح فلاسفہ قدیم کے افکار کے وہ تمام اجزاء جو ہم تک پہنچے ہیں، مابیت غیر کے بارے میں نہایت عمیق اور دقیق بیانات ہیں۔ لیکن یہ بیانات غیر مربوط ہیں، عامی فکر کی طرح غیر آئنگ ہیں اور مابیت غیر کی جستجو کے طور پر کسی طریق و منہاج کے مطابق ایک منظم، مرتب اور باقاعدہ فکر کی حیثیت نہیں رکھتے۔

### سوفسطہ کا ظہور

اس کے بعد سوفسطہ کا ظہور ہوتا ہے۔ علمائے دانش کا یہ گروہ فن حیات اور زندگی میں آگے بڑھنے کے فن کے مقبول اساتذہ پر مشتمل تھا۔ زندگی بسر کرنے کے فن میں یقیناً چند نیکیوں پر عمل پیرا ہونا بھی شامل ہے۔ یہ فن نیکیوں کے ایک مربوط نظام کو بھی محیط ہے اور ایک حد تک فکر کو نیکیوں پر بھی مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن اس کا اولین تعلق نیکیوں کی مابیت کی جستجو سے نہیں بلکہ نیکی سے اس کا سروکار ذائقہ کامیابی کی حد تک ہے۔ نیکی کے جزو تابعیت ہونے کی حد تک سوفسطائی فلسفہ اخلاقی کردار کا علم نہیں ہے۔

### ماقبل سقراط فلاسفہ کا کوئی اخلاقی فلسفہ نہ تھا

اس طرح ماقبل سقراط فلاسفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا کوئی اخلاقیاتی فلسفہ بھی تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا ہو، اخلاقیاتی وقوف اور انسانی امتیاز کا پختہ ہونا ضروری ہے۔ پہلے مرکب کا وجود ہوتا ہے، پھر لپیٹ کی نوبت آتی ہے۔ پہلے ہمارے سامنے واقعات ہونے چاہئیں، تب ہی ان پر غور کر سکتے ہیں۔ واقعات علمی تحقیقات کی جانب رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان تضاد اور التباس ہی سے اخلاقیاتی غور و فکر کی تحریک ہوتی ہے۔

(یہ تضاد والتباس سوفسطائے پید کیا تھا۔ جہاں تک مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے، نظریات کی کثرت نے انہیں تشنگ بنا دیا تھا)

## سقراط کا فلسفہ اخلاق

سقراط کا موقف یہ ہے کہ :

- ۱۔ نیکی علم ہے کیونکہ ہر فرد اپنی خیر کی تلاش میں ہے اور اسے نیکی تب ہی حاصل ہوگی جب وہ جانے گا کہ یہ اس کی خیر ہے۔ لہذا اچھائی اور برائی کا علم حاصل ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم علت ہے اور نیکی معلول ہے۔ لیکن اس کا میلان یہ ہے کہ علم کو سب سے بلند و بالا رکھا جائے۔
- ۲۔ نیکی مفید ہے۔ غایتیت سے ضرور مسرت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا فی الحقیقت مطلب یہ ہے کہ نیکی دراصل خوشگوار ہے اور لذت ہی غایت اصلی ہے۔

## یونانی ذہن کے نزدیک نیکی اور لذت ہم آہنگ ہیں

یونانی ذہن دونوں خصائل — نیکی اور لذت — کو مخالف قرار نہیں دیتا۔ حقیقت یہ غایت قصویٰ کو مسرت کے اندازہ میں تصور کرنے سے نیکی کو لذت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی حالت ایسی نظر آتی ہے جیسے ایک بچہ، یا ایک متمول آدمی، جس کے لئے ابھی زندگی کی وحدت ختم نہیں ہوئی۔ زندگی کی وحدت واقعی اور معیاری دونوں ایک ہی سمت میں ہیں، مسلسل ہیں اور متمیز نہیں۔ یہ جدا جدا نہیں۔ ان دونوں کے درمیان شکاف نہیں ہے۔ ایک بچہ یا ایک متمول آدمی نیک کرداری یا نیکی کو ایک آسان کارنامہ سمجھتا ہے، جس کی بدولت اسے دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، جس سے بالعموم اسے نفع اور طمانیت دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ فرائض کے ایک محدود اور متعین دائرے میں زندگی بسر کر رہا ہے جنہیں وہ آسانی سے انجام دے سکتا ہے، جنہیں زمین کے بسنے والے اور اس کے زمانے کے سب لوگ سراہتے ہیں۔ وہ اخلاقیات کو غایت کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ خواہش اور اس کی تکلیف کے طور پر ۱۰ اس کے نزدیک فرض اور لذت ہم آہنگ ہیں۔

## دور وسطیٰ کی اخلاقیات تکمیل فرائض میں متصور ہوتی ہے

ازمنہ وسطیٰ میں مذہب کے دور میں انسان بالغ ہو جاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں زندگی کی وحدت ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ انسان حیاتِ ارضی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اور وہ قدم

(ETERNITY) کا بایں ہو جاتا ہے۔ ایک لامحدود وجود اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہاں سے اس کے فرائض کی ابتدا ہوتی ہے، جنہیں اس دنیا کی زندگی سے ہرگز نہیں ناپا جاسکتا۔ ان فرائض کے نتیجے میں لذت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے اور جہاں اسے لذت حاصل ہوتی ہے، وہ فانی لذتوں کے لیے کوئی ذوق ہی نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ فرائض اور تسکین خواہشات (لذت) کو متضاد سمجھتا ہے۔ دونوں کے درمیان شگاف وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ اخلاقیات کو قانون کی صورت میں تکمیل فرائض کے انداز میں احکام خداوندی کے طور پر تصور کرتا ہے۔

### ہمارے معاین اخلاق کے علمی دلولے کا اثر

ہمارے معاین اخلاق اور فلسفہ نے جب قرآن مجید کی اس آیہ پاک سے دلولہ علم اخذ کیا:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

تو ان کے ذہن اور دل سے انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان فرق کا شعور ہو گیا اور وہ سب انسانی استعداد ہی کے زائیدہ علم الاخلاق کو نبوی اخلاقیات تصور کرتے رہے۔

### ترقی یافتہ انسانی اخلاقیات اور اخلاقیات نبوی

اخلاقیات یا علم الاخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ اخلاقیات جو انسانی استعداد علم کے زائیدہ علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسری وہ جو اخلاقیات نبوی کی حیثیت رکھتی ہے اور علم بالوحی سے ماخوذ ہے۔ انسانی اخلاقیات کا موضوع فضائل اخلاق ان کا معیار اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ اس کا وظیفہ معیار اخلاق کے حوالے سے فضائل و رذائل اخلاق کی توجیہ ہے۔ اس کا منہاج یہ ہے کہ پہلے مختلف قسم کے قفسیوں سے اخلاقی قضیے کو متیز کیا جائے، مثلاً:

مکان اچھا ہے (رہائش کے لئے)

گھوڑا اچھا ہے (سواری یا بار برداری کے لیے)

منظر اچھا ہے (اس لیے کہ فرحت بخش ہے)

نمی سب اچھا ہے (کیونکہ حساب صحیح کرتا ہے)

طبيب اچھا ہے (کیونکہ اس کے علاج سے جلد شفا ہوتی ہے)

آدمی اچھا ہے (کیونکہ اس کی سیرت اچھی ہے)

بینائی اچھی ہے (کیونکہ دور اور نزدیک کی چیزیں بغیر عینک کے صاف نظر آتی ہیں)  
صحت اچھی ہے (کیونکہ بغیر تکان کے دماغی اور جسمانی محنت کی جاسکتی ہے)

سیرت اچھی ہے (کیونکہ عمل اچھا ہے)

نظریہ اچھا ہے (کیونکہ علمی توجیہ ہو جاتی ہے)

گرم اچھا ہے (کیونکہ سوال آسانی سے حل ہو جاتا ہے)

عمل اچھا ہے (کیونکہ وہ ایک معیار سپر پورا اترتا ہے)

ان تقایا میں صرف تین قیضے اخلاقی قیضے ہیں: آدمی اچھا ہے۔ سیرت اچھی ہے۔ عمل اچھا ہے۔  
لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معیار کیا ہے؟ یہی انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا بنیادی  
مسئلہ ہے۔

انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی نشوونما کے بہت سے ارتقائی مدارج ہیں جن سے گزرنے  
کے بعد وہ اس مرحلے پر پہنچتی ہے کہ اخلاقیات نبوی کے حوالے سے اپنی کمی کو پورا کر سکے۔  
انسانی اخلاقیات کی نشوونما اقدام و غلطی کے طریقے سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ سوچا گیا کہ مقصود معیار  
کیا ہے؟ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس عمل سے مقصود حاصل نہ ہو  
وہ بدی ہے۔ اور مقصود کبھی تو خواہش کی تکمیل مقصود ہوا، کبھی خواہش کی نفی مقصود ہوا، کبھی  
عقلی تقاضے کی تکمیل مقصود ہوا، کبھی عقلی تقاضا خواہش اور عقل دونوں کی متناسب تکمیل ملے پایا۔ پھر یہ  
مشکل پیدا ہوئی کہ دونوں کا تناسب کیسے متعین ہوگا؟ اس طرز فکر نے مصلحت پرستی کو اخلاقی بنا دیا۔  
حالانکہ انسان کا شعور اخلاقی اس سے بغاوت کرتا ہے۔

چونکہ انبیاء کی تاریخ نے نوع انسانی کو دو قسم کی وراثت سپرد کی ہے: ایک انفسی وراثت، جو  
انسان کے باطن میں ہے، جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

وَرَبِّكَ أَفْأَلَمَ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

اور دوسری آفاقی وراثت جو قرآن مجید ہے، جس سے نبوی اخلاقیات اخذ کی جاسکتی ہے۔

تاریخ انبیاء کی انفسی وراثت فحور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت  
اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے اور پورے عالم انسانی میں، کسی نہ کسی درجے میں، کم  
یا زیادہ یہ احساس موجود ہے کہ جو نشوونما نہ پاسکے، اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسی  
لا شعور کو نشوونما دیکر، جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

فَطَرَهُ اللَّهُ إِلَهًا وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۝

جیسے بالقوہ فطرت کہہ سکتے ہیں، جسے نشوونما دیکر ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت انسانی کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی تھی، جس کے لئے علم بالوحی سے روشنی (تعیین غایت)، رہنمائی (دلائل و عمل)، اور ہدایت غایت تک پہنچانے کا خاص طریق کار میسر آتا رہا، جس کے زیر اثر انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات ارتقا پذیر ہو کر مقصود کے بجائے "اخلاقی کم" کو معیار بنانے کے مقام عروج پر فائز ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ جو فعل اخلاقی حکم کی پیروی کی نیت سے صادر ہوتا ہے وہ یقیناً ہے اور جو فعل اخلاقی حکم کی خلاف ورزی میں صادر ہوتا ہے وہی بدی ہے!

اول تو ذہن انسانی حیات انسانی کو تمام فضائل اخلاق سے مزین کرنے کے لئے اخلاقی احکام کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے اور اگر وہ اخلاقی احکام کا احاطہ کر بھی سکے تو بھی صرف یہ مسئلہ تو حل ہو جائے گا کہ فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے، مگر انسانی استعداد کا زائیدہ نظام اخلاقیات اس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گا جب تک اخلاقیات نبوی کے حوالے سے پہلے یہ مسئلہ حل نہ ہو کہ زندگی فضائل اخلاق کے نمونے پر ڈھلے تو کیونکہ اس لیے اخلاقیات نبوی مقدم ہے اور انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات مؤخر ہے۔

لہذا نبوی اخلاقیات کا مسئلہ بعثت نبی علیہ السلام والتمیہ کے حوالے سے متعین ہو سکتا ہے۔ نبوی اخلاقیات (علم الاخلاق) کو علم بالوحی یعنی وحی قرآنی سے اخذ کرنا ضروری ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

لَبِثْتُ لَأَتِمَّةً مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

یعنی میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں — مگر یہاں یہ غور کرنا ضروری ہے کہ انسانی زندگی سب فضائل و محاسن و مکارم سے مزین ہو جائے بلکہ اتمام مکارم اخلاق اس وقت میسر آئے گا جب بدی کے مقابلے میں نیکی کو کسی قسم کا اضمحلال نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غایت بعثت یہ ہے جو اس آیت پاک میں بیان ہوئی ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ٥

مگر جب سے ہم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم اور علم بالوحی کے مابین امتیاز سے صرف نظر کیا ہے ہم انسانی استعداد ہی کی زائیدہ اخلاقیات کو نبوی اخلاقیات سمجھتے رہے ہیں۔ جسے اس میں شک ہو وہ حضرت مولانا سلیمان ندوی کی سیرت النبی کی چھٹی جلد کو غور سے دیکھتے تو نظر آئے گا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اسطوبی کے شاگرد ہیں، کیونکہ اس میں فضائل اخلاق بھی اسطوبی کے بیان ہوئے

ہیں۔ عفت، شجاعت، حکمت اور راس الحنات عدالت اور معیار افراط و تفریط کے درمیان نقطہ اعتدالی جو ارسطو کو بھی نہیں معلوم کہ افراط و تفریط کی دو انتہاؤں کے درمیان کہاں واقع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے درمیان نوعیت کا نہیں بلکہ مدارج کا فرق ہے۔ جو بدی افراط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کو کچھ کم کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی اور جو بدی تفریط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کا اضافہ کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی۔ ————— جب سے ہمارے ذہن سے علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیاز محو ہوئے ہیں ہم نے لوٹ کر نہیں دیکھا کہ ہمارے تمام معلمین اخلاق — ابن مسکویہ، محقق طوسی، محقق دوانی — اپنی عظیم الشان تصانیف میں ارسطو ہی کے فلسفہ اخلاق کی جگہ کی فرماتے رہے ہیں۔ ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق تو ارسطو کی نیکو میکن اسٹیکس کا چہرہ ہے اور محقق طوسی اپنی اخلاق نامہ کی کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں کہ: میرا کوئی شیوہ بجز ارسطو کے فلسفہ اخلاق کی ترجمانی کے نہیں ہے۔ اور محقق دوانی نے بھی ارسطو ہی کا فلسفہ اخلاق اخلاق حلائی میں پیش کیا ہے۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے بھی اپنے فلسفہ اخلاق پر مشتمل رسالے میں ارسطو ہی کے فضائل اخلاق کو فضائل اخلاق سمجھا ہے جو دور جاہلیت کے و تن پرستی کے ماحول میں فضائل اخلاق متصور ہوں تو ہوں مگر نبوی اخلاقیات کی روشنی میں ان کی حیثیت ردائل اخلاق سے مختلف نہیں رہ جاتی۔

## انسانی علم اور علم بالوحی

جب تک انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیازات پیش نظر نہ رہیں، علم بالوحی سے استفادہ ممکن نہیں۔ انسانی علم تو اس استعداد کے قوت سے فعل کی طرف آنے کا نتیجہ ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے:

عَلَّمَآدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

یہ استعداد اور اس سے پیدا ہونے والے علم کی نشو و نما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نشو و نما کا اتمام کو پہنچنا تو کیا اس کے اتمام کا رخ بھی متعین نہیں ہو سکا اور انسانی کفر تضادات میں الجھ کر رہ گیا اور انسانی ذہن کا زائیدہ علم یہ طے نہ کر سکا کہ اخلاق کا معیار ”مقصود“ ہے یا ”حکم“ ہے کیونکہ بار بار معیار کے باب میں لرزے بدلتی رہی ————— بخلاف اس کے نبوی علم و ہدایت خالص، بذریعہ اور فضل محض ہے۔ وحی سے ماخوذ ہے،

احتمالی خطا سے پاک ہے، ہمیشہ سے کامل ہے۔

## انسانی علم اور علم بالوحی میں امتیاز

انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیازات کو سمجھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ پہلے علم اور عمل کے درمیان امتیاز کو سمجھا جائے کیونکہ علم کا موضوع حقیقت محسوس ہے اور عمل کا موضوع مقصود ہے۔

علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہو؟  
علم کی ابتداء شک سے ہوتی ہے۔ عمل کی ابتداء یقین سے ہوتی ہے۔  
علم میں ادراک اہم ہے۔ عمل میں ارادے کو اہمیت حاصل ہے۔  
علم کا بنیادی تصور جبر ہے۔ عمل کا بنیادی تصور اختیار ہے۔  
علم کا دلیلہ توہمہ و تعلیل ہے۔ عمل کا دلیلہ تخلیق و تبارج ہے۔

علم کے مضمرات — یعنی وہ شرائط جن کے پورا ہونے کے ساتھ علم مشروط ہے — یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو، دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں ادراک کی صلاحیت ہو اور منظور الیا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آسکے تو علم حاصل ہوگا۔ ————— بخلاف اس کے عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف فعال عامل ہو، دوسری طرف مقصود ہو۔ حصول مقصود کی جہد و جہد کی راہ میں مزاحمت ہو اور فعال عامل کی جانب سے مزاحمت کی فراحت ہو تو مقصود حاصل ہو کر رہے گا۔

لہذا انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ فعال عمل اخلاق کیا ہیں؟  
ان کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ درمیان یہ یاد رہے کہ جس مابعد الطبیعیات کا مطالبہ انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کو ہے اس کی استعداد ادا نہ کر سکتا ہے (کو عطا نہیں کی گئی)۔

بعثت نبوی کا مقصود حیات انسانی کے انفرادی (اخلاقی)، اجتماعی (معاشرتی)، معاشی (سیاسی) اور بین الاقوامی پہلوؤں میں انقلاب لانا ہے۔ اور وحی قرآنی کا پیغمبرانہ قیادت کی دعوت انقلاب میں اسے ہدایت فراہم کرنا ہے۔ اخلاقی کا تعلق افراد اور معاشرے سے ہے کیونکہ پیغمبرانہ قیادت جن خدائیں کا حامل معاشرہ پیدا کر کے اس کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر دین حق کو غالب کرنا چاہتی ہے وہ یہ ہیں،



- معاشرہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔
- اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔
- ان کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہے۔

## نبوی اخلاقیات کے مسائل

لہذا انقلابی اخلاقیات نبوی کے مسائل یہ ہیں :

- ۱ زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خواہش کیا ہے ؟
- ۲ اس اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے ؟
- ۳ کس نصب العین کے حوالے سے اصلاح ہوگی ؟
- ۴ حصول نصب العین کے یقین کی اساس کیا ہے ؟
- ۵ حصول نصب العین کا مستقیم نتیجہ خیر یا شرم عمل کیا ہے ؟
- ۶ اس پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہے ؟
- ۷ عملی جدوجہد کو پرکھنے کا معیار کیا ہے ؟
- ۸ اس جدوجہد میں کامیابی کا نمونہ کمال کیا ہے ؟ اور
- ۹ وہ محرک عمل کیا ہے جو استقامت دلادے اور انحراف نہ کرنے دے۔

انسانی استعداد کی نامیدہ اخلاقیات نہ توقعات سے پاک ہو سکی ہیں نہ نتیجہ خیزی کی ضمانت سے متصف ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسئلہ ہی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے ؟

## انسانی علم اور علم بالوحی میں التباس

علم بالوحی (قرآنی علم، پیغمبریت، قیادت کی انقلابی جدوجہد کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نازل ہوا ہے جو انقلاب کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے بے نیاز کرتا ہے۔ مگر مذہبی ذہن کی معذوری یہ ہے کہ وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ اور زیر زبر کے محفوظ ہونے کے باوجود قرآنی علم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ذہن نے قرآنی مفہوم میں اسے کتاب سمجھنے کے بجائے لغت کے حوالے سے تفسیر کی تمثیل پر قیاس کر کے حرف اور نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ تصور کیا ہے۔ اور تفسیر کی معذوری یہ تھی کہ اس کی پیرامیت زوال میں مبتلا ہو جانے کے بعد حرف تفسیر کے حوالے سے نئی

بعثت کے بغیر زوال سے نہ نکل سکی تھی۔ اس لیے مذہبی ذہن کے نزدیک امت مسلمہ کی معذوری بھی یہی ہے کہ وہ بھی نڈال پذیر ہو کر قانون سازی کے بہار نڈال سے ہی اپنے نیک نکل سکتی کہ جب وہی قرآنی سے ایک دفعہ اوامر و نواہی کا علم حاصل ہو گیا تو وہ انسانی علم بن گیا۔ اور اب یہ انسان ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ احکام شرع کی پیروی کرے تو اصلاح پذیر ہو، نہ کرے تو گمراہی میں مبتلا رہے۔

## شرع کو اخذ کیا گیا اور منہاج سے حرف نظر کیا گیا

دراصل اس موقف کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آیت  
 وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَنُصْلاً جَا ط  
 میں مذہبی ذہن نے اپنی توجہ صرف ”شرع“ پر مرکوز رکھی اور ”منہاج“ سے حرف نظر کر لیا حالانکہ منہاج وہ طریق کار تھا جس کے ذریعے زندگی شرعی اقدار و فہمائش کے نمونے پر ڈھلتی کیونکہ علم بالوحی کا تو مسئلہ ہی یہ تھا کہ حیات انسانی کو اپنے انفرادی و اخلاقی، اجتماعی و معاشرتی، معاشی، سیاسی، اور بین الاقوامی پہلوؤں میں جس نمونے پر ڈھلتا چاہیے وہ ڈھلے کیونکر؟

دوسری وجہ تکمیل دین کے قرآنی مفہوم کو مسخ کر کے اسے تکمیل فقہ قرار دینا ہے۔ ایک اور وجہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا ہے کہ مثرات زندگی و اخلاق، علم، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست کے بدل جانے سے زندگی کے تقاضے احکام فقہ کی خلاف ورزی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن مجید سے قانون حیات اخذ کرنے کے بجائے صرف فقہی قانون کو اخذ کرنے کا نتیجہ ہے۔ قانون سازی اس وقت تک موثر رہی جب تک سلاطین غلبے اور اقتدار سے محروم نہیں ہوئے۔ جب سلاطین اقتدار سے اور قانون قوت نافذہ سے محروم ہوا تو قانون بے اثر ہو گیا۔ اگر کتاب کا قرآنی مفہوم پیش نظر نہ ہوتا تو اسے لغت کے حوالے سے اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ سمجھنے کے بجائے قانون حیات کا ماخذ سمجھ کر اس سے زندگی طلب کی جانی چاہیے تھی۔

## کتاب کا قرآنی مفہوم

کتاب کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لیے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس اندازہ خطاب پر غور کرنا ضروری ہے۔

فَمَا كُنْتُ تَشْدِرْنِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ

دکریہ بات آپ کا ادراک ذاتی نہیں ہے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے بلکہ آپ کو وحی سے معلوم ہوا ہے)

اگر کتاب کو کتاب سمجھنا وحی کے ساتھ مشروط نہ ہوتا تو توریت تو پہلے سے موجود تھی ہی۔  
قرآن مجید سے کتاب کے جس مفہوم کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے اسے ان آیات کے حوالے سے سمجھنا فروری ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ

(ہر امت کے لیے ایک فیصلہ کن ساعت ضروری ہے)

لِكُلِّ أُمَّةٍ كِتَابٌ

(ہر فیصلہ کن ساعت کے لیے کتاب ضروری ہے)

جب تک یہ بات سمجھ میں نہ آئے کہ امت کے تعلق میں فیصلہ کن ساعت کے اندر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کونسی امت اپنے اعمال کی بنیاد پر اس بات کی حقدار ہے کہ وہ باقی رہے اور ترقی کرے اور کونسی امت اپنے اعمال کی بنا پر مٹا دیے جانے کی سزا وار ہے۔ اس وقت تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ فیصلہ کن ساعت سے کتاب کا کیا تعلق ہے؟ کتاب کا مفہوم کافروں پر قرآن مجید کے اس طنز کے حوالے سے  
لَا هُدًى وَلَا كِتَابٌ مُّزِينٌ

نہ حیات بخشی کا ضامن مقصود ہے نہ اس مقصود تک پہنچانے کا حتمی نتیجہ خیز عمل ہے اور کافروں پر اس طنز کا جواز تب ہی پیدا ہوتا ہے جب قرآن مجید خود وہ کتاب اور ہدایت ہو۔

## نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل

لہذا:

نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل یہ ہے:

- (۱) زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خاصیت انسان کی بالفعل فعلت یعنی جلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کا اپنے آپ کو بلا قید پورا کرنے کا میلان اور اس کا مجموعہ افساد ہونا ہے، جس کی نشاندہی اس آیت پاک میں

کی گئی ہے :

رَبِّكَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّجَرَاتِ مِنَ النَّبَاتِ وَالْبَنِينَ وَالْعَنَابِ  
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ وَالْجَنِّ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَلْعَامِ  
وَأَفْخَرُ ذَلِكَ مَنَاجِ الْأَحْيَاءِ الدُّنْيَا

(۲) اصلاح پذیری کا تصور یہ ہے کہ انفرادی زندگی ضبط و انضباط کی پابند بنائی جائے اور اس میں فاعل اخلاق کے اپنے متعلق اور دوسروں کے تعلق میں حسن فضائل کا پیدا کرنا ضروری ہے وہ پیدا کیے جائیں۔

(۳) اس زندگی میں ہر تبدیلی نصب العین کے حوالے سے لائی جاسکتی ہے۔ اور وہ نصب العین جس کے حصول کی جلد و جہد کے ضمن میں اخلاقی فضائل پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، انسان مرتضیٰ یعنی ایسا انسان بننے کا نصب العین ہے جس سے اللہ راضی ہو۔

(۴) اس نصب العین کے حاصل ہو کر رہنے کے یقین کی اساس انسان کی مابعد الطبیعی ساخت ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے۔  
وَفِي الْفَنسِكُمْ أَفْلا تَنْبَصُّونَ

یہ انسان کی فطرت کا بالقہ پہلو ہے جس کی نشاندہی اس آیت پاک میں کی گئی ہے :  
فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

فطرتِ انسانی کا یہ پہلو مجبور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے جن کی طرف ان آیات میں

اشارہ ہے :

الْهَمَّهَا فَجُورُهَا وَتَقْوَاهَا  
الَّتِي بَرَّيَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ  
بَلَىٰ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ  
يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(۵) کائنات کی ساخت میں مضمر وہ قانون نشوونما جو اپنی نامیت میں ناقابل تغیر ہے اور ناقابل شکست ہے، مزاحمت اور مزاحمت کا قانون ہے۔ جس کی تشکیل قرآن مجید

میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :

بَجَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ

(ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کر دیا)

یہ دشمن جب پیغمبرؐ کی مخالفت کرتا ہے تو اس مخالفت کی مزاحمت سے دعوتِ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

جب اخلاقِ کمال کے حصول کی جدوجہد میں بالفعل فطرتِ مزاحم ہوتی ہے تو فوجِ و تقویٰ کے امتیاز اور ربوبیت کے اقرار کے حوالے سے بالقوہ فطرت اس مزاحمت کی مخالفت سے بالفعل فطرتِ رجعی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر غالب آتی ہے۔ اور اسے ضبط و انقیاد کا پابند بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

(۶) اس کا لائحہ عمل عبادت کے ذریعے ایثار، اتفاق اور اسان کے جذبات کو نشوونما دیتا ہے۔

(۷) اس کی عملی اساس اخلاق اور معیشت کے درمیان باہمی جوابی اضافی متضانی اور وجوبی تعلق کا ادراک ہے۔ جس کی طرف اس آیتِ پاک میں اشارہ ہے :

لَٰكُنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

اگر تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جو تمہاری نظر میں پسندیدہ ہے)

اتفاقِ فاعل اخلاق کی تو نیکی ہے اور اس اتفاق سے مستفید ہونے والے کے حق میں معیشت ہے۔ اور یوں اخلاق اور معیشت کا وجوبی تعلق متصور ہوتا ہے اور اس کی نتیجہ خیزی کا انکار ممکن نہیں۔

(۸) اخلاقی فضائل کا معیار نبوی اخلاقیات میں تو ”حکم“ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو فعل منزلی من اللہ حکم کے اتباع سے صادر ہو وہ اخلاقی فضیلت (نیکی) ہے اور جو ”حکم“ کی خلاف ورزی کی نیت سے سرزد ہو وہ اخلاقی زوال (بدی) ہے۔

بمخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی رو سے مقدم معیار ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس سے حاصل نہ ہو وہ بدی اور ہمارے معلمین اخلاق ابھی تک جاہلیت کے اخلاقی معیار کی پیروی سے نہیں نکلے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی واعظینِ کرام کی زبان سے اخراؤ و تفریہ کے درمیان

نقطہ اعتدال کے معیار اخلاق کی تبلیغ بلکہ اسلام لا ایسی معیار اخلاق بھی سننے میں نہ آتا۔

## نمونہ کمال

نبوی اخلاقیات کی رو سے نمونہ کمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ  
لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

## استقامت کا محرک

نبوی اخلاقیات کی رو سے ایسا محرک محمد رسول اللہ کی تصدیق اور تکذیب کا، یعنی اسلام اور کفر کا تضاد ہے اور انسان کے لا شعور میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ہر کامیابی کے لیے فضائل اخلاق ضروری ہیں۔ اگر فضائل و رذائل کے امتیاز سے شعور عاری نہ ہو تو پہلا تضاد خواہش اور فرض کے درمیان متصور ہوگا۔ اور دوسرا خواہشات کے غلاموں اور فرض کی ادائیگی کے ذمہ داروں کے درمیان ————— اور یہی وہ تضاد ہے جس سے پیدا ہونے والی مزاحمت کی مزاحمت سے اخلاقی فتح والبتہ ہے !

# دعوت و تبلیغ

رسول اکرم کا عزم و استقامت  
جناب محترم ڈاکٹر ایں ایم۔ زمان

مجھے اپنی معروضات کا آغاز اس اعتراف و اعتذار کے ساتھ کرنا ہے کہ علماء و محققین کے اس مقتدر اجتماع میں کوئی علمی و تحقیقی مقالہ پیش خدمت نہیں کر رہا ہوں۔ محترمی حکیم صاحب نے محض اپنی روایت کریمانہ کے پاس خاطر سے علماء اور دانشوروں کی اس محفل میں حاضر ہونے کا بلاوا ارسال فرمایا تو ان کی کرم گستری و عزت افزائی پر اظہار تشکر کے ساتھ اپنی جوانی سحریر میں گزارش کی تھی، ”اخلاقیات نبوی کے موضوع پر مذاکرہ ملی کے اہتمام کے لیے مبارکباد تو آپ کو کل عالم دے گا، یہ گنہگارہ صمیم قلب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ یہ موضوع میری، میرے بچوں کی، میرے احباب اور اقربا اور رفقاء کی اور میری قوم کی شدید ترین ضرورت ہے۔“

ایک ماہر بناض کی طرح آپ نے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی دکھتی رگ۔ ہماری روز بروز انحطاط پذیر اخلاقی اقدار۔ کو پکڑا ہے، ایک طبیب حاذق کی طرح اس مہلک مرض کے نسخہ کیس کیا۔ اخلاقیات نبوی۔ کی نشاندہی کی ہے اور پھر قومی سطح پر اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہمدرد کے وسائل اور معروف تجربہ کو کام میں لانے کی روایت جاری رکھنے کا عزم کیا ہے۔ یہ مرض واقعہً اہل درد (اور اہل مرض) کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔ کہ بندے بندے کو لاحق ہے۔ کونسی وبا ہوگی جس نے اپنے ہلاکت آفرین بیجے اس ظالمیت و وسعت کے ساتھ انسانوں کے قلب میں پیوست کیے ہوں کہ کوئی اعلیٰ یا اسفل، حکیم یا جاہل نہ بچا ہو۔ ستم یہ کہ مرض معلوم و معلوم طبیب مشفق و رحیم بلکہ رحمۃ اللعالمین، اس کی دعوت عام برائے

اہل انام۔ مگر معاذ اللہ کیا ہولناک منظر ہے کہ مریض اپنے رستے ناسور اپنے ہی ناخنوں سے کمریدتے نوچتے چلے جائیں، لمبو لہان ہوتے جائیں، پر اپنے مرض کو آسان خیال کریں اور درخور اعتنا نہ سمجھیں یا سرے سے مرض ہی نہ مائیں۔ اور اس طرح اپنے رستے ناسوروں کو بہائم کی طرح بھنبوڑتے ہوئے بے بس ہو ہو کر گرتے جائیں۔ اجتماعی خودکشی کرنے والوں کا یہ خود فراموش جرم غفر!! کاش کوئی آداب اخلاق ہم مظلوموں کو اس قاتل بے حسی کی کیفیت سے بیدار کر کے ان گنہگار زخموں پر طیبہ شرب صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ مرہم رکھ سکے۔ اور ہم گنہگاروں کے ابدی تشکر کی سزاوار ہو۔ آخر میں اس دلی تمنا کا اظہار تھا کہ:

”مجھ گنہگار کی دعا بھی ہے آرزو بھی کہ یہ مذکورہ ملی و علمی و تحقیقی مقالاتِ فاضلہ کے ذریعہ پشاور کے بجائے اہل درد کی عارفانہ صدمے صدق ہو سکیں آداب اخلاق ہو۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ اپنی کتاب ”سیرت سرور عالم“ جلد اول کے مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدائنا ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روحِ دین تک رسائی پائے۔“

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گرامی شخصیت انبیاء و صلحین عالم میں اس لحاظ سے مسئلہ طور پر شانِ امتیاز کی حامل ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو تاریخی کی پوری روشنی میں ہے۔ شمعِ رسالت کے پردوں نے آپ کے احوال و اخبار و فضائل ہی نہیں ہر برادرِ کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور ہر دور میں عالمینِ علم کا ایک معزز و محترم گروہ نسلِ بعد نسلِ ابلاغ کے اس مقدس و طیفے پر سرفراز ہوتا رہا۔ نہ بے نصیب اس امت کے جس کا نورِ نصیرت، ابدی ہدایت کا نسخہ دیکھیا ہر تشریف یقین سے متبر اور

سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور عالم، جلد اول، لاہور، ادارۃ ترجمان القرآن، ۱۹۶۹ء (طبع دوم)، ص ۳۶



جس کے ہادی و مولاکا اسوۂ حسنہ و کاملہ مثیل آئینہ مصفا۔ اور حیف اُس قوم کی بے نصیبی پر جو روح کو حرارت ایمان بخشنے والی، آدمی کو انسان بنانے والی، بلکہ معراج انسانیت تک پہنچانے والی اُس برقی قوت کے سرچشمہ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیتی ہے، جو ہدایت کے آفتاب عالم کتاب کی حیات بخش شعاعوں سے فرار اختیار کرتی ہے۔ اور اندھیروں کی وادی میں فروزاں چمکیلی مگر نہرطی روشنیوں کی طرف لپکتی ہے۔ اور اس طلسمات کے سحر میں مسکور ان متعقن اور اذیت ناک ناسوروں سے بے خبر ہے جو اُن مسموم شعاعوں میں پک رہے ہیں جن میں اُن کا وجود گھل رہا ہے۔ صدائے ہجرس برابر سنائی دے رہی ہے، مگر کچھ کان بہرے ہو چکے، کچھ اسے پہچانتے نہیں، کچھ خوفزدہ ہیں، کچھ کان کھڑے ہوتے ہیں مگر زبان کو لبیک کا یاد نہیں۔ کہاں ہیں وہ نفوس قدسیہ جن کی آواز اُن بیمار دہنوں اور مفلوج جسموں میں حرارت نہ لیست دوڑا دے۔ اُن کو کشاں کشاں طیبہ شرب کے قدموں میں لا ڈالے جہاں دوا بھی ہے شفا بھی ہے۔ یہیں سے ان کی ابتداء تھی یہیں انتہا بھی ہے۔ انہی قدسی قدموں کے صدقے اس کی اٹھان تھی، اُٹان تھی۔ یہیں اس کا ملجا بھی ہے مادی بھی۔

ہر سال ہمارے ماں میلاد کی محفلیں سمیٹتی ہیں۔ تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے، مذاکرہ، مشاعروں، جلسوں، جلوسوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ ماہ و سال اپنے ناگزیر سفر میں محو تہرام رہتے ہیں پر دانش و تحقیق کے پتھاروں تلے دبے دانشوران ملک و ملت نے کبھی سر اٹھا کر حساب کیا کہ ہم کتنے قدم آگے بڑھے ہیں اس قدر مقدس نقش پا کی طرف جسے نشانِ منزل بنانے کے عہد کے ساتھ ہم نے آزادی کا سفر شروع کیا تھا، محلِ فکر بھی ہے اور مقامِ فکر بھی کہ۔

ہم اس پیغمبرِ وفا کیش کے نام لیوا جس نے مشرکین کے ہاتھوں مظلوم و محبوبہ پابزنجیر نوجوان ابو جندل کو ڈوبتے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ اُس کے والد حسین بن عروہ کے سپرد کر دیا کہ صلح کی بات طے پا چکی تھی۔ گو عہد نامہ حدیبیہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا، نہ اس پر دستخط ہوئے تھے۔ نہ

ہم نے بھی اپنے خالق و مالک سے ایک عہد کیا جس کی صدائے بازگشت ہمارے بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں کی زبان کا ورد ہو گئی۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

ک۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، القسم الثانی، مصر، مصطفیٰ البانی الحلی، ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء ص ۳۱۸

کافرو قریہ قریہ گاؤں گاؤں گونجا۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو رب جلیل نے ایک مرد عظیم کے ہاتھوں اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ ہمارے حصے کی شوق باقی رہی۔ ۳۵ برس ہونے کو آئے ہیں اس عرصے میں ایک نئی نسل جوان ہو کر کہولت کو پہنچ گئی۔ کیا ہم اپنا قرض اتار چکے؟ ہم نے ارض پاکستان کو لا الہ الا اللہ کا جیتا جاگتا نقشہ بنانے میں کہاں تک پیش رفت کی؟ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی پر کہاں تک اخلاقیات و تعلیمات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ پڑھا؟

دستوری یا قانونی بحث پیش نظر نہیں، ہمارے معاشرے کے علی خدوخال پر نگاہ ہے، ذرا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ کہاں تک اس میں اسلامی معاشرے کی شان ہے۔ اخبارات کے کالم گواہ ہیں کہ قتل، حادثاتی ہو یا ارادی روز کا معمول بن چکا ہے۔ ڈاکہ زنی کوئی چوٹ کا دینے والی خبر نہیں رہی۔ فحاشی اور بدکاری کی بعض لرزہ خیز مثالیں حتیٰ کہ مقدس رشتوں کی پامالی اگر شاؤ و نادر کے صحن میں بھی آئیں تو تقویٰ اور خدا ترسی کے رجحان کے تشویشناک فقدان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں وفاقی شرعی عدالت نے ایک دس سالہ معذور بچی کی آبرو ریزی کی کوشش کے الزام میں سزا یافتہ ایک ملزم کی اپیل مسترد کی تھ گوبرنور کے ایک نواحی گاؤں میں معلوم افراد نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک چار سالہ معصوم لڑکے کو نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسجد میں لے جا کر ذبح کر دیا۔ سٹہ۔ قرآن میں ارشاد ہوا اللہ مسرفون کو سوت نہیں رکھتا۔ رحمن کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے، نہ شخص سے کام لیتے ہیں بلکہ راہ اعتدال اختیار کرتے ہیں۔ ایک سرکاری ادارے کے حالیہ سروے کے مطابق لاہور کے شہری پان سکرٹ پر روزانہ ۹ لاکھ روپے خرچ کرتے ہیں۔ پشاور میں ہر سہفتے تین لاکھ کی نسواں استعمال کی جاتی ہے۔ شادی بیاہ جہیز بری کی مسرفانہ نمائشوں سے کون واقف نہیں۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں نظم و ضبط کی روز بروز گرہ لگتی حالت، تجارت میں چھوٹے اور بڑے پیمانے پر دیانت کے اصولوں کے بجائے جلد از جلد زراں دوزی کا رجحان جس کی ظالم چکی میں غریب اور میاں طبقہ بری طرح پس رہا ہے، ثروت

سٹہ۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۲/۱۲/۱۹۸۱ء سٹہ ۶۷:۲۵ القرآن۔ ۱۳ روزنامہ نوائے وقت ۱۳/۱۲/۱۹۸۱ء

و محبت کی روایات خواب و تخیال، جھوٹ اور منافقت کی گرم بازاری، رشوت ستانی، حلال و حرام سے بے نیازی - آخر ہم غور کیوں نہیں کرتے؟ ہمارے دلوں، دماغوں پر قفل کیوں پڑ گئے ہیں؟ یہ اخلاق باختگی کے ذریعہ سے اجتماعی خود کشی کا یہ عمل کیوں جاری ہے؟ کب تک جاری رہے گا؟ اس تباہ کن سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے لئے کوئی منظم تحریک کیوں نہیں اٹھتی؟

شاید میں نے تصویر کے تاریک رخ پر زیادہ زور دیا ہو مگر مجھے اس میں سرمو شبہ نہیں کہ ہمارے قوی و انفرادی اخلاق کی گرتی دیوار کو سہارا دینے کے لئے ہمیں اخلاق محمدی کی دعوت کو اسی عزم کے ساتھ عام کرنا ہوگا، اسی استقلال، اسی صبر و استقامت کے ساتھ چلنا ہوگا جس کی روشن مثال ہمیں صرف اسی انسان کامل کے اسوہ کاملہ میں مل سکتی ہے۔ بلاشبہ اس راہ میں بھاری مشکلات ہیں۔ ان کا حل تجدیدِ عہد کے ساتھ وہ عزم و ثبات چاہتا ہے جس کا نمونہ ہمیں بنی کریم کی حیاتِ طیبہ کے ہر دور میں ملتا ہے۔ مکہ معظمہ میں اعلانِ نبوت فرماتے ہی آپ کو کن مسائل سے پالا نہیں پڑا، ہجرت کے بعد کیا نازک مقام آئے۔ محمد مصطفیٰ کی سیرتِ طاہرہ عزم و استقلال کی ایک طویل داستان ہے۔ یہاں صرف چند اشارات ممکن ہیں جو یقیناً انسانی عزم و استقامت اور ہمت و استقلال کی تاریخ میں سنگِ میل اور منارۃ النوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالرحمن عزام اپنی مختصر مگر نہایت خوبصورت اور ایمان افروز کتاب **بطل الابطال** لکھتے ہیں:

وَالنَّاسُ جَمِيعًا طُلَّابُ الْحَقِّ اَمْ يَجِبُ اَنْ يَكُوْنُوْا كَذٰلِكَ وَقَدْ ضَرَبَ لَهُمْ مُحَمَّدٌ نَّمُوْدًا اَعْلٰی..... وَهُوَ النَّمُوْدُ اَعْلٰی لِلنَّبَاۓتِ عَلٰی الْحَقِّ وَالِدَعْوَةِ اِلٰی اَنْ يَكُوْنُ النَّاسُ كَافَّةً يَلْبُوْهُ عِيْدٌ اَوْ رَفِيْہًا يَبْنِيْهِمْ اٰخُوَانًا۔

ترجمہ: سب انسان حق کے متلاشی ہیں یا دم از کم، انہیں ایسا ہونا چاہیئے۔ ان سب کے لئے محمدؐ نے سب سے اعلیٰ سب سے ارفع مثال قائم فرمائی... ماں وہ مثلِ اعلیٰ ہیں، حق پر ثبات قدمی میں اور سب انسانوں کے نام اس دعوت میں کہ وہ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جائیں؟

۴۰: ۲۴ (القرآن) شہ عبدالرحمن عزام، بطل الابطال، القاہرہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء، ص ۱۸

۶۱۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں اس دعوت کا آغاز ہوا جو حکم کا لام تھا۔ بقول کارلائل محمد کا درد و تار بیکوں سے نور کا ظہور تھا۔ مگر جیسا کہ سر ولیم میوٹر (SIR W. MUIR) نے اعتراف کیا ہے:

اصلاح کی دعوت کبھی اتنی دشوار اور منزل مراد سے اتنی بعید نہ تھی جتنی محمد کے ظہور کے وقت، بایں ہمہ اصلاح کا عمل کبھی ایسی خوبی سے تکمیل پذیر نہ ہوا تھا جیسا آپ کی وفات کے وقت ہو چکا تھا۔

شاید اسی لیے ریزنڈ باسور تھ سمٹھ (REV. BOSWORTH SMITH) نے طرز صدر کے ساتھ کہا: ”محمد بلا اختلاف مصلحین عالم میں سب سے عظیم تھے۔“

## عزم و ثبات

آئیے دعوت حق میں عزم و ثبات کی اس لازوال داستان کے چند ابواب پر نظر ڈالتے ہیں۔

آپ کی ولادت قریش کے اس معزز طواغیہ میں ہوئی جس کا منصب بیت اللہ کی ولایت اور اہتمام کی رعایت کی بنا پر عربوں کے پرہیزگاروں کا تھا۔ تعلیم و تقدیس کی اس میراث کو غیر باد کہہ کر سرے سے اس نظام کے اہتمام کا عزم ہو اس میراث کا بنیاد بنا ستون تھا، بڑے دلی گمراہی کا کام تھا، کتنا بڑا امتحان تھا! موردنی شکست و سلطوت پر ضرب کاہری لگانے کے لیے کیسے عظیم عزم کی ضرورت تھی! مگر محمد کی ہمت کے قدم خدا بھی لڑکھائے؟ دعوت حق کی راہ میں یہ گراں قدر میراث کچھ بھی آڑے آئی؟ محمد کے پائے ثبات نے کہیں بھی لغزش کھائی؟ یہ سنت ابراہیم کا انقلابی احیاء تھا؟

تبلیغ حق کا دائرہ وسعت پذیر ہوا تو مخالفت کا طوفان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دنیوی پشت پناہی کا لحاظ کریں تو ابولہب آپ کا سب سے بڑا سپارہ تھے۔ رؤساء قریش ابولہب کے پاس دو ٹوک بات کہنے کے لیے آئے۔ عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل سبھی تھے۔ ابولہب اس نازک صورت حال کا احساس کر کے آنحضرت سے مخاطب ہوئے: ”جہان عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈال جو میں اٹھانہ سکوں۔“ یہ آسرا بھی ٹوٹنے نظر آیا۔ ہر کیا مجال جو قدم لڑکھائے ہوں۔ ناقابل شکست عزم کے ساتھ محمد کے یہ الفاظ زبان سے نکلے اور جدیدہ عالم پر نقش دوام بن کر ثبت ہو گئے:

وَاللّٰهُ لَوْ دَفَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِيْ وَ الْقَمَرَ فِي شِمَالِيْ عَلٰی اَنْ اَنْتُوْكَ هٰذَا لَمْ

نہ۔ عبد الرحمن عزم۔ لعل الابطال ص ۳۵۔

حَتَّى يُظْهِرَهُ اللَّهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيهِ مَا تَرَكْتَهُ ۖ

ترجمہ: "بخدا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں کہ میں اس ہم کو چھوڑ دوں تو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تا آنکہ خدا مجھے غالب کر دے یا میں خود اس راہ میں شاہد ہو جاؤں۔"

حق کے ساتھ عشق کی کوئی حسین تر مثال نظر آئے گی ؟

دھمکیاں کارگر ہوتی دکھائی نہ دیں تو درام تخریبیں پھیلا یا گیا قریش کی طرف سے عقبہ بن ربیعہؓ آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ ریاست، دولت، زواج ہر حال پھیلانا گیا۔ عقبہ خاموش ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ ابوالولید کہہ چکے ؟ کہا ناں ! فرمایا میری بھی سوا کچھ سورہ جم المسجدہ کی آیات تلاوت فرمائیں، عقبہ واپس گیا تو وہ عقبہ نہ تھا، سرداران قریش سے کہا: میری مانو تو اس شخص کو تنہا چھوڑ دو۔ میں نے جو کلام اُس سے سنا اس کی عجب شان ہو گی۔ اگر عرب غالب آگئے تو تمہارا مطلب پورا ہوا اور اگر وہ غالب آیا تو اُس کا ملک تمہارا ملک ہو گا۔ قریش پکار اٹھے۔ بس عقبہ پر بھی جادو چل گیا۔ کامل عتباری کے ساتھ قریش نے یہ لالچ بھی دیا کہ ایک سال تم لات وعزئی کی عبادت کرو، ایک سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کریں گے۔ سورہ الکافرون کی دو ٹوک آیات اس کا جواب تھیں ۛ

اب مسمانی ایذا کا حربہ آزمایا جاتا ہے۔ جسے صداقت شعار مانتے تھے، اپنی امانتوں

کا نگران بناتے تھے، اُس کے لیے ریت نئے ستم ایجاد کیے جاتے ہیں، آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں، آنکھوں میں دھول ڈالی جاتی ہے، پتھر مارے جاتے ہیں، عقبہ بن ابی معیط آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر یوں بل دیے جاتا ہے کہ آپؐ کا دم گھٹنے کے قریب ہے ابو بکر صدیقؓ موقع پر پہنچتے ہیں اور اُس ناہنجار ستمگاہ سے آپؐ کی گلو خلاصی کراتے ہیں۔ خدا کا نبی حرم میں سر بسجود ہے مشرکین کی ایک ٹوٹی فٹنڈ و تمسخر کا شور برپا کر رہی ہے۔ اُن میں سے ایک شقی اٹھتا ہے اور مذہب و ادب کا اور بھج غلاظت سمیت آپؐ کے اوپر ڈال دیتا ہے۔

آپؐ کے ساتھی بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہیں۔ اُن میں سے وہ جو بے سہارا

ہیں، مستضعفین ہیں ظالموں کا خصوصی تختہ مشق۔ حضرت بلالؓ میں اور امیر بن خلفؓ کا پورا جفا

ۛ جلی: ریت البیاض ص ۲۱-۲۲ ابن ہشام: ۲۹۳ ابن سید الناس: عیون الاثر: ۱۰۵ ابن کثیر: السیرۃ النبویہ (تحقیق: مصطفیٰ عبدالواحد) الجزء الاول القاہرہ، مصطفیٰ بائی انجلی: ۱۳۸/۱۹۴ ص ۵۰۳-۵۰۵، سبکی: سیرۃ النبی ص ۲۲۲ ابن سید الناس: عیون الاثر فی فنون المغازی والشاغل والسیرۃ ص ۱۰۶۔

عرب کی دو پہر آفتاب نصف النہار پر بلائی کی تنگی پشت، کبھی آہنی زمرہوں میں ملعونہ شکار جمع انگارے  
سی بھلستی ریت بیسنے کے اوپر بوجھل تپتے پتھر مگر سینے کے اندر توراہ ایمان۔ زبان پر احمد اسد ابن کثیر کی روایت  
ہے کہ اس حال میں قریش ان مظلوموں سے جو چاہتے کہولتے مگر بلائی کی زبان سے ہر حال میں احمد اسد ہی نکلتا رہا۔

بائبر ابوبکر صدیق نے انھیں ان کے ظالم آقا سے خرید کر آزاد کیا ان کے ہاتھوں میں سلسلے کا یہ ساتواں کارخیز تھا۔

اس سے پہلے انہوں نے عامر بن قیس (شہید بیڑ معونہ)، ام عبیسہ، زینبہ فہدیہ  
اور اُس کی بیٹی اور حضرت عمرؓ جو اُس وقت ایمان نہیں لائے تھے، کی کنیز لبیثہ کو

اسی طرح ان کے آقاؤں کے ستم سے نجات دلانی تھی ۱۵۔ عبداللہ بن جبرعل کے  
آزاد کردہ غلام صہیب بن سنان، صفوان بن امیہ کے غلام ابولکھبہ، جناب بن اللہ

جیسے بے آسرا لوگ، ظالموں کے ظلم کا بدترین تختہ مشق تھے۔ جناب کو دیکھتے کوٹلوں پر  
لٹایا گیا اور سینے پر ایک بدبخت پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا کہ کر دھڑ نہ لے سکیں۔ مدتوں بعد

یہ واقعہ نبیؐ نے حضرت عمرؓ کو سنایا تو پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح  
بالکل سفید تھی ۱۶۔ مگر آل یاسر۔ اسلام کے اولین شہیدوں کے اس خاندان نے جو ستم ہے

اُن کے سُننے کو بھی حوصلہ چاہیے۔ جناب یاسر۔ ان کی اہلیہ سُمیہؓ، اُن کے بیٹے عمارؓ جو غزوہ  
غلامی میں ظلم کے یکساں شکار۔ حضورؐ کا گزر ہوا فرمایا: صَبْرًا یَا آلِ یَاسِرٍ۔ مَوْعِدُکُمْ الْجَنَّةُ ۱۷

پتھر نلک یہ بھی دیکھی ہے کہ عمارؓ کے بائیں پاؤں میں رستی سے ایک اونٹ بندھا ہے، دائیں  
پاؤں میں دوسری رستی جو دوسرے اونٹ کے گھسے سے بندھی ہے، عمارؓ کی بھیٹی اُنکھیں ذہن

میں ایک کرناک موت کا نقشہ مگر دل دریلے ایمان۔ دونوں اونٹ مخالف سمتوں میں  
بانگے جلتے ہیں۔ ایک جسدِ ظاہر دو تخت ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیئہ کے

قلب سے ابوجہل کا نیزہ پار ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے خالق و مالک کے دربار میں جا پہنچتی  
ہیں ۱۸۔ مساکین تو مساکین عثمانؓ، ابوذرؓ، زبیر بن عوامؓ، سعید بن زیدؓ جیسے ذی حیثیت شرفا

بھی اپنے مشرک اکابر کے ظلم سے محفوظ نہ تھے۔

وہ جو رحمت اللعالمین بھی ہے، امت کے لیے مجسم رحمت و ایثار بھی۔ اس کے دلی پرکیانہ  
گزرتی ہوگی۔ آخر اپنے بے سہارا ساتھیوں کو حبشہ روانہ فرماتا ہے ۱۹۔ اُس صاحبِ عزیمت

کی جلالتِ شان یہ ہے کہ جو دست و بازو ہیں انہیں دار لاماں بھیج دیتا ہے اور خود اذیت کی  
۲۰۔ ابن کثیر: السیرۃ النبویہ: ۱: ۴۹۴ھ ابن ہشام: السیرۃ: ۱: ۳۱۸ھ شبلی: سیرت ابنی: ۲۲۹ (بحوالہ

ابن سعد) ۲۱۔ ابن کثیر: سیرۃ: ۱: ۴۹۵ھ ۵۵ھ عام النبوة

حقیقتوں اور موت کے امکانات کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔

نبوت کے ساتویں سال کے آغاز کے ساتھ بنو ہاشم (باستثنائے ابولسب، شعب ابی طالب میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ قریش نے بنی ہاشم کے مقابلہ کا عہد نامہ در کعبہ پر آویزاں کر دیا ہے۔ کامل تین سال شدت مصائب میں گزر رہے ہیں، مگر دس لا الہ الا اللہ دینے والا خطرات کے دریا سے گزر کر بیت اللہ میں حاضر ہوتا ہے اور باؤزہ بلند خدا کا پیغام بندوں کے نام تلاوت فرماتا ہے۔

اعلانِ نبوت کو دسواں سال ہے۔ ابوطالب رخصت ہوئے، پھر سیدہ خدیجہ بنت خویلد بھی دہائی اہل کی پکار پر عین منجد ہار میں اس رفیق کی رفاقت توڑ دی تھے جس کو کلی اڑھا اڑھا کر بار نبوت اٹھانے کی تشفیاں دی تھیں۔ عم نصیر بھی گیا، رفیق وزیر بھی رخصت ہوا۔ مصائب کی آندھیاں طوفان بن گئیں، پر پیغمبر ہے کہ اپنی دھن میں تن من دھن اسی طرح دعوت حق کے راستے میں لٹنے کو تیار۔ ام القریٰ کے دلوں کی کھیتی ہری ہوتی نہیں لگتی تو قبائل کا رخ کرتا ہے۔ ستائش وصلہ سے تو خیر واسطہ ہی کیا، طعن و تشنیع، طنز و تمسخر کے تیروں کی بوچھاڑ خندہ پیشانی سے قبول کرتا، گالی کے بدلے دعائیں دیتا، پتھر کھا کر لہو لہان ہو کر مارنے والوں کے لیے رحمتیں مانگتا چلا جاتا ہے۔ چاروں اور اندھیرا ہے پر اس واقف اسرار حقیقت کو ایک لحظہ کے عشر عشر کے لیے بھی ضعیف سا تردد و شبہ یا شک نہیں ہوتا۔ اُسے یقین ہے کہ یہ لہتی اور اس کے باسی ایک دن انوار حق سے ضرور منور ہوں گے۔ عام الحزن میں بھی محمد کی آنکھیں فتح مبین پر لگی ہیں۔ نجا کریم کے صدق و خلوص اولوالعزمی اور ثبات و استقامت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ مکہ کے تیرہ سالہ تبلیغی دور کا حاصل مشکل سے دوسو نفوس قدسیہ تھے، مگر سخت ترین آزمائش و مصیبت میں بھی آپ کا دل اپنے مشن کے بارے میں ہلکی سی یاوی سے بھی آشنا نہ ہوا۔ اور ماں آپ کے عزم و استقامت کا پر تو یہ بھی تھا کہ ان نفوس قدسیہ میں سے جن کی زبان پہ کلمہ لا الہ الا ایک بار جاری ہوا کسی ایک نے بھی روٹ گئے کھڑے کر دیئے والے مظالم سے گزر کر کبھی کبھی پلٹنے کا نہ سوچا۔ حتیٰ کہ آپ کے ان اہل بیت نے جو بالا اعلان اسلام بھی نہیں لائے سخت ترین مصائب کے اندر بھی کبھی آپ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ اشارہ تک نہ کیا کہ اے بادھبا ایں ہمہ آدرہ تست۔

طائف

یوں تو آپ کی تیرہ سالہ مکی زندگی ابتلاء و امتحان کی ایک مسلسل داستان ہے، مگر سفر طائف

۱۹ ابن ہشام، السیرۃ ۱: ۵۱-۵۴، ۳۷-۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰،

تو ایسے شدید جسمانی اور ذہنی و نفسیاتی صدمات پر منہج ہوا کہ بیٹان سا عزم بھی ان کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ابوطالب اور خدیجہ کی شفقت و محبت سے محرومی کا داغ ابھی تازہ ہے۔ ابولہب کی زیر سیادت بنو ہاشم کا قبائلی تحفظ بھی اب ختم ہو چکا۔ قریش کی ایذا رسانیاں اور پیر وستیوں زور وں پر۔ دس سال کی پُر آشوب کشت کاری کے بعد مکہ کی زمین اب خدا کے بنی کے لئے بخر ہو چکی جس سے کوئی نیا گل بوٹا چھوٹا دکھائی نہیں دیتا، سردارانِ ثقیف کے ایمان لانے کی امید کا پڑغ آپ کو تنہا طائف میں لاتا ہے، مگر دہان کے تینوں رؤساء، عمرو بن عیسر کے سخت پسند بیٹے تجنیز و استہزاء کے ساتھ پیش آتے اور اپنے خرم و حشم کو آپ کی ایذا رسانی پر مامور کرتے ہیں۔ غلاموں، نادانوں کا یہ انہوہ چیختا چنگھاڑنا بدگلائی کرتا آپ کے تعاقب میں ہے۔ راستے کے دونوں طرف بھی اشرار قطار اندر قطار موجود رسولِ خدا کے ہر اٹھتے قدم کا استقبال پتھروں سے کرتے ہیں۔ لہو لہان پاؤں کے ساتھ آپ شہر سے باہر ایک باغ میں پناہ لیتے ہیں، مگر اس حال میں بھی خیر البشر کی زبان سے دشمنوں کے لیے زہر دوا نکلتی، نہ اپنے مالک و مولایا پر ایمان و یقین میں سربو کوئی تزلزل واقع ہوا۔ بنی کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور یہ فریاد زبانی پر جاری ہوتی ہے:

اَللّٰهُمَّ اَلَيْكَ اَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ وَ هَوَانِيْ عَلٰى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّحِمِيْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعِفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ اِلٰى مَنْ تَكِيْفِيْ  
اِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلٰى فُلَا اَبَايَ

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے ہی اپنی طاقت کے ضعیف کا ڈھڑا کستا ہوں، تیرے پاس ہی شکایت کرتا ہوں کہ لوگوں کے لیے میں کوئی چیز نہیں! ارحم الراحمین تو کمزوروں کا وارث، تو میرا بھی مالک و مولایا ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرے گا؟ ہاں اگر تو مجھ پر ناخوش نہیں تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں؟

خدا نے قدوس و کریم نے اپنے بندے کی پکار کو سنا اور فرمایا:

فَاَصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اَدُوُّ الْعَزِيْزِ مِنَ الشَّيْطٰنِ (سورۃ الاحقاف ۴۶: ۳۵)

کئی سال بعد عائشہ صدیقہ نے آپ سے پوچھا کہ آپ پر کوئی دن معرکہ اُمید سے سخت تر بھی آیا؟ آپ نے طائف کے واقعہ کا ذکر فرمایا۔ ۸ھ میں محمد مدنی کا مکہ میں فاشمانہ داغ دلا اپنی مثال نہیں رکھتا۔ مگر ۱۱ سال قبل طائف سے بے نیل و مرام واپسی پر بے یار و مددگار معلم بن عدی کے جوار میں محمد کی ام کا گھر پہنچنا بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس سے بڑھ کر آپ کی صداقت اور اپنے رب پر ناقابل شکست اعتماد کی دلیل کوئی نہیں کہ سفر طائف کے بعد بھی محمد کی کاتبینہی سفر جاری رہا۔



دشمنوں نے ایذا رسائی کا ہر حربہ آزمایا، ابلاغ عامہ کے ماہرین کی طرح کذب و افترا اور تمسخر و استہزا

کے ہنگامے میں آپ کے پیام کو اڑا دینے، دبا دینے کی کوشش بھی کی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذِهِ الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ۝ (۲۶:۴۱)

بے سہارا، مگر وفا کیش ساقیوں پر ظلم توڑ کر بھی رحمتِ عالم کے لیے شدید ذہنی و روحانی کرب کا سامان کیا۔ مگر آپ کے عزم و استقلال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ ابوبکر صدیقؓ وہ مردِ جبریٰ جو دینہ کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظرات کے باوجود اسامہ بن زید کے لشکر کو اہلِ کلمہ کی تعمیل میں شام روانہ کرنے سے نہ ہچکچایا، غارِ ثور کے دمانے پر کھڑی موت کے پاؤں دیکھ کر تشویش میں ڈوب گیا، مگر اس گھڑی محمدؐ کی آوازِ رفیقِ دمساز اور معلمِ دلنواز تھی: لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّادِقِينَ (مکہ کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی تھی، مگر عزم و ہمت کا یہ پہاڑ اگلے روز ہی اپنے زخمی ساتھیوں کے ساتھ دشمنوں کے تعاقب میں تھا۔ معرکہ حنین میں ہزاروں جاں نثار تھے پر ہونہوا زن کے تیروں کی بارش میں سراپا انتشار تھے۔ ایسے میں صرف اَنَا النَّبِيُّ لَا أَكْذِبُ! کی آواز پر ہی ٹوٹی ہستیاں بند رہی تھیں۔

خاتمہ کلام :

میں نے اپنی گزارشات میں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس قصہ پارینہ کی بازخوانی سے مدعا یہ ہے کہ محمد عربیؐ کی غلامی و حلقہ بگوشی پر فخر کرنے والوں میں جہاں بیسیوں سیاسی، ادبی اور پیشہ ورانہ تنظیمیں موجود ہیں وہاں ایک ایسی تحریک بھی اٹھنی چاہیے جس کے علمبردار اور دایانہ اپنے نادمی و مولا کے عزم کی چنگاری سے وہ شمع روشن کریں جو ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں اسوۂ محمدیؐ کا ایحاء کرے اور ملتِ اسلامیہ کے اصل نقص کو اس طرح زندہ کرے کہ لا الہ الا اللہ سہارا شعار ہو۔ اسلام کی بنیادی عبادات کی پابندی ہماری پہچان ہو اور اخلاقِ محمدیؐ کی عاشقانہ تقلید ہمارا طرہ امتیاز ہو حقیقت یہ ہے کہ تمام بنیادی اسلامی عبادات کا مقصد اولین ہی یہی ہے کہ بندہ اپنی ہستی اور ہر شے کو اپنے خالق و مالک کے سامنے تسلیم کر دے۔ اسی بنیاد پر ہر کارام اخلاق کی محکم عمارت اٹھتی ہے، حقیقتِ صلوٰۃ کیا ہے إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (غنا کھلی بدکاری اور دہر، ہلائی سے روکتی ہے) حقیقتِ صوم کیا ہے؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ بَرِئَاطِی حَرَبِہ کے خلاف یہ مومن کی ڈھال ہے۔ حج کیا ہے؟ اپنے رب کی طرف مکمل ہجرت۔ طواف کیا ہے؟ انسان کے قدیم بدوایتی و علامتی انداز میں ریتِ کعبہ پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا اظہار و اقرار۔

ہم اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و نعمت کا فردِ شکر کریں کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا فرمایا، مگر دل و دماغ کی گہرائیوں سے پوری سنجیدگی اور انتہائے خلوص کے ساتھ یہ اعتراف (CONFESSION) بھی کریں کہ ہمارا اسلام بھسی اور اس سے ہماری نسبت محض موروثی ہے، ہمیں ابھی مشکلات کا المیہ کی دہلیز پر قدم رکھنا ہے۔ ایمانی و روحانی معنی میں مشرف بہ اسلام ہونا ہے۔

انفرادی و ملی سطح پر اس عجز و انکسار اور اس عزم و استقلال کے ساتھ ماسجد و مدارس، دفاتر و محکمات، اساتذہ و طلباء، سرمایہ و مزدور، تجارت و حرفت، مرد و زن، بچے، بوڑھے ہر سمت سے بنیادی عبادات کی پابندی اور آوازِ اخلاق پر لبیک کی دعوت بلند ہوئی چاہیے۔ بنیادی عبادات اور پاکیزہ اخلاق سے ہی ملتِ اسلامیہ کا سچا تشخص اُبھرتا ہے۔ اسی اسلحہ کے ساتھ ہی ہم نے پچھلے چار دہائیوں کے عالم میں انسانوں کے دل و دماغ کو تسخیر کیے تھے۔ اور اس کے بغیر کسی اور قوت کے بل پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ اس تحریک کے اجراء کی ذمہ داری ایک سے دوسرے کے شانوں پر ڈالنے سے ہم اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔ ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کا مکلف ہے اور افراد سے مل کر ہی قوم بنتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد سے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس سلسلے میں فوجیوں اور طلبہ و طالبات پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قوم کے اندر یہی طبقہ حریتِ فکر اور قوتِ عمل کا سب سے بڑا مظہر ہوتا ہے اور اکثر بڑوں کی مصالح پسندی اور سودے بازی سے آزاد۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اخلاقِ محمدی کا علم سمجھانے کے لئے سیاسی گروہ بندیوں کو بغیر باد کہہ دیں۔ خود اخلاقِ محمدی کی تصویریں بنیں اور معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے ادا و اعلا طبقہ میں موجود مادہ پرستی، زرخیزی اور اخلاقِ فروشی بددیانتی و فحش نشانی کے خلاف جہاد کریں۔ تشدد، کبر و نخوت اور نیکی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ محمدی رحمت و محبت اور شانِ فقر و انکسار کے ساتھ۔ اسوۂ محمدؐ کی تقلید ہی ہماری زندگی ہے۔

از رسالت در بھماں نکوین ما

از رسالت دینِ مائیں ما

# اخلاقی تعلیمات رسول اکرمؐ

جناب محترم پروفیسر اکرام الرحمن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تاریخ انسانی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ آپ نے صحرائے عرب کی کلیتہً غیر متذبذب اور غیر منظم قوم کو پرچم توحید کے سائے میں تہذیب و تمدن کا ایسا سبق دیا کہ وہ لوگ تبلیغ دلقین کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی اجتماعی زندگی کے لیے ابر رحمت ثابت ہوئے یہی نہیں کہ اُن کو نور ابدی کا صحیح راستہ دکھایا بلکہ اپنے بلند اخلاق اور اوصاف حمیدہ سے لوگوں کے دل مستح کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان رسول کریمؐ کی بعثت سے سو سال کے اندر ہی چین سے لے کر ہسپانیہ تک چھا گئے اور جہاں بھی پہنچے اُن کے ذاتی کردار، جذبہ خلوص و ایثار سے متاثر ہو کر ملحدین حلقہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ مملکت اٹلی و نیشا کے وسیع اور گھنے جنگلات، ملائیشیا کے خوب صورت بحری ساحل، پاکستان کے زرخیز میدان، دریائے دجلہ و فرات کی سرسبز وادیاں، عرب کے نخلستان، دریائے نیل کا آب رواں، البرز کی برفانی چوٹیاں اب بھی عظمت اسلام کی گواہی دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی عظمت، شان و شوکت، اسلامی ممالک کی موجودہ وسعت، ہمارے ان برگزیدہ اسلاف اور دین کے عظیم مبلغین و مجاہدین کے مساعی کی سر ہون منت ہے جنہوں نے حضور نبی کریمؐ کی اخلاقی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر نئے عزم اور دلولے کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے اپنے وطن کو خیر باد کہا اور وطن غیر میں جا کر اسلام کی اشاعت میں اپنی عمریں نثار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج دنیا میں تقریباً تمام ممالک میں اللہ کے نام لیوا موجود ہیں اور ایک اندازے کے مطابق اُن کی مجموعی آبادی ۹۰ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں اخلاقی اقدار کو ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ قوموں نے اس کی بد دولت ترقی کی اعلا منزلوں کو پایا ہے اور جس قوم نے اپنے اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا وہ تنزلی کی جانب بڑھتی رہی اور کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو گئیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد اگر ہم اپنے معاشرے پر طائرانہ نظر ڈالیں تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ ترقی کی طرف مائل ہے یا انحطاط پذیر؟ کیا ہم اپنے نبی کریمؐ کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں یا فراموش کرتے جا رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے خود کے پیدا کیے

ہوتے مسائل میں اتنے الجھ گئے ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ نہیں؟ ان تمام حالات کا تجزیہ کریں تو یہ صاف اور عیاں ہے کہ ہم نے وہ حاصل نہیں کیا جو ہمیں حاصل کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ ہم نے اپنے نبی کریم ﷺ کے اس آفاقی پیغام کو کمر بھلا دیا ہے جو ہمارے دین کا ستون ہے۔ یعنی حضور ﷺ کی اخلاقی تعلیمات۔

اسلام نے دین کے عقائد نہایت سائنٹیفک، مدلل اور موثر طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک ایسا واضح تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند کرتا ہے۔ اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کون سا نمونہ اس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلتا اور ختم کر دینا چاہتا ہے اور کون سا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروردان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہیں اور کیا چیزیں اُسے نشوونما میں مُہم و معاون ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اُس کی نظر میں کیا ہے۔ کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے اور کس طرح اس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اسلام کا مقصد بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، انھیں زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرہ تک ہر شعبہ حیات میں برائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کر دینا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصل، اتنا صریح، اتنا دل نشیں اور عقل عام کے لیے اس قدر قابل فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے اُن کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے۔ اور وہی نمونہ بدترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ ”اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا اور پھر اس کی ہڈی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور ناسرمد ہو گیا وہ جس نے اس کو بدادیا۔“

سورۃ العنکبوت میں خدائے عزوجل فرماتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝١٦  
”کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اُٹا پھر کر ہم نے اسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے“

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و فہم اور علم و عقل کی بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملی صلاح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم و ذہن کو بُرائی کی طرف مائل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو ڈھیل دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو معاشرے کے اندر بہ کثرت مشاہدے میں آتی ہے کہ حرص، طمع، خود غرضی، نشے بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی دوسری بُری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مستغرق ہو سکے اخلاقی حیثیت سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک نفسِ امّارہ، جو انسان کو بُرائی کی طرف اُگسا آتا ہے۔ دوسرا جو انسان کو بُرائی کے خیالِ خواہش، ارادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکنا ہے۔ اور اُس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا ہے۔ تیسرا وہ جو بُرائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے اور دنیا میں سرخرو ہوتا ہے۔ اس قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا ہے۔

قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرائے میں اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اچھے اوصاف، اخلاق و اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بُرائی بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے اور وہ جمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے علمائے دکھادیا کہ وہ بھلائیوں عرف زبان سے کہنے کی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پالی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی۔

## صلاحِ معاشرہ

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کا مقصد صرف صلاحِ افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں جوڑ کر ایک صلاحِ معاشرہ بنانا بھی ہے، کیونکہ نوعِ انسانی کی فلاح اس میں منحصر ہے۔ ایمان، حسنِ عدل، حق و صداقت، صبر و استقامت یہ چار صفات ہیں جن پر نوعِ انسانی کی فلاح کا دار و مدار ہے پہلا ایمان یعنی اس بات پر پورا یقین کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبود اور حاکم مطلق ہے جس کی بندگی و اطاعت کرنی چاہیے اور اللہ کے رسول کی لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی ہمارے اوپر فرض ہے۔ موجودہ زندگی عارضی ہے اس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے ان اعمال کا حساب دینا ہو گا جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں۔ یہ ایمان فلاحِ پانے والے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اول ہے، کیونکہ اس کے علاوہ

دوسری ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو سیرت و اخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہو۔

حسن ایمان کے ساتھ نیک اعمال خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہے۔ تیسری چیز حق گوئی معاشرے کو اخلاقی زوال اور انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ آخر میں صبر ہے۔ یہ لفظ ضبط، تحمل، برداشت، ثابت قدمی، ارادے کی مضبوطی، ہمت اور جرأت کے ساتھ کسی باطل طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔

اخلاقی تعلیم نہ تو نسخہ کیا تھا جس کا کوئی توڑ مشرکین قریش اور کفار عرب کے پاس نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایسی اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض یا مجنون یا ساحر یا کابن دے سکتا ہے۔ دنیا میں بہت سے انبیاء کرام داعیان اور مصلحین تشریف لاتے۔ تقریباً سب نے اخلاقیات کا درس دیا، لیکن یہ دیکھنا ہے کہ انھوں نے اخلاقی واعظوں کا خود کیا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، لیکن اس کے برعکس مگر کا معلم ”اُمّی“ لکار کر کہتا تھا۔

”جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو“

### نمونہ عمل

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ انسانوں کے مجتمع عام میں جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدے میں اُسی طرح نظر آتا تھا۔ اخلاق و عمل کا وہ نکتہ جو دوسروں کو سکھانا تھا وہ خود اُس کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔

چند صحابہ نے اگر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرتؓ کے اخلاق بیان کیجیے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ پھر پڑھنے فرمایا: ”آپؐ کا اخلاق بہتر قرآن ہے۔“ قرآن اخلاقی ہیں اور حضورؐ کی سیرت طیبہ اُس کی عملی تفسیر۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے۔“

اہل بیت المؤمنین میں حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی نے آپؐ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے۔ فرماتی ہیں:

”کہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے بُرائی نہیں

کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرمادیتے تھے: آپؐ نے کبھی کسی سے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے آپؐ نے کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپؐ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں کی۔ حضرت علیؑ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے آغاز نبوت سے آخر عمر تک ۲۳ برس آپؐ کی خدمت اقدس میں موجود رہے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؑ نے اُن سے حضورؐ کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا۔ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا آپؐ حنہ جیس، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی بُرا حکم مُنہ سے نہیں نکالتے تھے۔ عیب جوادر تنگ دل نہ تھے۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چُپ سنا کرتے۔ دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے نہایت فیاض نہایت راست گو نہایت نرم طبع نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعاً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔

حضرت ہند بن ابی بارہ جو گویا آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش کے پُر در رہے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے تھے۔ کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا سنا دل فرماتے اور اُس کو بُرا بھلا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آ جاتا اور حق کی پوری حمایت کرتے، لیکن اپنے ذاتی معاملے پر کبھی آپؐ کو غصہ نہیں آتا تھا اور نہ کسی سے انتقام لیا کرتے تھے۔ آپؐ کے تمام اخلاق و اعمال پختہ و مستحکم تھے۔ کبھی تمام عمر اُن میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا۔ عدل و انصاف سے کام لیتے تھے۔ اکثر یہ معمول تھا کہ گھر میں نقدی چیز موجود ہوتی تو جب تک کُل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے نمایاں تھا اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپؐ کو بے انتہا محبت تھی۔ آپؐ میں قناعت اور مہمان نوازی حد درجہ تک تھی۔ دوست و احباب سے تحفے قبول فرما لیتے تھے بلکہ آپؐ نے اُس کو محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔ کبھی کسی کا احسان گوارہ نہ فرماتے۔ عزم تشدد آپؐ کا وسیلہ خاص تھا۔ قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے۔ مداحی اور تعریف کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔ ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی، تواضع اور خاک ساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ کی نظر میں امیرِ غریب، مسافرِ دُکیر، آقا و غلام سب برابر تھے۔ گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے۔ گھر میں خود جھاڑ دیتے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔ شرم و حیا کو کٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دوسروں کے کام کر دینے میں خوشی محسوس کرتے۔ ابتداء سے

اتہام تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر ہے۔ آپ شجاعت کے ہیکر تھے۔ سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں موکے اور عز و ذات پیش آئے، لیکن پامری اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ راست گفتاری، الفاظ عمدہ، زہد و قناعت، عفو و حلم جیسی صفاتِ حسنہ کے آپ پیکر تھے۔

غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ دشمنوں کے حق میں بھی دُعا ئے خیر کرتے تھے۔ بچوں اور غلاموں پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور حیوانات پر بھی رحم فرماتے تھے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی۔ آپ نہایت رحم دل اور درقین القلب تھے۔ بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تفریق نہ تھی۔ بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے طریقوں پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب سمجھتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ حقوق و فرائض، فضائل اخلاق اور آداب کے سلسلے میں آں حضرت کی جامع تعلیمات موجود ہیں۔ جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، لیکن یہ حضور کی ذات اقدس تھی کہ ان تمام اخلاقی تعلیمات پر جو انھوں نے دیں، خود عمل کر کے دکھایا۔ اسلام کا فلسفہ اخلاقی کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل اور اس کے تہذیب و تمدن کے اصول، کتنے اعلا اور اس کے اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے

اعلا و رفیع ہیں۔ اور یہ سب کچھ نبی ”آقی“ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے ادا ہوا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ اور قوموں کے معلم سمجھنے سے قاصر رہے، معلم ”آقی“ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارنے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔ اور اُس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے قطعی نا آشنا تھی اُسے نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت سے مستقبل میں ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا اُن کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو ابراہیمی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی۔ یعنی ایسا نبی ہو اُن امتیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھارے۔ یہ نکھارنے والا آیا اور



نکھار کر دُنیا کو پُر ہمار بنا گیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم“

ہمیں فخر ہے کہ ہم اس پیکرِ اخلاق پیغمبرِ آخر الزماں سرورِ کونین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہیں جس کی اخلاقی تعلیمات کا چشمہ فیض ہر خاص و عام، ہر دور اور ہر خطے کے لیے ہے۔ ہمارا اصرار ہے کہ حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر نہ صرف خود عمل کریں بلکہ تحریکِ آوازِ اخلاق کو پاکستان کے چپے چپے میں پھیلائیں تاکہ ہمارا معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی معاشرہ بن جائے جو مسلمانوں میں ایثار، اخوت، یگانگت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کا ضامن ہو اور یہ امر پاکستان کی سالمیت و بقا اور عظمت کے لیے ضروری ہے۔

# محکومی اور آزادی

جناب محترم جسٹس (رٹائرڈ) قدیر الدین احمد

## امت محمدی کے لئے سیرت اقدس کا ایک حیرت انگیز رُخ ابتدائیہ

مندرجہ بالا عنوان کو منتخب کرنے کا محرک ایک تو یہ احساس ہوا کہ محکومی سے اور عقیدت سے جو دو قسم کی تابعداریاں پیدا ہوتی ہیں ان کے فرق کو بیان کیا جائے، تاکہ گمراہی عقیدت اور محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں اور کسی حاکم کے حکم کو بجالانے میں جو زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس میں جو تضاد ہے اس طرف اشارہ کیا جاسکے۔ دوسرا محرک آج کل کا یہ عام تاثر ہے کہ جتنا زیادہ فائدہ فلاحی اسلام کا پورا ہوا۔ اتنی ہی کثرت سے پابندیاں بڑھیں گی اور احکام جاری ہوا کریں گے یہاں تک کہ معاشرہ ان میں جکڑ کر رہ جائے گا اور جو تھوڑی بہت خود اعتمادی باقی ہے اس کا سب سے عائدہ ہو جائے گا۔ نیز روایات کے مقابلے میں عقل اور سمجھ کا استعمال باعثِ فہم بن جائے گا۔ اس کے برعکس ہمارا دعوایہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسلام کا صحیح نقشہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلام انسان کو ہر طرح کی غلامی سے پھیلانے کے لیے آیا ہے۔ اس نے ہماری طرح طرح کی قیود کی زنجیروں کو توڑا ہے۔ وحدانیت کا سبق سکھا کر سینکڑوں بتوں، دسیوں ابھارم فلکی اور میسوں جانوروں کی عبادت سے آزادی دلانی ہے۔ قوانینِ فطرت کے وجود کو اچھی طرح بتا کر توہمات کی جڑیں کاٹی ہیں۔ غیب کے علم کو فقط اللہ کا علم بتا کر غیویموں اور پیشین گوئی کرنے والوں سے نہجائت بخشی ہے۔ قسم قسم کے بے معنی اور نقصان دہ رسم و رواج کی پابندی کو غیر ضروری ظاہر کر کے ان سے بچھا پھیلایا ہے۔ باپ دادا کے ان طور طریق سے جو انہوں نے بلا علم اور دلیل اختیار کیے تھے، ہم کو محفوظ کر دیا ہے۔ ظالم حکام کی بے حد براعتیالیوں کے آگے سر جھکا کر ان کی کمزوری قرار دیا ہے۔ ایسے ایسے خود سر علماء اور فضلا کی حکومت سے انسان کی گردن پھیلانے ہے جیسے قدیم دقت کے یہودیوں کے دینی پیشوا ہوا کرتے تھے۔ ایسی تعلیم کی یہ برکت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی امت کی تعمیر کر دی جس میں خود اعتمادی بدرجہ اتم

موجود تھی اور جو علم اور عقل کی قدر و قیمت کو دنیا کی ساری قوموں سے زیادہ جانتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آنحضرتؐ کا زمانہ ایسی تاریخ پیش کرتے ہیں جو جسمانی آزادی سے لے کر ذہنی آزادی تک کی ایک مثالی تاریخ ہے۔ ان مختصر سی سطور میں اس تاریخ کے اسکا رخ کا ایک سرسری سا عکس پیش کرنے کی خواہش ہے۔ واقعات تو سنئے نہیں ہو سکتے۔ لیکن تاریخ کے بہت سے رخ ہو سکتے ہیں۔

## غلاموں کی شہنشاہی

مثلاً ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن اور سنتِ رسول اللہؐ نے غلامی کی زندگی کو آزادی سے زیادہ شیریں بنا دیا تھا۔ دیا تنہا غیر مسلموں کے لیے یہ دیکھنا آسان تھا کہ جب اسلام آیا تو اس نے کس طرح غلاموں کو آقاؤں کے ہم پلہ کر دیا بلکہ سارے کم درجہ کے افتخارات کو سنا کر نیک اور پاک زندگی کو دینی اور دنیاوی مراتب کی بنیاد بنا دیا۔ غلاموں کے ساتھ بدسلوکی کو خدائے لایزال کی نافرمانی کا باعث بنا دیا۔ ہوتے ہوئے غلام اور ان کے خاندان دینے اسلام میں بڑے بڑے سلاطین اور شہنشاہ بنے جس کو دیکھ کر تاریخ عالم اپنی آنکھیں ملتی رہ گئی۔

## شعب ابی طالب

یہ تو ایک ایسا رخ تھا جس کو دوسرے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر چند اور بھی رخ ہیں جن کو حلقہٴ گوشانِ اسلام اور نقابانِ محمدؐ نے اپنے دلوں کی گہرائیوں میں محسوس کیا اور اپنی مرضی سے اختیار کر لی ہوئی جان نثار یوں کو اپنی زندگیوں کے لیے فخر کا سرمایہ سمجھا۔ تاریخ اسلام کے وہ تین سال جن میں سارے مسلمان ایک دادی میں قید ہو کر رہ گئے تھے اکثر مورخین کی آنکھوں سے اس طرح اوجھل ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ بین لمحے تھے۔ مگر شعب ابی طالب جس میں خدائے واحد کے نام لینے والوں کو طویل مدت کی قید ہوئی تھی۔ اس کو ایک کھلا ہوا سا ہٹلر کے بنائے ہوئے کیمپوں کی قسم کا ایک کیمپ سمجھنا چاہیے۔ اس میں کل مسلمان جو ایک مٹھی بھر انسان تھے قید تھے وہ قید ہٹلر کی قید سے زیادہ سخت اس وجہ سے تھی کہ وہاں بجائے کسی کی کھلانے پلانے کی ذمہ داری کے دشمنوں کا مقصد بھوکا پیاسا مارنا تھا۔ بچے بھوک سے بگڑتے تھے اور ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ وہ قیدی پتے کھاتے تھے اور جوتوں کے چمڑے کو پانی میں ابال کر لنگنے پر بھی مجبور ہو گئے تھے۔ رہائی کی واحد شرط یہ تھی کہ اپنے محبوب راہبر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان نثاری کو ترک کر کے انہیں دشمنوں کے سوا لے کر دیا جائے۔

اس شرلو کو پورا کرنے کی ان قیدیوں کو آزادی تھی۔ وہ محکوم بس اپنی ہی عقیدت اور محبت کے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس مصیبت کو جسے انھوں نے چھینس بیٹھیا ایک ہزار دن جھیلنا ایک آن میں مال دیتے۔ ہات بس اتنی تھی کہ اپنی ہی مرضی کی عقیدت مندانہ محکومی کے دائرے سے دو قدم باہر نکل جاتے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ محکومی جسموں کی نہیں بلکہ دلوں کی تھی۔ دل محکوم تھے، گو جسم آزاد تھے یہ مثال ساری امت کے بیک وقت مشترک اس احساس محکومی اور آزادی کی ہے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر کثیر ہو گئی تو پھر ایسی مثال کا ظہور نہیں ہو سکتا تھا۔

### نریدین حارثہ

لیکن اس وقت اس سے پہلے اور اس کے بعد صدیاں مثالیں شخصی محکومی اور آزادی کی ایسی ملتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ سورج میں پڑ جاتا ہے کہ کیا غلامی کی عجز و عشق و محبت کی مجسوری کے آگے ایک کھیل ہوتی ہیں۔ کھیل اس طرح کہ جب انسان مجبور ہو تو اسے ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ کسی دن آزاد ہو جانے کی امید بھی کر سکتا ہے۔ مگر جب اسے اختیار ہو کہ اپنی مرضی سے آزاد ہو جائے لیکن وہ پھر بھی غلامی ہی کو ترجیح دے تو اس آزاد محکومی سے رہائی نہیں مل سکتی۔ حضرت زید بن حارثہؓ کا قصہ سنئے کہ اُن کے ماں باپ جس تعلقے میں تھے وہ لٹ گیا۔ اس وقت یہ بچے تھے، اُن کو لوٹنے والوں نے لے جا کر فروخت کر دیا۔ خریدار سے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ نے خریدا پھر اپنی تجارت کے ایجنٹ محمد بن عبداللہؓ کو بطور تحفہ دے دیا۔ اس غلام کے دلفزاق میں سرگرداں پھرتے رہے اور رد و رو کر ان کا دل آب ہوتا رہا۔ آخر کار ایک مدت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا غلامی میں ہے۔ چنانچہ وہ اس کے آقا کے پاس پہنچے اور محبت پوری کا واسطہ دیکر بیٹے کی رفاقت طلب کی۔ اُس زمانے میں کوئی اپنا غلام کب کسی کو مفت میں دیتا تھا۔ غلام کا باپ ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان حالات میں یہ درخواست بے معنی تھی۔ مگر رسول خداؐ نے ایک باپ کی خواہش کو قبول فرمایا۔ البتہ شرط یہ لگائی کہ زید کے ساتھ زبردستی نہیں ہوگی بلکہ جو اُن کی خواہش ہوگی وہی کیا جائے گا۔ باپ کو امید ہوئی ہوگی کہ بیٹے کی غلامی کا وقت ختم ہوا اور اب وہ باپ کی شفقت سے فیضیاب ہوگا۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ اُن کے بیٹے کی محکومی اس کی آزادی سے زیادہ لطیف اور پُر ہمار ہے۔ وہ حضور رسالتؐ کی قربت کو کب ترک کرنے والا ہے۔ اُس نے کہا کہ اُس کے آقا کا فراق اس کے لیے قابل برداشت نہیں ہے اور زبانِ حالی سے جتا دیا کہ:

صد جان فدائیت کہ دم دامنیت از دست  
دشوار بدست آمد و آساں نہ فروشم  
باپ جب خالی ماتھ لوٹے ہوں گے تو رسول اللہ کی غلامی سے شفقتِ پدری کا مقابلہ  
کر کے دل میں یا تو نام اور یا بہت ہی خوش ہوئے ہوں گے۔

### چاہرہ جاں نثار

یہ واقعہ تو ایک فرد کے آزادی کو قبول کرنے سے انکار کا تھا۔ انھوں نے اپنے باپ  
کے آغوش کی آزادی کو رسول خدا کی غلامی پر قربان کر دیا۔ اب ایک دو واقعات ایک ایسی  
جاں نثاری کے ملا خطہ کیجیے کہ جن کی فائیت سوائے نبی اسلام کی ذات اور ان کے دین پر قربان  
ہو جانے کے اور کچھ نہ تھی۔ وہ محکومی ایمان کی اور عشق رسول کی تھی جس میں کسی قسم کی دنیاوی  
پابندی کا نام تک نہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ لائیے جب جنگِ احد میں گھسان کا  
رن تھا۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ محکوم محبوب خدا شہید ہو گئے۔ نتیجہ میں ہر طرف سراسیمگی چھا گئی تھی  
اور بے ترتیبی برپا ہو گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں شہر رہ گیا تھا، مگر تھوڑی دیر میں کسی نے  
آنحضرت کو پہچان کر آواز دی کہ وہ حیات ہیں۔ اس خبر سے جہاں مسلمانوں کے دل بڑھے وہاں  
قریش نے بھی ان کو دیکھ کر انہی پر ہلہ بول دیا اور ہر طرف سے ایک ہی مرکز پر وار ہونے لگے۔ یہ  
دھواں اس قدر شدید تھا کہ شمعِ نبوت کے گلے ہو جانے کا خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اس وقت آنحضرت  
نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو عین اُس مقام سے مطلع کریں جہاں آپ گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت  
ان کی طرف جانا ہی جان دینے کے برابر تھا۔ چنانچہ آنحضرت نے للکار کر فرمایا :

”کون مجھ پر جان دیتا ہے!“

یہ سن کر زیاد بن سکن پانچ الفارے کر جاں نثاری کے لیے بڑھے ان میں سے ایک ایک نے  
داد شجاعت دیکھ کر جان فدا کر دی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں :

”حضرت زیاد کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت نے اسی کیفیت میں حکم دیا  
کہ ان کا لاشہ (میرے) قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے اس وقت ان میں کچھ  
جانی باقی تھی۔ (انہوں نے حضور کے قدموں پر اپنا منہ رکھ دیا اور اسی  
محاکات میں جان دی۔“

بچہ ناز رشتہ باشد ز جہاں نیاز مندے

کہ بوقت جاں سپردن لبش رسیدہ باشی

پروانہ شمع

سنگِ طمٹم ہو گئی آنحضرت مجروح ہوئے مگر حیات تھے لیکن مدینہ میں ان کے دصال کی خبریں پھیل گئی تھیں اس لیے مدینہ والے بیتاب تھے کہ آنحضرت کی خیریت معلوم ہو جائے۔ انصار میں ایک خاتون تھیں بن کا نام عقیفہ تھا۔ ان کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں شہید ہو گئے تھے وہ بھی حضور کی خیریت معلوم کرنے شہر سے باہر آئی تھیں۔ لوگ بار بار باری ان کے ایک ایک رشتہ دار کی موت کا حال سناتے تھے مگر وہ ہر خبر کے بعد پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ کیسے ہیں لوگ کہتے کہ وہ بخیر ہیں۔ یہ سن کر شکر ادا کرتیں۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتی جاتیں۔ بالآخر انہی آنکھوں سے چہرہ مبارک دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھیں :

”تو ہے تو سب مصیبتیں پرچ ہیں“

یہ حال سننے والے بتائیں کہ یہ محکومی تھی یا آزادی؟ میں کہوں گا کہ ہاں یہ آزادی تھی، جسم کی، جان کی، وسعت دنیا میں اپنے ارادوں کی۔ مگر محکومی تھی دل کی، شعور کی، ایمان کی، ضمیر کی اور عشق پاک کی۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ :

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ملبرانِ عالم کے محبوب

ایک خاتون پرہیز کیا منہر ہے۔ جو بھی مسلمان تھا وہ آنحضرت کے نور کا پروانہ تھا۔ ہر مرد اور عورت کا دل چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تعلیم کرے۔ اور احکام بجالائے۔ بڑے بڑے رتبے والے بلکہ ملبرانِ عالم میں شمار ہونے والے بزرگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا جب ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اپنا زیادہ سے زیادہ مال و متاع ان کے قدموں پر شاہ کرنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں بس انہی کے دونوں کو یہ راز معلوم تھا کہ وہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر بھانپنے والے ایسے رازوں سے کب بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مالی حاکم کرنے میں برائے صاحبان میں محبت کی کشمکش ہوئی وہ استاد مشہور ہے کہ اقبالی نے اس کو نہایت سلیقہ اور پراثر انداز میں نظم کی ہے :

علمِ صالح سے ذلی لگاؤ اور بادۂ محبت و عقیدت کی سرشاری کا بولنقشہ شاعر نے سادہ الفاظ میں کھینچا ہے وہ کلامِ عارفانہ کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ انظم شروع ہی اس طرح کرتے ہیں کہ :

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا      دینِ مالِ راجوت میں جو ہوں تم میں مالدار  
ارشادِ سن کے فرطِ طرب سے عمر اُٹھے      اُس روزان کے پاس تھے درہم کئی ہزار  
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ حدیثی سے فرور      بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار  
جب وہ مال پیش کر چکے تو مقدار کو دیکھ کر حضورؐ سرورِ عالم نے پوچھا کہ اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ رکھا ہے :

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق  
باقی جو ہے وہ ملکتِ بیضا پر ہے نثار  
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا      جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار  
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت      ہر چیز جس سے پیٹیم جہاں میں ہوا غنبار  
جب سرورِ کائناتؐ نے ان سے دریافت کیا کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا ہے تو جواب دیا کہ :

پروانے کو چراغ ہے بلب کو پھول بس  
حدیثی کے لیے ہے خدا کا رسول بس  
یہ ہے وہ محکومی جس کی لطافتِ صمراؤں کی آواز دہواؤں سے زیادہ لطیف اور خوشبو کی پھیلنے والی لپٹوں سے زیادہ معطر کرنے والی ہے اس درد مندانہ محکومی کے آگے بے مقصد آزادی کا غرور کیا چیز ہے اُس پھیکے آزادی سے کوئی پوچھے کہ :

بہ ہمانِ درد مندال تو بگو چہ کارِ داری  
تب و تابِ عاشقِ دل بے قرار داری  
امتِ مسلمہ کے دل کی اُمنگ

حکمِ برداری کے طور پر اور محبت کی تسکین کے واسطے جانِ نثار کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ سب سے بڑا حاکم وہ ہے جو آرزوؤں پر حکومت کرے اور دلوں کا مالک بن جائے جو عزت اور تعلیم اور دلدار اس کی ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے حاکم یا ظالم شہنشاہ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ رسولِ خداؐ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے اصحاب کے ساتھ بلا لحاظِ مرتبہ نبھاؤ کرتے تھے۔ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپؐ کے ساتھی تعلیم کے لیے کھڑے ہوا کریں۔ ہمیشہ نچی آواز اور نرم لہجے میں خطاب فرماتے تھے۔

سے ادنیٰ کو خندہ پیشانی سے معاف کر دیا کرتے تھے۔ مگر جتنے مسلمان تھے وہ ان کے علم کے پروانے تھے۔ جن لوگوں نے مسلمانین اور شہنشاہوں کے دربار دیکھے تھے وہ وہاں خوف کی اور یہاں محبت کی حکمرانی کے فرق کو جانچ لیتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معاہدہ حدیبیہ سے پہلے جب مسلمان کمزور تھے اور صلح کی پیشکش کی گئی تھی تو قریش کا سفیر عروہ بن مسعود ثقفی حالات دیکھنے کے لیے آیا اور رسول اللہؐ کے گفتگو کرنے کے بعد واپس جا کر رپورٹ دی۔ اس میں مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور ان کے قائد کے متعلق بھی رائے زنی کی اُس نے جو کیفیت بیان کی وہ مولانا شبلی کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں :

”عروہ نے رسول اللہؐ کے ساتھ صحابہؓ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اُس نے اُس کے دل پر عجب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہنا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور نباشی کے دشمنوں کے دربار دیکھے ہیں، مگر یہ عقیدت اور دار فکلی کہیں نہیں دیکھی۔ محمدؐ بات کرتے ہیں تو سناٹا پھٹا جاتا ہے۔ کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اُس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور وہ اپنے مومنہ کا لعاب تھوکتے ہیں تو عقیدت کیش کا تھوون ہاتھ لے کر چہروں اور ہاتھوں پر مل بیٹے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ عروہؓ جس کا کام عظیم الشان درباروں میں سفارت کرنا تھا، اُن درباروں میں یہ منظر کیونکر دیکھتا! وہاں تو کُرد و فرخے۔ پتھاروں سے لہرے ہوئے اور سچائی جو بند سپاہی تھے جو آٹا خانہ میں ہر بے ادب کو سزا دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اُس کے مقابلے میں یہاں کا دربار سادہ اور یہاں کے درباری ادب بلکہ تہذیب و تعظیم کے دائرے سے آگے بڑھ کر عقیدت مندی کی قدم بوسی کو اپنی عزت اور اپنے لیے راحت سمجھتے تھے۔ یہ وہ محکومی تھی جس کا قصیدہ اگر خود آزادی لکھے تو بعید نہیں۔

### دل سے پُر اعتراض کی اجمانت

اس محکومی، عقیدت مندی اور وارفتگی کی ایک خاص صفت اور بھی تھی جس کو اس بے مثل قائد کی تعلیم و تربیت کی بندنیاں اور اعلاہمتی کا معجزہ کہنا چاہیے۔ وہ صفت یہ تھی کہ یہ دار فکاکان محبت اور عقیدت، اپنی جان، اپنا مال، اپنا دل اور اپنا ایمان تو اپنے قائد اور اس قائد کے مالک کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ مگر نہ اس رسولؐ نے اور نہ اس کے اللہ نے ان کی عقلوں کو خرید لیا تھا۔ خدا نے قدوس نے بار بار عقل استعمال کرنے اور علم حاصل کرنے کی تاکید اُسی رسولؐ کے ذریعہ سے اپنے کلام پاک میں کی ہے۔ سوچئے، سمجھئے، اپنے کان اور اپنی آنکھوں کو استعمال کرنے کی اس قدر سخت تاکید کی ہے کہ اس سے زیادہ شدت ممکن نہیں ہے۔ سورہ اعراف (معرہ) آیت نمبر ۱۷۹ میں ارشاد



ہے کہ ۱

اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔  
اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔  
اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔  
وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔  
یہ وہ لوگ ہیں جو عفتل میں کھو گئے ہیں۔

میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی حتمی تاکید کی ہو۔ اس تعلیم و تلقین کا اثر یہ تھا کہ پیغمبر خدا نے جہاں احکام خدا کی اطاعت سکھائی وہاں مسلمانوں میں یہ برائت بھی پیدا کی کہ جب محمد بطور ایک بندہ خدا کے کسی دنیاوی معاملے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تو مسلمان بھی بطور بندگان خدا کے اس سے اختلاف کر سکیں۔ ایسے متعدد مواقع پر صحابہؓ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قبول بھی فرمایا ہے۔ اس بیان کی وضاحت طویل ہو سکتی ہے مگر اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جیسے آپ صاحبانِ حرور پہلے سے جانتے ہوں گے۔ مگر واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے اس کا اعادہ بے جا نہ ہوگا۔

ہوا یہ کہ جنگ خندق جاری تھی اور مسلمان ایک ماہ سے محاصرے میں تھے۔ کھانے پینے کے سامان اور ہر قسم کی ضروریات پر دشمنوں نے کڑی پابندی لگا دی تھی۔ سب پر کئی کئی وقت کے غارت گزر رہے تھے اچھے اچھے مسلمان دشمنوں کی فوج کے دل بادل کو دیکھ کر پریشان نظر آ رہے تھے کراہی حالت میں غنیم کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی کہ مدینہ کی سالانہ پیداوار حملہ آوروں کو دنیا منظور ہو تو محاصرہ اٹھا لیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ حالات کو دیکھ کر تشویش محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ آپ نبیمؐ آمادہ تھے کہ ایک تہائی پیداوار دینے کی شرط پر صلح کر لی جائے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو جو رسائے انصار تھے بلا کر مشورہ فرمایا۔ تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ تجویز اللہ کے حکم سے ہے یا آپؐ کی ذاتی رائے ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ یہ سُن کر ان مشیروں نے اُسے نام منظور کر دیا۔ آنحضرتؐ نے اُنہی کی رائے پر عمل فرمایا اور خدا سے عز و جل نے مسلمانوں کو فتح سے سرفراز فرمایا۔

## مقصدِ اعلا کے لیے خلوت

آنحضرت کے مشیر دل کا یہ سوال قابلِ غور ہے کہ ایک تاملی پیداوار دیکھ کر صلح کرنے کی تجویز خدا کے حکم سے لگتی یا حضور اقدس کی ذاتی رائے ہے۔ اس سوال میں بڑی گہرائی تھی۔ اور جواب سن کر اس رائے کو اختیار نہ کرنے کا دواغلاس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سب سے پہلے تو سیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو محبت و عقیدت اور فادہ رشتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر امتی اپنے رہبر اور محسنِ اعظم کی جان تو جان ان کی برائے اور ایک آواز پر فدا ہو جانے کے لیے تیار رہتا اور دوسری طرف ان کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ آنحضرت کی کوئی ذاتی تجویز جو خاص دنیاوی معاملات سے متعلق ہو تو اس کو قبول کرنا لازمی امر نہیں۔ یہ ہر امت کی آنحضرت کی مرضی کے پیدا سنیں ہو سکتی تھی۔ ذرا تصور فرمائیے کہ وہ کیا تعلیم و تربیت ہوگی جس نے آنحضرت کی ذات اور رسالت کے نازک فرق کا اسقدر صاف نقشہ ان حاسنان کے ذہن میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہ بھی خیال میں رکھیے کہ اُس معلمِ اعلا کی شخصیت کس قدر بلند ہوگی جو اپنی رائے کے بعد دوسری رائے کو اختیار کرنے کی جسارت پیدا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی عظمت ان کے دلوں میں ذرہ برابر نہیں گھسکتی تھی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی عمومی تاکید کی ہو۔ میرے دل سے پوچھیے تو یہ تعلیم ایک مردہ قوم میں ہمت اور خود داری کی جان ڈالنے کے برابر تھی۔

تصور اساغور کرنے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت کی عظمت ان کے دلوں میں کیسے گھٹی جب کہ ساری امت کو یقین کامل تھا کہ آنحضرت کا مقصد ان کے ذہنوں کو غیر اللہ کی پابندیوں سے آزاد کرنا ان میں خود اعتمادی کی تعمیر کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے حضور ان کے اردوں کو قوی کرنا ان میں حق کی خاطر ہر امت اختلاف کو پیدا کرنا اور اپنی تعلیم و تکویم کو حدود کے اندر سمیٹ دینا چاہتے تھے ان کی عزت اور عظمت، عقیدت اور حکم برداری کی جو کیفیت تھی اس کو حدود کے اندر رکھنا بڑا دشوار امر ملتا تھا۔ اگر آنحضرت اس خصوص میں ذرا بھی دھکیل دیتے تو ان کے بعد کے معتقد اور جہاں شار ان کو ان نیت کے درجے سے اٹھا کر دیرینہ خداوندی میں پہنچا دیتے یہ سب ان ہی کی حیرت انگیز دُور بینی کا نتیجہ ہے کہ اپنی ذاتی اطاعت کو گھما کر عمل کی آزادی کے موقعے دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی امت آج کی ساری اور قوموں کی نسبت شرک سے دُور ہے۔

## ایک سجدہ

حضور رسالتؐ کے نزدیک ہر وہ چیز جو شانِ خداوندی میں کہیں دُور سے بھی شرکت کا وہم پیدا کر دے قطعی نامردا تھی۔ اس بارے میں مولانا حالی کی مسدس کا مندرجہ ذیل ایک بند ہمیشہ

دہرائے کے قابل ہے گا۔ میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو میرے دل میں آنحضرت کی غفلت کے احساس کی ایک نئی رو پیدا ہوتی ہے۔ یہ بند شاعرانہ تخیل کا شاہکار نہیں ہے بلکہ اس کا ہر ایک مصرعہ رسالت مآب کے ایک قول کا ردال ترجمہ ہے۔ ذرا غصہ کیجیے کہ آنحضرت کا ارشاد کیا تھا۔ ارشاد تھا کہ:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم  
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بیچارگی میں برابر میں ہم تم  
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی  
کہ بندہ ہوں اُس کا اور اطاعت بھی

وحدانیت کی یہ تعلیم بس ایک ہستی کی بندگی کی اجازت دیتی ہے اور وہ ہستی خدائے لایزال ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانا یا کسی اور سے خیر و شر کا واسطہ قائم کرنا خلاف حکم الہی ہے۔ جو دل اس ایک حضور ہی میں جھک گیا وہ کسی اور سے نہ لاپنج رکھ سکتا ہے اور نہ معروب ہوتا ہے۔ یہ ایک غلامی ایسی ہے جو اس میں داخل ہو کر حلقہ بگوش ہو گیا وہ دنیا کے سارے سر بلندوں کے سامنے سرفراز ہو گیا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ایک ہی حضور میں سجدہ کرے اور دنیا بھر سے بندگی کا رشتہ توڑ دے۔ لیکن یہ ثابت قدمی آسان نہیں کیونکہ بہت سے اہل اقتدار اور بہت سے محکوموں پر یہ خانقار گزرتی ہے۔ کسی اور سے تو میں کچھ کہنے کے قابل نہیں، اپنے ہی دل سے کہتا ہوں کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے  
ہزارہ سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو بجات

## ذہن کی لامحدودیت

نعمت کے دینے والوں، طاقت کے شکنجے میں کسے والوں اور کرم وافر سے لرزادینے والوں کی پیدا کی ہوئی لاپنج اور ان کے پھسکا ہوئے خوف سے دل کو یہ سجدہ جو تحفظ دیتا ہے وہ تو انسان آنکھوں کیسے بھی دیکھ سکتا ہے۔ مگر وحدانیت میں اعتقاد سے ذہن کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اور اس سے کائنات کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی شخصیت کو بدل دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں اُس کا رشتہ ماہ و انجم سے استوار ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک ایسی قوتِ ناظمہ کا احساس ہو جاتا ہے جو اس کے روحانی وجود کو اس کرہ ارض سے باہر لے جاتا ہے۔ وہ اپنی ساخت اور کائنات کی ساخت میں یگانگت کا تصور کرنے لگتا ہے اور فطرت سے ہم آہنگی کا سامان دیکھتا ہے۔ اس وحدت کے خیالات، احساسات اور تصورات ارضی حوادث کو یک لخت سیکڑ کر حقیقہ کر دیتے ہیں اور انسان کے آگے اختیار اور انتخاب

کی دراز اور وسیع راہیں کھل جاتی ہیں۔ ارتقاء حیات کا وہ منظر سامنے آتا ہے کہ جب زندگی مادہ سے بلند ہو کر روحانی مدارج میں داخل ہوتی ہے۔ یہ منظر جتنا ہے کہ انسان بلند ہو کر حقیقتِ کلی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کے ذہن اور آرزوؤں میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جس مرتبہ کا انسان ہوتا ہے اسی درجے کی تبدیلی کا اُس کو تجربہ ہوتا ہے۔ رسولِ خدا کی معراج کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ مگر اقبال نے عبید خیالات اور رجحانات کے مطابق اس کی جو شرح کی ہے وہ ہر مسلمان کو مناسبت ارفع اور پُر تکلیف آزادی کی بشارت دیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھ

کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس شعر کے روحانی اور طبعیاتی مضمرات کے مد نظر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس کو یک لگوں اس آیت کریمہ کی شرح تصور کر لیا جائے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے :

اَلَمْ تَشْرَوْا اَنْتَ اللّٰهُ مَسْخَرَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلٰیكُمْ فِعْمَهُ ظَاہِرًا وَّ بَاطِنًا ط (سورہ لقمان ۲۰۱۳)

ترجمہ : کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

اس خوشخبری کے بعد کیا شک ہے کہ دینِ اسلام کی محکومی وہ شے ہے جس کی ہر کاب زمین اور آسمان کی حکومت ہے۔ اسلامی زندگی احکام اور پابندیوں کا پلندہ نہیں ہے۔ وہ محکومی اور مجبوری اور دنیاوی طاقتوں کی غلامی نہیں ہے۔ عیسائیت کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ دینی پیشواؤں کی حکومت بھی ایک قسم کی دنیاوی سلطنت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس سے بھی آزادی دی ہے۔ سچی اسلامی زندگی وہ ہے جس میں مسلمانوں کو تسخیرِ کائنات کے وسائل پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوں۔ فکر اور عمل کی یہ بہت اور یہ آزادی انسانیت کے لیے اسلام کا خاص تحفہ ہے۔

لا تَقْتَضِ طُورُ كُلِّ یَوْمٍ حَوْفِی شَانِ میں خدا کی خصوصی رحمت امتِ محمدی کے لیے ہے۔ جس زندگی میں یہ نہیں وہ بجھے ہوئے دلوں کی محفل اور خاموش چراغوں کی رات ہے۔ ایسی دُنیا اسلام کی دُنیا نہیں ہو سکتی۔ اسلامی کائنات وہ ہے جس میں :

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سمے جاتے ہیں

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارِ امیرِ کامل نہ بن جائے

## اخلاق نبویؐ کی روشنی میں

# اسلام کا سیاسی مزاج

جناب محترم الیس۔ ایم۔ ظفر

عنوان کی ترتیب عمدہ ہے؛ یعنی اخلاقِ نبویؐ کا مزاج اسلام کا۔ اسی ترتیب سے آج یہاں سیاست کے موضوع پر گفتگو ہوگی۔ سیاست سے مراد ایک ماڈرن مملکت کی بھرپور سیاست ہے جس میں قائد کی صلاحیت، عوام کی تربیت، جماعت کی تشکیل، شہر کی کا نظام اور جمہوریت وغیرہ شامل ہے۔

ابن خلدون نے سیاست کی تعریف یوں کی تھی۔ سیاست وہ قانونی حکمتِ عملی ہے جس کی قوت سے اجتماعی کردار اور مصالحِ عامہ کا تحفظ کیا جاتا ہے اور حکومت کا نظم چلایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں جس طرح یہ بہت بڑا موضوع ہے اسی طرح یہ اتنی ہی بڑی اہمیت بھی رکھتا ہے اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر قدرے تفصیل ہی سے گفتگو ہونی چاہیے:

میرے نزدیک رسولِ مقبولؐ کا اسوہٴ حسنہ قبل از نبوت بھی سیاسی معاملات میں ہمارے رہنمائی کرتا ہے اس لیے میں نے اس وقت ہی سے جب آپؐ نے رسالت و نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اظہار کیا تھا، ایسے واقعات اور حالات کا انتخاب کیا ہے جن سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا سیاسی مزاج کیا ہے۔

یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ واقعات کی ترتیب اور ان کا انتخاب ممکن ہے تاہم یہ وارہ نہ ہو لیکن ایک ماڈرن مملکت کا سیاسی ڈھانچہ نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے ایسے واقعات ضرور ترتیب پاگئے ہیں جن کا مملکت کے مختلف شعبوں سے تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے یہ احساس بھی پیدا ہو کہ واقعات میں تسلسل نہیں لیکن جب آپؐ واقعات کے نتائج کو کیجا کر کے دیکھیں گے تو ہمارے سامنے ایک مربوط اور مکمل شکلِ نظامِ حکومت اور سیاسی مزاج کی یقیناً آجائے گی۔

یہ کوشش ایک طرح سے تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تحقیق کے نتیجے میں جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے سنی ضرورت اخلاق نبوی (سنت رسول) کی روشنی میں سیاست کو پیش آتی ہے زندگی نے دوسرے شعبوں میں شاید یہی کسی اور شعبے کو پیش آئے

## نزول وحی

موضوع زیر بحث کے سلسلے میں سب سے پہلے وہ موقع اور وہ بات آتی ہے جو سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت کہی جب رسول مقبولؐ پہلی نزول وحی کے بعد اضطراب کی حالت میں گھر پہنچے تھے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت جو باتیں آپؐ سے کہیں ان کی حیثیت اور اہمیت یوں وقعت پاجاتی ہے کہ خود رسول مقبولؐ اس وقت پریشان تھے اور یہ فیصلہ نہ کر پا رہے تھے کہ اس واقعے کی اصلیت کیا ہے؟ آپؐ نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا تھا اور اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا۔ میں اسے اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہوئے اس میں سے حرف انہی باتوں کو منتخب کر کے پیش کر رہا ہوں جن کا تعلق سیاست کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس موقع پر یہ عرض کیا تھا کہ آپؐ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پھر عرض کیا ہمیشہ سے سچی بات کہنا آپؐ کا شیوہ ہے۔ پھر عرض کیا آپؐ حق و صداقت کی راہ میں مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نتیجہ اخذ کرنے کے انداز میں سیدہ خدیجہؓ نے اس طرف عرض کیا کہ لہذا جو کچھ آپؐ نے دیکھا اور سنا ہے وہ آپؐ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوگا۔

## سیاست و قیادت

اگر غور کیا جائے تو اس گفتگو میں اسلامی سیاست کے قائدین کے اوصاف اور ان کے خصائص بیان کیے گئے اور ایک طرح سے اس سے اسلامی ریاست کا منشور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ قائدین کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غریبوں، محتاجوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اجتماعی زندگی میں جب انہیں اثر و اقتدار ملے تو ایسا نظام ان میں جس سے جلدی و خوت و انفلاس کا خاتمہ ہو سکے، سوشل و لیبر ریاست کی بنیاد یہاں سے ہی مل جاتی ہے۔

دوسری صفت جو ایک قائد میں تلاش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صادق اور امین ہو، یعنی جو بات کہے سچ کہے۔ سچ کہنا، سچ بولنا اس کا شیوہ ہو بلکہ اس کی عادت میں داخل ہو جیسا کہ عاری جد و جہد آزادی اور تحریک پاکستان کی تاریخ میں قائد اعظم محمد علی جناح کا نام ایک روشن مثال ہے۔ لوگ کہتے ہیں قائد اعظم نہ صرف سچے تھے بلکہ عادتاً سچے تھے جیسے انگریزی میں INTELECTUALLY HONEST کہتے ہیں۔ یعنی قیادت ایسی ہونی چاہیے کہ اس پر عوام کا یقین و اعتماد ہو۔ اور یہ کہ

ابتدائی سے اس کا کریڈٹ درست ہو۔ CREDIBILITY کی شرط ایک اچھی اور صحیح قیادت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حقوق کے تحفظ اور اس کے حصول کے لیے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی بنیادی ضرورت کا ذکر ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق کی بات کرنے والے بے باک غلصہ اور اثبات پرورد ہونے چاہئیں۔ یعنی لانگ مارچ اور مسلسل کوشش کے بعد ہی معاشرے کے درست ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔

## اعلانِ نبوت

میرے نزدیک دوسرا اہم واقعہ نبوت کا اعلان ہے جب آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو پکارا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے اور موقع پا کر چاہتا ہے کہ تم پر حملہ کرے تو کیا تم میری بات مان لو گے۔ اہل مکہ نے یک زبان ہو کر کہا: آپؐ امین ہیں ہم نے آج تک آپؐ کی زبان سے کوئی بات غلط نہیں سنی اس لیے آپؐ جو کچھ کہیں گے ہم اس کو سچ مانیں گے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی آپؐ حضرت خدیجہؓ کی زبان سے یہی بات سن چکے تھے تاہم وہ اپنے ٹھکانے کی بات تھی۔ قیادت کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پر اعتماد کا اعلان عوام بھی کرتے۔ کیونکہ قیادت کا مقصد عوام کی رہنمائی کرنا ہے۔ اگر ابتدائی میں قیادت پر عوام کا اعتبار قائم نہ ہو تو پھر قیادت بے کار ثابت ہوتی ہے۔

## صفاتِ قیادت

ہمارے ملک کی سیاست میں بد قسمتی سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے کہ قیادت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی ہیں ایسے قائد تو ضرور ملتے رہے جو سیاسی تدبیر اور فہم و فراست کی دولت سے مالا مال تھے، مگر انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کچھ ایسے انداز سے کیا کہ اس پر عوام اعتماد نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے کام بھی انجام نہ پاسکے جن کی عوام کو قائد سے توقع تھی۔

جب اسلام جیسی قوت اور تحریک کو بھی عوام تک پہنچانے کے لیے یہ لازم ہوا کہ اس کے قائد کی ذات ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو تو اسلامی سیاست کے بنیادی اصولوں میں یہ پہلا اصول از خود طے پا جاتا ہے کہ اس کا قائد قول و فعل کے تضاد سے بالکل پاک ہو۔

اسلامی سیاست اس بات کی اعانت نہیں دیتی کہ اس کے لیڈر یونہی نعروں پر عوام کو خوش کر کے اپنا مطلب نکالیں بلکہ جو کچھ کہیں وہ کر کے دکھائیں۔ اس طرح اسلام نے قیادت کے لیے عمل کی بہت کڑی شرط عائد کر دی ہے۔

اسلام اس قول کو تسلیم نہیں کرتا کہ محبت اور جنگ میں ہر شے جائز ہے۔ بلکہ مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے یہ لازم کر دیا ہے کہ سیاسی میدان میں بھی حق و صداقت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیں اور صداقت کی تائید اور تصدیق سارے عوام سے حاصل کی جائے اور یہ مافی ہوتی بات ہے کہ حق و صداقت اور سچائی کا اثر اذہان پر خود بخود مرتب ہوتا ہے اور عوام سچے قائد کو پہچان سکتے ہیں۔ مختصراً اس واقعے سے یہ دو بڑی باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ قیادت پاک صاف اور بے باک ہو، اس میں کوئی نقصان نہ ہو دوسرے یہ کہ قیادت کے لیے عوام کی تائید براہ راست حاصل کی جائے جیسا کہ پورے ملے والوں کو دعوت دی گئی کہ تم بتاؤ۔ کسی مختصر سی محفل یا اپنی طرف سے بلائے گئے لوگوں سے تائید حاصل نہیں کی گئی تھی۔

## قائد اور عوام

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قیادت کے لیے قائد اور عوام کے درمیان کوئی واسطہ ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے خود قائد کا عوام تک پہنچنا بے حد ضروری ہے اور ایک سچا قائد جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں اہل مکہ جیسے جاہل اور گنوار عوام سے بھی اپنی قیادت منوا سکتا ہے۔ یہی ہے یہ اصول بھی واضح ہوا کہ قائد کے لیے عوام سے رابطہ پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔

## مکی زندگی سے سبق

نبوت کے بعد کی مکی زندگی سے جس میں آپ نے بڑے صبر و تحمل اور استقامت سے تبلیغ کی محنت غریبہ کی اس بات کا کہ آپ نظر اور مخلص ہیں قطعی ثبوت مل جاتا ہے۔ لہذا میں مکی زندگی پر تفصیل سے کچھ مہینوں کیوں لگا کر دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

اول یہ کہ جب سردارانِ قریش نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو مکے کی سرداری پیش کر دی جائے تو اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں بادشاہت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا۔ اگر آپ اس وقت سردارانِ قریش کی بات مان لیتے تو وہ یقیناً آپ کو سردار بنا لیتے۔ لیکن مقصد چونکہ ایک فلاحی مملکت کے قیام کا تھا اس لیے آپ سردارانِ قریش کے مہربان منت نہ ہوئے اور یہ بات سیاستدانوں کے



یہ واضح کر گئے کہ اقتدار کا مقصد صرف اقتدار کا حصول نہیں بلکہ اس سے عوام کو فائدہ پہنچانا اور کیے جیسے وعدوں کو پورا کرنا مقصود ہے۔

اس قسم کی ایک سرداری انگریزوں نے محمد علی جناح کو بھی یہ کہہ کر پیش کی تھی کہ وہ دونوں ملکوں (بھارت۔ پاکستان) کے گورنر جنرل بن جائیں۔ چونکہ ایسی سرداری سے نظریۂ پاکستان کو نقصان پہنچتا تھا اس لیے قائد اعظم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ دراصل مخصوص مفادات کا حامل طبقہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے عام طور پر یہی طریقہ ایجاد کرتا ہے کہ وہ انقلابی لیڈر کو سرداری کی پیش کش کر کے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ایک چال چلتا ہے۔ اس سے بچنا اور صحیح اور نادرست قیادت کے درمیان فرق محسوس کرنا ایک سچے اور مخلص قائد کا فرض منصبی ہے۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جب آپ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خود بھی سکے سے ہجرت کرنی ہے تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ شام کو تیار ہو کر آجائیں۔ ہمیں بھی کسے سے ہجرت کرنی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ تو اسی ساعت کے منتظر تھے انہوں نے تو پہلے ہی سے دل ہی دل میں تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ چنانچہ جو پہلی شام ہوئی وہ سواری کے لیے دو اونٹنیاں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ دو اونٹنیاں میں ان میں سے ایک آپ اپنے لئے منتخب فرمائیں۔ آپ نے ایک اونٹنی کو اپنے لئے چن لیا۔ خوشی سے حضرت ابوبکرؓ کا چہرہ مکمل ٹھکانا اور عین کیا جیسے اب آپ اس اونٹنی پر سوار ہو جائیں مگر آپ نے سوار ہونے سے پہلے حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ سے دریافت فرمایا کہ اس کی قیمت کیسے ہے پھر جب امرار کر کے آپ نے قیمت پوچھی اور حضرت ابوبکرؓ کو مجبوراً واپس لے کر اپنی پٹری تھاپ کر سوار ہوئے۔ اب ذرا ہمارے زمانے کی سیاست سے اس کا موازنہ کریں ہمارے رہنما اپنے دوستوں سے اکثر یہی کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں اقتدار حاصل کر لینے دو اور سہاہی عزت کے لیے اپنی کاریں اور دیگر وسائل ہماری تحویلی میں دیدو ورنہ ایک صاحب نے تو اس مطالبے پر پلویا بینک ہی لے لیا تھا، پھر جب ہم اقتدار حاصل کر لیں گے کئی گنا زیادہ نفع کے ساتھ ہمارا تمام حساب چکا دیں گے۔ کہیں بذریعہ روٹ پر مٹ اور کہیں لائسنسوں کی بھرمار سے ہمارے دلوں کے تمام شوق پورے کر دیں گے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ منیٰ میں بلادِ عرب کے نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔ ایک قبائلی عرب بحیرہ بن فرس نے سمجھا کہ آپؐ اپنی شہنشاہیت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس نے پوچھا :

”اگر ہم تمہاری رعایا بن جائیں اور آپؐ اپنے دشمنوں پر غلبہ پا جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپؐ ہمیں حکومت کا جانشین مقرر کر دیں؟“ آپؐ نے جواب دیا :

”حکومت کا معاملہ مختلف ہے وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

غرض کہ کسی قسم کی غلط امید بھی نہ دلائی۔  
اور اس مثال اور اس سے پہلے کی مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی مملکت شخصی اور شہنشاہیت  
نہیں ہے بلکہ یہ عوامی اور REPUBLIC ہے۔

## واقعہ ہجرت سے رہنمائی

ہجرت کا واقعہ کئی طرح کی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل مکی زندگی سے خفیہ انجمنوں کو کس  
طرح ملایا جائے اور آغاز میں کامیابی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ وغیرہ قسم کی سیاسی تربیت کے لیے یہ حد  
مواد ملتا ہے۔ لیکن ان تفصیلات سے گزرتے ہوئے ہم ہجرت کی اس اہمیت کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ  
اسلام کی تاریخ کا آغاز ہی ہجرت سے کیا گیا۔ یہ آغاز آپ کی پیدائش کے دن سے کیا جاسکتا تھا۔ یا اعلان  
نبوت کے دن کی اہمیت کے پیش نظر اس دن سے کیا جاسکتا تھا۔ لیکن سنہ ہجری یعنی آپ کی ہجرت  
سے کیوں اسلامی سال کا آغاز ہوا؟

میرے تجزیہ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت میں اپنی زندگی  
کا آغاز اسی وقت سے شروع کرتے ہیں اور اسلام کی پہلی مملکت یعنی ریاست مدینہ کی بنیاد پڑتی ہے اس  
سے اہم سیاسی اصول مرتب ہوتا ہے اور اسلامی سیاسی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔  
جبکہ علامہ ابوالفضل فارابی نے کہا اور شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید نے تائید کی۔ یہ اسلامی  
مزاج کا خلاصہ ہے کہ مسلمان آزاد ہو۔ غلامی مسلمان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اسلام کا یہی  
مزاج پاکستان کے وجود کا باعث بنا۔ اسلام کے اس مزاج نے مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کو آزادی  
کی خواہش سے مضطرب رکھا۔ اور مغربی مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ COLONIALISM کی لعنت سے  
جلد چھٹکارے کی ایک وجہ مسلمانوں کی آزادی کی خواہش تھی۔

غرض اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ ایک آزاد مملکت بھی ہو۔  
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ماڈرن مملکت کی کماحقہ ضروریات اسلام ہوتا ہے۔  
اب ذرا اس معاہدے کے الفاظ پر غور کریں جو آپ نے مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے  
درمیان کیا۔ اس میں ایک شق یہ ہے کہ معاہدہ میں شامل ہونے والے تمام فرقہ ایک ملت واحد قرار  
دیئے جاتے ہیں۔

آج بھی کبھی بڑے سے بڑے جمہوری ملک کا آئین اٹھا کر دیکھ لیں یا بڑے مغربی سیاسی مفکر کا  
مملکت کے متعلق تصور لے لیجیے۔ ملت واحدہ کے تصور سے آگے نہ جمہوری مملکت نہ سیکولر حکومتیں

کوئی تصور دے سکیں ہیں۔

ایک بار ایک مملکت میں شمولیت ہو گئی تو پھر ایک ملت کا حصہ بن گئے۔ شاید ایسی ہی بات تھی جو قائد اعظم نے دستور ساز اسمبلی میں کہا تھا کہ آپ پاکستان بن گیا ہے اور مسلمان اور غیر مسلم برابر کے شہری بن گئے ہیں۔ اسلام کا سیاسی مزاج۔ ایک اسلامی ریاست میں ملت واحدہ کے تصور کو اجاگر کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سب جانتے ہیں۔ مسلمان اس معاہدہ کو اپنی کمزوری سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے باقی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپؐ سے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیا آپ رسول نہیں؟ کیا آپؐ نبی برحق نہیں؟“ آپؐ نے فرمایا: بیشک میں نبی ہوں۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیا ہم مسلمان نہیں؟ ارشاد فرمایا: کیوں نہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا، کیا وہ لوگ مشرک نہیں؟ فرمایا: مشرک ہیں۔

حضرت عمرؓ نے عرض کی: پھر ہم دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپؐ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں اللہ مجھے ہرگز خوار نہ کرے گا۔

آپؐ نے حضرت عمرؓ کے سوالات کے جوابات خوش دلی اور صاف گوئی سے دیے۔ لیکن پھر بھی مسلمان افسردہ تھے۔ اور قربانی کے لیے جو جانور لائے ہوئے تھے وہ قربان نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے بی بی عائشہؓ سے ذکر کیا اور پھر ان کی رائے کے مطابق مسلمانوں سے کوئی گلہ کیے بغیر پہلے خود اپنے جانوروں کی قربانی دی۔ آپؐ کو دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی قربانی دینی شروع کر دی اور فضا سے کھچاؤ اور مالوسی دور ہو گئی۔

اس ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی مزاج میں تنقید برداشت کرنے کی گنجائش ہے۔ عوام اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور قائد پر فرض ہے کہ وہ ان کی تسلی کرے۔ البتہ عوام نے ایک بار کسی کو اپنا لیڈر چن لیا ہے تو ان پر بھی فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اطاعت میں کمی نہ کریں

یہی مزاج تھا جو کہ اخلاق نبویؐ سے اسلام کی سرشت میں شامل ہو گیا۔ کہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے ان کے کرتے کا حساب مانگ لیا تھا۔

## احتساب، آزادی رائے

اسلام کی سیاست کا CORNER STONE احتساب ہے اور اس کے لیے آپؐ کی تمام زندگی ایک نمونہ ہے۔ صلح حدیبیہ کا یہ واقعہ ہی چونکہ بڑا ہی SENSITIVE واقعہ تھا اور اس دن جذبات بڑے مختلف تھے اس لیے اس دن آپؐ نے جو اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور مائے دالوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا جو موقع دیا وہ ایسی مثال ہے کہ اس سے اظہار رائے کی آزادی کا پورا چارٹر مرتب ہو سکتا ہے۔ آزادی اظہار اور احتساب کا چوٹی دامن کا ساتھ اسلام کے مزاج میں مثال ہے۔ جو اسلامی ریاست آزادی اظہار کو روکتی ہے اور احتساب کا مکمل انتظام نہیں کرتی وہ ابھی اسلام کے سیاسی خاکہ کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔

### فتح مکہ

واقعات تو بہت سے ہیں اور ایک ایک واقعہ نئے زاویے سے سیاسی مزاج کی تدوین کرتا ہے۔ لیکن آج تو غرور و خال ہی پیش کیے جا سکتے ہیں اس لیے میں اب فتح مکہ کی بات کرتا ہوں۔ اس روز آنحضرتؐ نے کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر تین اہم اعلان کیے تھے۔ پہلا اعلان تو خرمیت مکہ کے متعلق تھا، دوسرا عام معافی ہے اور تیسرا اعلان سیاست کا سنگ میل ہے۔

آپؐ نے اعلان کیا:

”آج جاہلیت کے خاندانی اور نسلی غرور کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔“

یہ اعلان مساوات آج کے دساتیر میں RIGHT OF EQUALITY کے نام سے مشہور ہے۔ اس اعلان نے ظاہر کر دیا کہ اسلامی حکومت عمومیت کی اساس پر قائم ہو سکتی ہے۔ اور حسب نسب کے جھگڑے اور حسب نسب کے شجروں سے پاک ہے۔ جو یہ کہے کہ وہ اچھے اور ایک بہت معزز خاندان کا رکن ہے اس لیے افضل ہے۔ وہ اسلام کے مزاج کے خلاف بات کرتا ہے۔ خاندانی شجروں کو علاوہ تاریخی فتنہ کے اور اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس قسم کا بیان کہ اہل رائے لوگوں کو حسب نسب اور خاندانی تعلق کو مد نظر رکھ کر چنا گیا ہے یا چنا جائے گا نوکر شاہی کی ترجمانی کرتا ہے اور اسلامی مزاج کے مطابق نہیں ہے۔

## خاتمہ کلام

اب آخر میں ایک عجیب مثال پیش کرنی ہے اور یہ آخری بات ہے۔ اخلاق نبی کی کیشان ہے۔ آپؐ اپنے ساتھی تیار کرتے ہیں، انہیں رشد و ہدایت دیتے ہیں، ان کی تربیت کرتے ہیں، لیکن اپنے بعد کسی کو نامزد نہیں کرتے اور معاملہ عوام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ”عوام، پارلیمنٹ، اسلام“ میں اسے ”سکوت حکیمانہ“ کا نام دیا ہے۔ اگر آپؐ حکم دے جاتے تو تعمیل کرنا فرض ہو جاتا، آپؐ نے یہ بات جمہور پر چھوڑ دی، نامزدگی سے اجتناب کیا۔

اپنی قوت اور اختیارات کا استعمال نہ کرنا اور جمہور کے اختیارات کو ترجیح دینا، ایسی مثال ہے کہ اسے جمہوریت کا میگا نارٹھا کہنا چاہیے۔ صحیح اور افضل ہے۔ اخلاق نبی کی روشنی میں آپؐ نے دیکھا کہ کیسا اسلامی سیاسی مزاج ابھرتا ہے۔ اول تو سیاسی شعور اس مزاج کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے۔ مسلمان کے خون میں سیاست ہے۔ پھر یہ عمومی اور جمہوری ہے۔ مساوات کی تعلیم دیتی ہے اور قائد سے تقاضا کرتی ہے کہ اس کے قول و فعل میں فرق نہ ہو۔ اور نظام حکومت کا مقصد عوام کی بھلائی و سہولت ہے دنیا کا کوئی دستور اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔

# اسلام کا نظام عدل

جناب محترم جسٹس (ریٹائرڈ) محمد افضل چیمہ

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَا ذِي الْقُرْبَىٰ  
وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ  
تَذَكَّرُونَ

”بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قربت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لیے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو!“

مغرب کے محدود تصورِ مذہب کے برعکس جو محض چند رسوم و عبادات سے عبارت ہے اسلام ایک جامع ضابطہ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے قرآن مجید میں ”دین“ کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

”بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے“

وَمَنْ يَتَّبِعْ عِيسَى الْإِسْلَامَ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

”اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ

اس سے مقبول نہ ہوگا“

اور حجتہ الوداع کے موقع پر حضورؐ پر جو آخری آیت کریمہ نازل ہوئی، ”اليوم اكملت لکم دینکم“، اس میں بھی تکمیلِ دین کا ذکر فرمایا گیا۔ چنانچہ دینِ اسلام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت اور رہنمائی کے وہ ابدی اور اساسی اصول مہیا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی صورت میں وحی الہی کے ذریعے خاتم المرسلین و رحمۃ العالمین صاحبِ خلقِ عظیم کی واسطہ سے ہم تک پہنچائے۔ پھر حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک مقدس لمحے سے ان اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر کا بہترین نمونہ میسر آئے ہے جو سیرت و سنتِ نبوی

یعنی حضور کے افعال و اقوال کی صورت میں کتب حدیث میں پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ حضور قرآن مجسم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ

”آپ قرآن مجسم تھے“

قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

”تم لوگوں کے لیے یعنی ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے

ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے“

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فرائض کی انجام دہی اور واجبات کی ادائیگی کے

لیے انسان کے تربیتی پروگرام میں اخلاقی اقدار و محاسن مثلاً محبت، رحم، ہمدردی، ایثار، دیانت

امانت، ایفائے عہد، عدل و احسان وغیرہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس نظامِ تربیت

میں یومِ حساب، مسئولیت اور جزا و سزا کے عقیدے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو راسخ الایمان

لوگوں کے لیے سب سے بڑا محتسب اور منکرات و نجاست سے پرہیز اور جنات و معروفات کی

طرف میلان و رجحان کا ضامن ہے۔ انفرادی ذمے داری کے علاوہ کوئی شخص بھی اجتماعی مسئولیت

سے مستثنیٰ نہیں ہے خواہ اس کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

اَلَا كَلِمَةٌ رَّايَ وَكَلِمَةٌ مَسْتَوَلٌ عَنْ رِعْتِهِ

قرآن کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد آیاتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے اور اس کی

تلقین فرمائی گئی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَقْوَامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلِوَلِي

عَلَى الْفُسْكَمَ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْسَبِينَ ۝

”اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے

رہو، اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتے داروں کے مقابلے

میں ہو، ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَقْوَامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ

ولا یجر منکم شنان قوم علی ان لا تعدوا اعدایہو  
اقرب للتقویٰ ۵

”اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے“ نیز ارشاد ہے:

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۵  
”اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو“  
ہمارے ہاں عدل کی اصطلاح تین مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔

## توازن واعتدال

ایک مفہوم سے مراد توازن اور اعتدال، افراط و تفریط سے احتراز اور امر بمتوسط لی جاتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وکذلک جعلکم امتۃ وسطاً تکنوا شہداً علی الناس ۵  
”اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں میں مقابلہ میں گواہ ہو“  
یا کہا گیا ہے: ”خیس الامور اوسطہا۔“

## مساوات

دوسرے مفہوم کے مطابق عدل مساوات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

## انصاف

محمد و معنوں میں عدل انصاف سے بھی عبارت ہے جس میں نظام قانون و عدالت کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ اگر عدل کو توازن و اعتدال کے وسیع تر مفہوم کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلام میں اس کی مندرجہ ذیل صورتیں پائی جاتی ہیں۔

(الف) فرد یا معاشرے میں جسم اور روح کی نشوونما اور بالیدگی کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جبلی اور فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی حقیقت پسندی سے اسلام نے جسمانی اور مادی ضروریات کو بہ یک وقت پورا کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دیا ہے۔ چنانچہ



رزقِ حلال کا کمانا، کھانا پینا، شادی کرنا، بال بچوں کی پرورش، دنیوی زندگی کے ایسے وظائف ہیں جو روحانی ارتقا اور نجاتِ اخروی میں کسی طرح حائل یا مڑاخم نہیں بلکہ بہ منزلہ عبادات ہیں۔ عیسائیت یا بدھ مذہب کی طرح اسلام میں ترک دنیا یا ربانیت کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اس حضرت کا ارشاد ہے: ”لارہبانیۃ فی الاسلام“ حضرت نے صحابہ کرامؓ کو ترک دنیا اور ازدواج سے کنارہ کشی سے سختی سے منع فرمایا، اور اس طرزِ عمل کو خلافِ سنت قرار دیا۔

حدیث میں آیا ہے۔

ان نصر امن اصحاب النبی سألوا ازواج النبی عن عملہ فی البسر فقال بعضهم لا اتزوج النساء وقال بعضهم لا اکل اللحم وقال بعضهم لا اناہم علی فراش محمد اللہ واثنی علیہ فقال ما بال اقوام قالوا کذا وکذا لکنی اُصلی واناہم واصوم وَاُفطر واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی..

(مسلم عن انس کتاب النکاح)

”چند صحابہؓ نے نبیؐ کی بیویوں سے آپ کے پوشیدہ معمولات کے بارے میں پوچھا، جب انھیں بتایا گیا تو ان میں سے ایک نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں گوشت نہ کھاؤں گا، تیسرا بولا: میں فرش پر نہیں سوؤں گا، آں جناب ص کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ میں (رات میں) نفل پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، میں کبھی (نفلی) روزے رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، میں بیویاں رکھتا ہوں، پس جو میرے طریقے سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں،“

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قل من حرم زینۃ اللہ الّتی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق ۝

”آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو جن کو اُس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے،“

البتہ دنیوی زندگی کے ان تمام وظائف کے لیے معقول اور معتدل حد و درجہ طبعاً ہائے کار

مقرر کر دیے گئے ہیں جن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔

(ب) اسلام انسانی زندگی میں دین و دنیا کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں ہے حتیٰ کہ دین اور سیاست کی علاحدگی کا مغربی تصور بھی سراسر غیر اسلامی ہے۔ زندگی ایک جامع اور ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ فرض عبادات اور ذکر و فکر کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر دنیاوی زندگی کے تمام فرائض کی ادائیگی اور لذات سے لطف اندوزی بہترین عبادت قرار دی گئی ہے۔

(ج) اس نوعِ عدل کی ایک صورت فرد اور معاشرے کے مابین باہمی ربط و ضبط میں اعتدال و توازن کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسلامی معاشرے میں جہاں ایک طرف فرد کی آزادانہ نشوونما اور ارتقاء کے تمام معقول مواقع میسر آتے ہیں، وہاں امت مسلمہ کے رکن کی حیثیت سے اُس کے ذمے کچھ اجتماعی فرائض بھی ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام میں فرد کی حیثیت محض ایک بے جان اور بے بس پُرزے کی رہ جاتی ہے جو اجتماعیت کی آہنی گرفت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں دولت مند اور طاقت ور افراد کو معاشرے پر زبردست سیاسی غلبہ اور تسلط حاصل ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط کی ہیں جن کے مضر اثرات و نتائج روزمرہ سامنے آ رہے ہیں۔ مگر اسلام میں عالمی زندگی کے فرائض، صداقت و زکوٰۃ کی تاکید، جماد میں شرکت وغیرہ کے علاوہ پانچ وقت نماز باجماعت، صلوٰۃ جمعہ اور عیدین کے اجتماعات اور حج کے موقع پر مسلمانانِ عالم کا اجتماع، اسلام کی اجتماعیت اور مرکزیت کی چند مثالیں ہیں۔ جن سے فرد اور معاشرے کے مابین غیر استحصال معیشت توازن اور تعمیری اعتدال کی وضاحت ہوتی ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(د) اسلام میں عدلِ اجتماعی کا اصول محض عقیدے کے طور پر ہی تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ پیغمبر اسلام نے اس کا عملی نفاذ فرما کر دنیا کے سامنے اجتماعی مساوات کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ چنانچہ جب ميثاقِ مدینہ کی رو سے پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی تو یہودیوں سے عدل و مساوات کی بنیاد پر معاہدہ کیا گیا۔ ”لا اکسر الا فی الدین“ کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی عطا کی گئی۔ احوالِ شخصیت میں انھیں اپنے مسائل اور معاملات اپنے منہب کے مطابق طے کرنے کی اجازت دی گئی، ان کی جان و مال،

عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور ”ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا“ کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسے اسلامی مملکت میں رعایا کے تمام مسلم اور غیر مسلم شہریوں پر یکساں طور پر نافذ کیا گیا۔ اگرچہ یہ ارشاد نبوی حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب فرمایا گیا تاہم بینہ دی حقوق کے تحفظ کی ضمانت اور اس کا عملی نفاذ حیاتِ طیبہ کے ہر لمحے اور ہر لمحے سے عیاں ہے۔

## مساوات

دوسرے مفہوم کی رو سے عدل مساوات کے مترادف ہے۔

(۱) اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید و الوہیت برجلئے خود عدل و مساوات اجتماعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، ”لا الہ الا اللہ“ اور ”ایاٹ نعبد و ایاٹ نستعین“ کا مفہوم کچھ یہ ہے کہ مستحقِ عبادت و سزاوارِ بندگی وہی ایک ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اس اعلان و اقرار سے تمام دنیاوی خداؤں، فرماں رواؤں، مذہبی اور روحانی پیشواؤں کی بندگی یکسر ختم ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی غلامی کے تمام بندھن یک لخت ٹوٹ جاتے ہیں۔ ”وَلَا تَحْکُمُوا بِاللَّهِ“ اور ”اَللّٰهُ الْخَلِیْقُ وَالْاٰمِسُ“، پر ایمان لاتے ہوئے ساری کائنات پر اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے مطلق العنانیت، شخصی حکومت، موروثی ملوکیت، پاپائیت اور بادشاہت کے خدائی حق DIVINE RIGHT OF KINGSHIP کے تمام نظریات یک قلم باطل ہو جاتے ہیں۔

سروری زیا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمِ راں ہے اک و ہی باقی بُتانِ آذری!

(ب) ”وَاَمْسُوْهُمْ شَوْرٰی بَیْنَهُمْ“ کے اصول کے ذریعے اور خود نبی اکرمؐ کو ”وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ“ سے مشاورت کا حکم دے کر اسلام نے جمہوریت کی مضبوط بنیاد استوار کر دی۔ عالم گیر اخوت اور برائی نوع انسان کے مساوات کا تصور اسلام نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دنیا کے سامنے مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں پیش کیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا

وَقَبَاۤتِلْ لِّتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَكْسٰىكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ

”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قویں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم

سب میں بڑا شریف ڈھبی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

(ج) چودہ سو سال بعد آج اقوام متحدہ کے منشور میں بنی نوع انسان کے ایک کنبہ ہونے کا تصور محض اقرار باللسان کی حد تک پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق بالقلب کا کوئی عملی ثبوت کمپن نظر نہیں آتا بلکہ روزمرہ اس کی صریح خلاف ورزی کے مظاہر اور شواہد سامنے آرہے ہیں اور اس کی پامالی اسرائیل، جنوبی افریقہ، ہندوستان اور دوسرے دیگرہ کے ہاتھوں مسلسل ہو رہی ہے۔ یہ عادلانہ اصول مساوات و امن اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس سے ہر قسم کے نسلی، لسانی اور جزیائی امتیازات باطل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے عزت و فضیلت کا واحد معیار تقویٰ اور خدا خوفی کو قرار دیا ہے اور اس طرح نسلی تفوق کی بنیادیں یکسر منہدم کر دی ہیں۔

بجاء اللہ اب تو معقول سائنسی دلائل کی بنا پر بھی یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ شکل و صورت، قد و قامت، لون و لسان کے شدید اختلافات کے باوجود نسل انسانی ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے جس سے ”ڈارون“ کے نظریہ ارتقاء کا ابطال ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں جو انسانی حقوق کا جامع اور مکمل ترین چارٹر یا منشور ہے ارشاد فرمایا:

”لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَىٰ عَجَبِيٍّ وَلَا لَأَسْفَهِيٍّ عَلَىٰ أَسْوَدَ إِلَّا بِالْتَّقْوَىٰ  
كُلُّكُمْ لِرَأْسِ دَاوُدَ مِنْ تَرَابٍ“۔

## عدل اجتماعی

اسلام میں اجتماعی عدل کی ایک صورت یہ بھی ہے جو عدل عمرانی یا

*Social Justice* کی اصطلاح سے معروف ہے۔

(۲) اسلام نے مرد اور عورت کے مابین حقوق و فرائض کی ایک نہایت فطری اور عادلانہ تقسیم کر دی ہے۔ تاریخ انسانی میں سب سے پہلے اسلام نے ہی معاشرے میں عورت کو ایک قابل احترام مقام عطا کیا ہے۔ کس مال، حق ملکیت، حق نکاح میں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ اگر بچے کی رضاعت کا فرض عورت پر عائد کیا گیا ہے تو بیوی بچے دونوں کی کفالت مرد پر واجب ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں سستی کا قانون صدیوں سے مستوح ہو چکا ہے تاہم ہندو معاشرے میں آج بھی بیوہ کی زندگی سخت اجیرن ہے اور وہ بے چاری زندہ در گور کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے واکھو الا یاعملیٰ منکم کا حکم دے کر نکاح بیوگان کو ایک مستحسن امر قرار دیا ہے۔ عائلی زندگی میں مرد اور عورت کے درمیان حدود و کار بھی متعین کر دی

گئی ہیں۔ یہ تقسیم بھی عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ غرض یہ کہ اسلام فرد، خاندان، جماعت اور قوم میں ایک عادلانہ ربط اور نظم پیدا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں عائلی زندگی کا وجود سرے سے ختم ہو چکا ہے جس سے کئی مفاسد نے جنم لیا ہے۔ مگر اسلام اس کو ایک تقدس عطا فرماتا ہے۔ افرادِ کنبہ میں میاں بیوی کے علاوہ والدین اور اولاد دونوں شامل ہیں۔ والدین کے حقوق کی پاس داری، ان کی خدمت و اطاعت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ گفت گو میں بھی ان سے سخت کلامی کی ممانعت کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَوْفَ وَلَا تُنْهَهِمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا  
”کبھی ہاں سے ہوں بھی مت کرنا، اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا“

وَإِنْ خِفْتَ مِنْهُمَا الْجُلُودَ مِنَ الرِّجْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا  
”کہا رب تین صغیر“

”اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دُعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے، جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے“

مغرب میں عورت کو مساواتِ مطلقہ کی بنیاد پر اس قدر ذلیل و خوار کیا گیا ہے کہ فطری تقاضوں کی اس خلاف ورزی سے معاشرہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہو گیا ہے۔ بالخصوص بچوں میں ہر طرح کے جرائم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ روز افزوں شرحِ طلاق سے عائلی زندگی برباد ہو رہی ہے۔

(ب) اسلام کے معاشی نظام میں حقِ ملکیت کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ اُسے پورا قانونی تحفظ عطا کیا گیا ہے۔ فقہی اصول ہے، ”لیس للامین ان یاخذ من احدٍ شیئاً الا بحق ثابت معروف“، مگر یہ تحفظ غیر محدود یا غیر مشروط نہیں ہے۔ اللہ کریم کے عطا کردہ جان و مال پر انسان کا تصرف کُلّی اور قطعی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت امین اور طرٹھی کی سی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَّهُمْ الْجَنَّةُ

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات

کے عوض خرید لیا ہے کہ اُن کو جنت ملے گی۔“  
اگر جان و مال کا تحفظ لازم ہے تو کبھی کبھی اس کا نثار اور قربان کر دینا بھی واجب ہو جاتا ہے۔

”بے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی“  
اسلام نے اصحابِ ثروت کے مال و دولت میں غریب و مساکین کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ صدقات و زکوٰۃ کی ادائیگی ہرگز کسی پر احسان نہیں ہے بلکہ غریب کو اُن کا حق لوٹا دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلْمَسْكِينِ وَالمُحْرَمِينَ  
”اور ان کے مال میں سوائی اور غیر سوائی کا حق ہے۔“

معاشرے میں زیرِ پرستی اور استحصال کو روکنے اور بہت خدمتِ خلق، ہم دردی اور ایثار کے جذبات کو پر دان چڑھانے کے لیے اسلام نے سود کی شدید مذمت اور قطعی ممانعت کر دی ہے۔ اور بلا سود لین دین، مشارکت اور مضاربت پر مبنی بنکاری، اسلامی معاشیات کا اہم اصول ہے۔ اسراف و تبذیر اور نمود و نمائش کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور اتفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

(ج) رعایا کے ہر فرد کی بنیادی ضرورت مہیا کرنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے جس کی ادائیگی کے لیے مال و دولت پر محاصل عائد کیے جاسکتے ہیں۔ صدقات کے متعلق ارشادِ نبویؐ ہے، ”تَوْخِذْ مِنْ اَعْنِيَاثِهِمْ وَتَرُدَّ اِلٰى فَقَرٰئِهِمْ“ حتیٰ کہ دولت کے چند اٹھوں میں ناجائز ارتکاز کو روکنے کے لیے نیز اُمراء اور غریب کے مابین فاصلہ کم کرنے کے لیے مصلحتِ عامہ کے پیش نظر اگر حکومت نجی ملکیت پر تحدید عائد کرنا ناگزیر تصور کرتی ہو تو ”ابنِ حزم“ اور بعض دیگر فقہائے کرام کی نگاہ میں ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔  
اب عدل کے محدود مفہوم کے متعلق جو انصاف کا مترادف ہے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

## عدل انصاف کے معنی میں

اس ضمن میں اسلامی نظامِ عدل و انصاف کے بعض اہم اصولوں کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔

(۱) اگرچہ تمام مذہبِ ممالک کے دساتیر میں قانون کی حکمرانی اور بالادستی کا خاص طور

پر ذکر کیا گیا ہے تاہم ہر دستور میں سربراہ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی قاتل، ڈاکو، خائن یا چور کے عدالتی حکم سزا یا بی کو موقوف کر دے، اس کی سزا معاف کر دے یا اس میں تخفیف کر دے۔ یہ دراصل دورِ ملوکیت کے ”حقِ سلطانی“ کی ایک متغیر صورت اور اس کے باقیات التیثات میں سے ہے۔ شریعت کی رو سے سربراہ مملکت یا کسی اور با اختیار شخصیت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ قتل کے جرم میں جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، مقتول کے ورثاء کو یہ حق ہے کہ وہ کسی مرتد پر بھی مجرم سے مصالحت کا معاملہ کر لیں یا اسے معاف کر دیں۔

(ب) اسی نوعیت کی ایک دوسری شق جو دنیا کے ہر دستور میں پائی جاتی ہے وہ سربراہ مملکت کا قانونی عمل داری سے استثناء ہے۔ یہ بھی دورِ ملوکیت کی باقیات التیثات میں سے ہے جس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ:

“King can do no wrong”

”بادشاہ معصوم ہے اور اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا“ شریعت میں بادشاہ یا سربراہ مملکت یا کسی با اختیار شخص کو اس قسم کی کوئی استثنائی رعایت حاصل نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات پائے جاتے ہیں جہاں سربراہ مملکت کو مدعی یا مدعی علیہ یا ملزم کی حیثیت سے عدالت میں ایک عام آدمی کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔ اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا: ۛ

عبد مسلم کمتر از احرار نیست

خون شریکین تراز مجاز نیست

(ج) عدلیہ کی حریت اور انتظامیہ سے اس کی علاحدگی کا اصول بھی اسلام نے ہی پہلے پہل دنیا کو عطا کیا۔ اگرچہ عدلیہ کے ارکان کا انتخاب اور تقرری صدر مملکت کے حکم سے ہوتی ہے تاہم قضا کے معاملے میں وہ اُن کے فیصلوں میں کسی طرح بھی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہے اور ارکان عدلیہ اپنے فیصلے احکامِ شریعت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی اور مسئولیت کے نقطہ نظر سے صادر کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد مرتبہ ایک ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِذَا حُكِمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۝

”اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کر دو تو عدل سے تصفیہ کیا کر دو“

(۱) عدالت میں سچی گواہی دینے کی تاکید فرمائی گئی ہے خواہ اعزہ و اقربا کے خلاف ہی کیوں

نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ ۖ بِالْقِسْطِ مِمَّا رَزَقْنَاهُ ۖ وَكُونُوا عَلَىٰ  
أَنفُسِكُمْ وَأُولَىٰ الدِّينِ وَالْأَقْرَبِينَ ۝

”اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے  
والے رہو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا اگر والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے  
مقابلہ میں ہو۔“

اور کتمانِ شہادت سے منع فرمایا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:  
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ أَتَمَّ قَلْبُهُ ۝  
”اور شہادت کا انخفاست کرو، اور جو شخص اس کا انخفا کرے اُس کا  
قلب گنہگار ہوگا۔“

(ب) عدل و انصاف کے معاملے میں اسلام اس قدر حساس ہے کہ تائیدِ باریہ حکم دیا گیا ہے  
کہ دشمنوں کے ساتھ بھی کسی حالت میں، کسی قسم کی نا انصافی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ ارشادِ باری  
تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجُوزُ مِنْكُمْ شَنْءٌ شِئَانٍ قَوْمٍ عَلَىٰ أَن لَا تَعْدِلُوا ۖ  
”اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے  
کہ تم عدل نہ کرو۔“

(ج) اسلام میں قصاص نہ صرف جائز ہے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ہمارے لیے قصاص میں  
زندگی ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

لیکن اس کے ساتھ ہی احسان اور عفو و درگزر کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحُرُّ بِالْحُرِّ  
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۚ وَالْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ  
فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَإِدَارَةٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۝

”اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین کے بارے میں آزاد  
آدمی آزاد آدمی کے عوض میں، اور غلام، غلام کے عوض میں، اور عورت، عورت  
کے عوض میں۔ ہاں جس کو اس کے قریبی کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے تو معقول  
طور پر بخوں بہا کا مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا دینا۔“



(د) معاشرے میں امن و سکون باہمی محبت، صلح اور آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے بعض معمولی باتیں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ عام سلوک اور برتاؤ میں بھی احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ سلام کا جواب دینے کے متعلق بھی جو بظاہر معمول سی بات ہے۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا حِيلْتُمْ بِالْحَمَةِ فَعِثُوا بِالْحَسَنِ مِنْهَا أَوْ رَوْهَا  
”اور جب تم کو کوئی سلام کرے تو تم اُس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو  
یا ویسے ہی الفاظ کہ دو“

(زُبُرِ اُمّی کے بدلے میں انتقام کے بدلے دُرُج)  
روزمرہ کے معاملات میں حسن سلوک اور احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:  
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي فِيكَ الْحَسَنَۃَ  
”اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال  
دیا کیجیے“

فتح مکہ کے موقع پر ”لَا تُشْرِبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ“ فرما کر جس طرح حضورؐ نے دشمنانِ اسلام کی جان بخشی کا اعلان عام فرمایا اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ مستشرقین نے خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ تاریخِ عالم میں کوئی فاتح اس انداز سے مغتومہ شہر میں داخل نہیں ہوا۔

(۲) اسلام انفرادی ارتکابِ جرم کے معاملے میں بھی اجتماعی ذمّے داری کے اصول کو اپناتا ہے۔ ثبوتِ جرم کی صورت میں جب مجرم پر دیت واجب ہو جاتی ہے تو اس کی ادائیگی فقط اس کی ذات پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ”عاقلة“ کی مشترکہ ذمّہ داری ہوتی ہے ”عاقلة“ سے مراد وہ افراد کنکبہ یا برادری یا ارکانِ گروہ یا تنظیم ہیں جن سے مجرم کا تعلق اس نوعیت کا ہو کہ اسے ارتکابِ جرم کے سلسلے میں ان کی ہمدردی یا اخلاقی مدد حاصل ہو سکتی ہو۔

(ب) اسی طرح عدم پتہ دار دات قتل کے سلسلے میں ”قسام“ کا طریق کار بھی مشترکہ ذمّے داری کے حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان یا معاشرے کا ہر فرد اصلاحِ معاشرہ اور انسدادِ جرم میں اپنی ذاتی ذمّے داری کو پوری طرح محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(ج) معروف قول ہے کہ امتناعِ انسداد سے بہتر ہے اور پرہیزِ علاج سے بہتر ہے۔ فتنہ کے سدباب کے لیے اسلام نے مسلمانوں پر یہ حیثیتِ مجموعی مصالحتہ مدخلات اور مساعی واجب

قرار دی ہیں۔ انہما المؤمنون اخوة فاصبروا بن اخویکم  
اسلام نے دورانِ جنگ بھی مخالفین سے عدل و انصاف اور احسان و مروت کے ساتھ  
پیش آنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَفْقَهُوْا كَلِمَ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ  
الْمُعْتَدِينَ ۝

”اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد  
سے نہ نکلے۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے“  
حتیٰ کہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر دشمنانِ اسلام خلوص سے صلح جوئی پر آمادہ ہوں تو تم بھی  
صلح کے لیے اتنا ہی جھکاؤ پیدا کرو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَإِنْ يَخْشَوُا الْإِسْلَامَ فَاصْطَبِرْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۝  
”اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیے۔  
اور اللہ پر بھروسہ رکھیے۔

اسلام کے نظامِ اخلاقیات میں اجتماعی عدل کے حصول کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر  
حال میں عہد کی پابندی کی جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ شدید ضرورت  
اور تکلیف کے وقت بھی اپنے عہد کی پابندی اور ایقانے عہد کا پورا ثبوت دیا۔

(الف) آنحضورؐ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تو بہت سے صحابہ مکہ ہی میں رہ گئے ان میں  
حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ابو جہلؓ مکہ سے آ رہے تھے کہ کفار نے انھیں پکڑ لیا اور بالآخر اس شرط  
پر چھوڑا کہ وہ دونوں جنگ میں آپؐ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ لوگ مقامِ بدر میں آپؐ کی خدمت میں  
پہنچے اور خود حضورؐ کو اس جنگ میں مصروف دیکھ کر اس سعادت میں حصہ لینے کی آرزو کی تو  
آنحضرتؐ نے حالات کی نزاکت کے باوجود فرمایا تم دونوں واپس جاؤ تم معاہدہ کر چکے ہو اس کی  
پابندی ضروری ہے۔ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

(ب) صلح حدیبیہ میں حضرت ابو جندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ  
کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، تمام مسلمان اس درد انگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ لیکن حضورؐ  
نے فرمایا: اے ابو جندل، صبر کرو! ہم بد عہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے عنقریب کوئی رستہ  
نکالیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

# آجرواجیر

## اخلاقیات نبوی کی روشنی میں روالبط

جناب محترم ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

آج دنیا عالمی سطح پر جن اہم مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ آجرواجیر کے روالبط کو سازگار اور خوشگوار کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف حکومتیں اپنی اپنی سطح پر اور عالمی ادارہ محنت بین الاقوامی سطح پر، درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جو تگ و دو کر رہے ہیں اس سے بھی اس مسئلے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عصر حاضر کے تمام تمدنی اور بین الاقوامی معاشی مسئلے کو بطریق احسن حل کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ دوسری طرف تاریخ اس امر پر شاہد عادی ہے کہ اس مسئلے کو آج سے چودہ سو برس پہلے جس انداز سے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے حل فرمایا اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اور اخلاقیات نبوی میں پیش کردہ تئیں اور رہنما اصول نے اسے جس مقام پہنچا کھڑا کیا ہے قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں آجرواجیر کے باہمی روالبط کی خوشگوار ی کا اس سے بڑھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ذہنوں میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہم یہ دعوا شاید اس عقیدت کی بنا پر کر رہے ہیں جو ہمیں رسول عربی سے ہے اور ذہنوں میں یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم نے اپنے اور اک و شیعہ کی آنکھ ایک ایسے ماحول میں کھولی جبکہ تہذیب مغرب کی چکا چونڈنے ہمارے اذہان و قلوب کو مرعوب کر رکھا تھا۔ اور ہمیں ہر جہاں مغرب کے پیش کردہ افکار و تصورات میں نظر آتی تھی۔ اور اسلام، مادی اسلام اور اسلامی اصول و تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے معذرت آمیز (APOLOGETIC) رویہ اختیار کرنا ہمارے عادت میں داخل ہو چکا تھا۔ الحمد للہ کہ چودھویں صدی ہجری نے جہاں مسلمانوں کے عروج و زوال کی بہت سی داستانیں پیچھے چھوڑی ہیں وہاں عالم اسلام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ اور مسلمانوں میں ملی شعور اور ملی تشخص کو بھی یک گونہ اُبھارا ہے۔ اور اب ملت اسلامیہ ایک بار پھر قرآن حکیم کے حکمت و بصیرت سے معمور خزانوں اور اخلاقیات نبوی کے زئیں اصول کی طرف ملتفت ہو رہی ہے۔ عالم اسلام کی اس بیداری کے ساتھ ایک خوشگوار پہلو یہ بھی

ہے کہ عمر حاضر میں مستشرقین جن کی آنکھوں میں اسلام کا گل شاداب کانٹے کی طرح چبھتا ہے اور وہ اسلام، مادی اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ہارے میں زہرا گھٹنے میں مصروف رہے ہیں اور اب بھی ہیں، کہیں کہیں ان سے بھی حرف اعتراف بے ساختہ سرزد ہو جاتا ہے چنانچہ ہارٹ (HART) نے حال ہی میں پوری تاریخ عالم میں سے جن سو مشاہیر کا انتخاب کیا ہے ان میں رسول عربی کو سرفہرست رکھا ہے اور اس کی توجہ یہ پیش کی ہے :

MY CHOICE OF MUHAMMAD TO LEAD THE LIST OF THE WORLD'S MOST INFLUENTIAL PERSONS MAY SURPRISE SOME READERS AND MAY BE QUESTIONED, BUT HE WAS THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMEY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS.

(THE 100, NEW YORK 1978, PP 33)

اس اقتباس سے رسالت مآبؐ کی شان و عظمت کا بیان مقصود نہیں۔ بھلا جسے اس وسیع و بیکہ اں کائنات کے خالق و مالک نے رحمة للعالمین، خاتم النبیین، کافۃ للناس، للعالمین نذیر، سر جہا مہنبر اور انک لعلى خلق عظیم کے پر عظمت الفاظ سے نوازا ہوا ہے کسی اور ستائش کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ میرا اس حوالے کو پیش کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کا تابناک جوہر یہ ہے کہ آپؐ نے مادی اور روحانی دونوں تقاضوں کی بطریق احسن تکمیل فرمائی۔

## مغرب کی روشنی میں

اخلاقیات نبویؐ کی روشنی میں آجروا جبر کے خوشگوار روابط کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے مناسب ہوگا کہ مغرب کی متمدن دنیا میں آجروا جبر کے تعلقات پر تاریخ کے آئینے میں ایک نظر ڈال لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے سباطور پر مزدور کے اوقات تلخ ہونے اور سرمایہ دار کے مامقوں انتہائی سادگی سے مات کھانے کی نشان دہی فرمائی تھی۔ چنانچہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور سے چودہ

سے لے کر سولہ سترہ گھنٹے اور بعض اہم مواقع پر مسلسل بیس گھنٹے یا اس سے بھی زائد عرصے تک کام لیا جاتا، انہیں اجرت کم دی جاتی، ان کے رہنے کے لیے چھوٹی سی کوٹھری دی جاتی جو غلاظت و عفونت کی وجہ سے جہنم زاد رہتی (دیکھئے حفظ الرحمن سیو ہاروی: اسلام کا اقتصادی نظام، ملتان، ۱۹۵۱ء ص ۲۶۶)

اب سے قریباً دو صدیاں پہلے ۱۷۷۶ء میں آدم سمٹھ نے مزدوروں کے لیے MOTIVATIONAL TECHNIQUES کے طور پر تنخواہوں کے سلسلے میں حوصلہ افزائی (WAGE INCENTIVE) نفع میں حصہ داری، فیکٹری کے چلانے میں ملازمین سے مشاورت طرز کی اصلاحات کو متعارف کرایا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی رابرٹ اوون (ROBERT OWEN) نے جس کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا محنت کشوں کی معاشی اور معاشرتی بہبود کے لیے دلچسپی لی۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ مزدوروں کو ایک کموڈٹی (COMMODITY) تصور نہ کیا جائے۔ گویا محنت کشوں کو انسان کے بجائے عام اشیاء گردانے کے تصور کو اٹھارویں صدی کے اواخر میں چیلنج کیا گیا۔

۱۸۳۲ء میں چارلس بیچ (C. BABBAQE) نے پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے آجروا جیر کے باہمی مفادات کے تحفظ اور اشتراک و تعاون کی آواز بلند کی۔ ۱۸۸۰ء میں مغرب میں ٹریڈ یونین نے رواج پایا۔ لیکن امریکا میں اس کے خلاف خاصی مہم جاری رہی حتیٰ کہ ۱۹۳۵ء میں وگنر ایکٹ (WAGNER ACT) میں اسے کچھ مثبت حوصلہ افزائی ملی سکی۔ ۱۹۴۰ء میں اجیروں کے ساتھ روابط کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ حال ہی میں یعنی ۱۹۶۲ء میں امریکہ کے صدر کنیڈی نے ایک آرڈر کے ذریعہ سے اجتماعی سوداگاری (COLLECTIVE BARGAINING AGENTS) کے منتخب نمائندے کو امور حکومت میں شریک کیا۔ ۱۹۶۴ء میں (CIVIL RIGHTS ACT) نے اجیروں کی اہمیت کو مزید استحکام بخشا، اور اب مغربی دنیا میں جہاں مزدوروں کو بے جانی مشینوں کی سی حیثیت حاصل تھی اب یہ احساس ابھرنے لگا ہے کہ انسان مشین سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تو تھا مغربی دنیا میں آجروا جیر کے روابط کا مختصر نقشہ جس پر اہل مغرب اور مغربی تہذیب سے مرعوب حضرات نازاں ہیں اور بعض نے تو یہاں تک کہ ڈالاک مزدوروں کی علاج و بہبود میں پروٹسٹات اخلاقیات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

## اسلام کی روشنی میں

اسم اخلاقیات نبوی کی روشنی میں آجرو اجیر کے روابط کا جائزہ لیتے ہیں :

آجرو اجیر کے الفاظ کا مفہوم بے حد وسیع ہے۔ اجیروں میں سرکاری اہلکار، نیم سرکاری جرنلری اداروں میں کام کرنے والے جملہ ملازمین، افسروں سے کلرکوں تک، تاجروں تک، تجارتی اداروں میں کام کرنے والے کارکن، ملوں اور فیکٹریوں کے مزدور، چند دنوں بلکہ چند ساعتوں کے لیے اجارے پر کام کرنے والے سبھی لوگ شامل ہیں۔ اگرچہ ہر ایک کا دائرہ کار مختلف ہوتا ہے، بعض کو قیادت و سیادت، نگرانی اور تنظیم کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں بعض لوگوں میں فنی مہارت و دسترس مطلوب ہوتی ہے، بعض کو دماغی کاوش سے کام لینا ہوتا ہے، بعض سے جسمانی مشقت کا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ اخلاقیات نبوی میں عمومی طور پر وہ اساسی رہنما نیریں اصول دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں حالات و زمانہ کی رعایت سے، کام کی نوعیت اور اجیر کی صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام درجات کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ آجرو اجیر کے روابط کے بے شمار متنوع مسائل کی گمراہیوں میں جانا مقصود نہیں اور نہ یہ منقطع وقت اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہذا ان مسائل کی پانچ بڑی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اجیر کی تقرری (سلیکشن کے معیار اور اسٹریڈیو) کے مسائل۔

۲۔ اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل۔

۳۔ آجرو کے حقوق کے مسائل۔

۴۔ آجرو اجیر میں تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں مسائل۔

۵۔ آجرو اجیر کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے اساسی اصول۔

سب سے پہلے ہم اجیر کی تقرری کو زیر بحث لاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ اور

شیخ مدین کے باہمی معاملے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

قَالَتْ اِحْدَاهُمَا يَا بَتِ اسْتَا جِرْ لِي اَنْ خَيْرٌ مِّنْ اسْتَا جِدِ  
الْقَوِيُّ الَّذِيْنَ ه قَالَ اِنِّيْ اُرِيْدُ اَنْ اُنَا جِعَكَ اِحْدَى ابْنَتِيْ  
هَاتِيْنِ عَلَيَّ اَنْ تَا جِدْنِيْ تَلْمِزِيْ حَبِجْ فَاَنْ اَتَمَمْتَ عَشْرًا  
فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَسْقَ عَلَيَّ سَتَجِدُنِيْ  
اِنْ سَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ه قَالَ خُذْ بَنِيَّ وَبَيْنَكَ  
اَيُّا اَلْاَجَلَيْنِ قَبَضْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ه

(۲۸ : ۲۶ - ۲۷)

اس ارشاد خداوندی میں مندرجہ ذیل پانچ بڑے رہنما اصولوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے:

- ۱۔ اجیر جسمانی اعتبار سے قوی ہو (PHYSICAL FITNESS)
- ۲۔ اس میں دیانت و امانت کا جو ہر موجود ہو (ہمارے ہاں کیرکٹر سٹیفٹ کا رواج تو ہے لیکن وہ محض ایک رسم (FORMALITY) ہے اسلام اسے عملی اور حقیقی صورت دینا چاہتا ہے۔

- ۳۔ آجیر کو کام کی نوعیت اور مدت کار کو واضح طور پر بیان کر دے۔
- ۴۔ آجیر کو اس امر کی یقین دہانی کرا دے کہ کام اس کی ہمت سے بڑھ کر نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ مَا ارید انْ اَشْقَ عَلَیْکَ سے واضح ہے۔

- ۵۔ آجیر اور اجیر دونوں ایک دوسرے سے اخلاص اور حسن عمل کا یقین دلائیں جیسا کہ شیخ مدین نے مستجد فی انشاء اللہ من الصالحین اور حضرت موسیٰؑ نے واللہ علی ما نقول دیکھ کر یقین دلایا۔ دورِ حاضر میں متقاض کے ساتھ وابستگی اور خلوص کے اظہار کے لیے اسے حلف برداری کا نام دیا جاسکتا ہے۔
- اسی طرح قرآن حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کے باہمی معاملے کو ذکر کیا ہے :

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی اَخْذَ اَتِیْنِ الْاَرْضَ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلَیْکُمْ ۝ (۵۵ : ۱۲)

اس سے یہ موٹی سی بات واضح طور پر مستنبط ہوتی ہے کہ کسی شخص کی تقرری کے وقت بالخصوص ناظم، قائد، نگران، وزیر، سفیر، پروفیشنل مینجر کی تقرری کے موقع پر، اس کی فنی مہارت اور خصوصی صلاحیت کو ہمیشہ نظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں تیار ہو۔ خدا داد صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔

سورہ بقرہ میں طاووت کی بحیثیت سپہ سالار و جرنیل تقرری پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ وہ لینڈ لارڈ اور بینک بلینس رکھنے والے خاندان کا فرد نہیں تو تقرر کرنے والے نبیؐ نے فرمایا :

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَرَآدَا بِسُکْمَہٗ فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ،

(۲۴ : ۲)

مختصر یہ کہ متمول طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں بلکہ تقرری کے وقت کام کی نوعیت کے مطابق اس کی جسمانی اور فنی و علمی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں اور ابو نصر الفارابی نے کتاب اراء اهل المدن فی الفاضلہ میں ایک حکمران اور امام کی جن خصوصیات کا مفصل ذکر کیا ہے ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا مدار یہی آیات کریمہ ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی مجبوری ہے کہ تقرری کے وقت قرآن حکیم اور ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں عمومی طور پر امیدوار کی صالحیت، ملک و ملت سے اس کی وفاداری اور مقصد سے وابستگی کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ یعنی قابلیت (ABILITY) کے ساتھ ساتھ شرافت (NOBILITY) بھی ملحوظ رہے۔

### اجیر کے حقوق

اب ہم شریعت اسلامیہ میں اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ :

۱۔ اجیر کا پلا سق یہ ہے کہ اس سے اجرت اور کام کی نوعیت کا واضح تعین کر دیا جائے (القرآن ۱۲۸، ۲۲۷)

۲۔ اجیر کا دوسرا سق یہ ہے کہ اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔ مقصود یہ ہے کہ اس میں فوری ادائی (PROMPT PAYMENT) کا طریق ملحوظ ہو۔ (مشکاۃ المصابیح طبع دمشق ج ۲ ص ۱۳۱)

۳۔ اجیر کا تیسرا سق یہ ہے کہ خواہ مخواہ سیلوں پہانوں سے کام لیتے ہوئے اس پر مختلف ذمہ داریوں کا تاوان ڈالتے ہوئے اسے اجرت سے محروم نہ کیا جائے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ :

ان تین اشئی سے جن پر خداوند قدوس قیامت کے روز عتاب فرمائیں گے ایک شخص وہ بھی ہوگا جو اجیر سے پورا کام لے اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کرے۔

(إِنَّمَا جَزَاءُ مَنْ سَلَّمَ فِي مِثْلِهِ وَلَمْ يُعْطَ أَجْرَهُ)

(صحیح بخاری، طبع مصر، الجزء الثالث ص ۱۱۸)

۴۔ حضورؐ نے ملوک و ماتحت کو جسمانی ایذا (PHYSICAL TORTURE) سے سختی



سے منع فرمایا۔ صحیح مسلم میں اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں۔

۵۔ حضورؐ نے موجودہ دور کے (SUBSISTENCE WAGES) کے تصور کو بہت

سیدھے پیش فرمایا اور فرمایا:

”اے کھانا اور لباس فراہم کیا جائے۔ اور ان سے وہی کام لیا جائے جس کی وہ استطاعت رکھتے ہوں۔“ صحیح مسلم میں حضورؐ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

لِلْمَسْكُونِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ۔

امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں کھانے اور لباس سے اس کی جملہ ضروریات مراد لی

ہیں۔ وَنِيَّةٌ بِالطَّعَامِ وَالْكِسْوَةِ عَلَى سَائِرِ الْمُسْكُونِ الَّتِي يَحْتَاجُ إِلَيْهَا۔

۶۔ اگر اجیر سے معمول سے زیادہ کام لیا جائے تو اس کی معمول سے زیادہ اعانت کی جائے۔

مثلاً اور ٹائم بولنس۔ انعام وغیرہ کی صورت میں اضافی معاوضہ دیا جائے۔ صحیح بخاری

میں ہے:

فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مَتَا يَأْكُلُ وَلْيَلْبِسْهُ مَتَا يَلْبَسُ وَلَا تَكْفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَفَفْتُمُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَأَعِزُّوهُمْ (صحیح بخاری، طبع مهر، جلد ۳ ص ۱۹۵)

علاوہ ازیں اجیر کو نفع میں بھی شریک کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ اجیر کا یہ بھی حق ہے کہ اسے اضافی معاوضے، منصبی ترقی (PROMOTION) سے

بہرہ ور کیا جائے۔ اور اسے اس کے کام کی نوعیت کے مطابق طبی، رہائشی اور سواری کی

سہولیتیں بھی فراہم کی جائیں۔

۸۔ اجیر سے کام اسے مسلمان بھائی سمجھ کر لیا جائے۔ مزدور سمجھ کر اس سے تحقیر آمیز رویہ

اختیار کر کے اس کے وقار اور عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔

اخلاقیات نبویؐ میں اس ضمن میں متعدد ارشادات ہیں جن میں سے میں نے صرف چند

ایک کا ذکر نمونہ کیا ہے۔

## اجیر کے حقوق

اسلام دین فطرت ہے۔ اعتدال و توازن سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے اس لیے جہاں

اخلاقیات نبوی میں اجیر کے حقوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، وہاں اجیر کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ پناچہ مصلح اعظم نے فرمایا ملاپ کا یہ ارشاد صحیح مسلم میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا نَفَحَ لِرَبِّهِ وَاحْسَنَ عِبَادَةَ اللَّهِ فَلَهُ أَجْرُهُ  
مَرَّتَيْنِ۔

ایک اور ارشاد ہے: لِلْعَبْدِ الْمُسْلُوكِ الْمُصْلِحِ أَجْرَانِ۔

قرآن حکیم اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد عمومی ارشادات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اجیر کو اجیر کا کام پوری محنت و کاوش اور خوش اسلوبی سے انجام دینا چاہیے اور اس کے مالی کو لا پرواہی سے ضائع کرنے یا تغافل و تاہل برتنے سے گریز کرنا چاہیے۔

یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے غالی نہ ہو گا کہ سوشلسٹ نظام میں شدت اور سختی پر مبنی سخت گیر ڈسپلن پایا جاتا ہے تو سرمایہ دارانہ نظام میں اجیر سے کام لینے کے لیے دلام تخرمیں پھیلا دیتا ہے۔ گویا دونوں نظاموں میں محرک و عامل خارج سے عائد کیا جاتا ہے جبکہ اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر۔ نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ سائنس کے نوک سے نہیں بلکہ دونوں پر دستک دیکر اندر کے انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے پناچہ اجیر و اجیر کے تعلقات کے لیے مادی اسلام نے جو عمومی اور اساسی اصول دیے ہیں مثلاً ایمان و ایقان کی شمع روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اخوت، مساوات، تعاون، ایثار، صبر، توکل، عفو و درگزر، ایک دوسرے کی مدد و اعانت، قیامت کے روز جواب دیں۔ یہ اصول باہمی خوشگوار و سازگار رہی پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

### مسلم لیبر کورٹ

اب ایک انتہائی نازک مسئلہ کا ذکر کرتا ہوں کہ یہود کی پھیلائی ہوئی سازش سے جو ان کے پردوں کال کے چھپنے سے منظر عام پر آچکی ہے۔ تحریت اور حقوق کے نام پر اجیر کو ہڑتال اور آج کو تالا بندی پر لگایا گیا ہے۔ یہود کے اکابر کا مقصد یہ تھا کہ ہڑتال ہو یا تالا بندی، غیر یہود اقوام میں اس سے پیداواری صلاحیت یقیناً متاثر ہوگی۔ پناچہ ہرگز گزشتہ دور میں صرف بندہ مزدور کے اوقات کی تلقینوں کا ذکر تھا۔ اب بعض جگہ مزدور نے آجروں کے اوقات تلخ کر رکھے ہیں۔ اور ٹیڈ یونین فٹنم کی تنظیمیں بعض دفعہ جابرانہ

حق منوانے کے بجائے آج کے استحصا ل پر اتر آتی ہیں اور ناجائز مطالبات کی فہرست پیش کر کے یہود کی سازش کی عملی معاونت کرتی ہیں۔ اسلام نے نہ تو آجہو کو اجیر کے استحصا ل کی اجازت دی ہے اور نہ ہی اجیر کو آجہو کے استحصا ل کا حق دیا ہے۔ بلکہ اسلام تو عدل و انصاف پر مبنی رویے کو ا بھارتا ہے، باہمی تعاون اور انصاف پر مبنی یہی رویہ آجہو و اجیر کے تعلقات کو خوشگوار اور ا دہ سا نہ گاہ بنا سکتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر مجدد ضروری ہے کہ اسلام فلاحی انجمنوں کے قیام کی ترغیب دیتا ہے، لیکن کسی کے استحصا ل کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ لہذا آجہو و اجیر کے مابین سنگین پیدا شدہ مسائل اور تنازعوں کو حل کرنے کے لیے، ہادی اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں بہترین صورت ایک مسلم لیبر کورٹ کا قیام ہے جن میں ایسے منصف و قاضی کا تقرر عمل میں لایا جائے جو نہ صرف عادل ہو بلکہ ا بارسے کے معاملات میں پوری طرح مہارت رکھتا ہو۔ اور شریعت کے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اور یہ کورٹ فریقین کے دلائل کو سن کر اعلیٰ اسلامی عدل کی روایات کے مطابق منصفانہ فیصلہ دے۔

میں اپنا مقالہ اس تجویز پر ختم کرتا ہوں کہ آج جب کہ عالم اسلام میں اسلامی نظام حیات کو نافذ کرنے کی مساعی جمیلہ عمل میں لائی جا رہی ہیں ہمیں ملکی سطح پر اور عالم اسلام کی سطح پر علماء، و کلاء اور ماہرین پر مشتمل ایسے تحقیقی بورڈ قائم کرنے چاہئیں جو عصر حاضر کے پیدا کردہ مختلف مسائل پر غور و فکر کر کے اخلاقیات نبوی کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں۔ مجھے کام میں مشکلات اور رکاوٹوں کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن یہ عزم رسولِ عربیؐ کا اسوہ ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہا ہے نہ اور بقول علامہ اقبالؒ

مثیل کلیم ہو اگر معرکہ آندہ ماکوئی ع!  
اب بھی درخت طویر سے آتی ہے باگ لائق

# عدل اجتماعی اور اسلام

جناب محترم مولانا محمد حنیف ندوی

انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کی حکایت شیریں کا تصور انتہائی پُر :  
اور قدیم ہے جتنا کہ ستم و جور کی داستانِ خوں چمکاں کا۔ جب کچھ زیر دستوں نے، قوت و  
اقتدار کے بل پر زیر دستوں کو اپنی حرص و آرزو کا شکار بنایا۔ اُن کی آزادی کو چھینا، اُن کے  
شرفِ انسانی کو مجروح کیا اور چاہا کہ زندگی کی تمام آسائشوں کو اپنے ہی دامنِ طلب  
میں سمیٹ لیں تو، اُس کے ردِ عمل کی صورت میں، زیر دستوں نے عدل و انصاف کی  
دُہائی دی، اور ایسے دستورِ حیات کی ضرورت محسوس کی جس سے استحصال کی زنجیریں  
کٹ جائیں اور ہر انسان نسبتاً آزاد فضا میں سانس لے سکے۔

کم زور اور طاقت ور کی یہ آویزش انسانی تاریخ کے اوراق پر اس طرح پھیلی ہوئی  
ہے کہ آج بھی فکرِ تحقیق سے بہرہ مند حضرات مذاہب و سیر کی کتابوں میں اُس کی جھلکیاں  
پر خوبی دیکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے اس جھگڑے میں پہل اُن بڑوں کی طرف سے ہوئی جو دولت و اقتدار  
کی مسندوں پر قابض رہے اور ہمیشہ اس پوزیشن میں رہے کہ اپنی بالادستی کو دوسروں  
سے منوا سکیں۔

تقویٰ و برتری کے اس نشے میں یہ لوگ اس حقیقت کو بھول گئے کہ زندگی کی  
نشاط آفرینیوں میں سب کا حصہ ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کو  
گرا اور پچھا ڈکرا آگے بڑھے اور تمام وسائلِ حیات پر قابض و مسلط ہو کر بیٹھ جائے۔  
عدل و انصاف کی طرف اُنھی لوگوں نے توجہ دلائی جو زمانے کے ہاتھوں زخم  
رسیدہ تھے اور جن میں شرفِ انسانی کی بازیابی کا جذبہ زندہ اور بیدار تھا، اور جو اس  
شعور سے بہرہ ور تھے کہ انسان کائنات ہی کا جزوِ لاینفک ہے اور کائنات کا پورا نظام  
چوُن کہ توازن و عدل کی کار فرمائیوں پر منحصر ہے اس لیے فردی ہے کہ انسانی معاشرہ  
بھی قدرت کے اس اصول پر استوار ہو۔

عدل و انصاف کی یہ آواز دھیمے ٹنوں میں ہر عہد میں بلند ہوتی رہی اور درد مند دلوں کو متاثر کرتی رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی آواز کی بنا پر مختلف ادوار میں فقر و تقن کے دساتیر مدوّن ہوتے رہے جن میں سچائی، دیانت، انسان دوستی اور عدل و انصاف کی برابر تلقین کی گئی۔ اس لیے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ گزشتہ صدیوں میں جتنے بھی رہبرِ در راہ نما آئے سب نے زبردستوں کے فلسفہ حیات کی تائید کی اور شرائع و قوانین کے ذریعے کھوم بھوم کر انھی لوگوں کی ہم نوائی کی جنہوں نے پہلے سے قوت و اقتدار کی فراوانیوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔

یہ مفروضہ شدتِ احساس کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقتِ حال اس سے بالکل مختلف مختلف ہے۔

کیا آپ نے کنفیو شس کی حکیمانہ تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے؟ محورِ ابی کے قوانین کا جائزہ لیا ہے؟ بدھ کی ہدایات کو دیکھنے کی زحمت فرمائی ہے؟ افلاطون کے مکالمات پر غور کیا ہے؟ اور سب سے آخر میں مادیت و تعصب کی عینک کو اتار کر کبھی آپ نے انبیاء علیہم السلام کے پیغام و دعوت کی رُوح کو جاننے اور اُس میں مذکور اُن تعلیمات کو فکر و نظر کا ہدف بنانے کی کوشش کی ہے جن کا ایک ایک لفظ نہ صرف سچائی دیانت اور رشد و ہدایت پر مبنی ہے بلکہ کھلے بندوں انسان دوستی اور عدل و انصاف کے جذبوں کا آئینہ داس ہے؟

ان مآخذ سے صاف عیاں ہے کہ ہر عہد میں ظلم و تعدی و غرور و استکبار اور دوسری معاشرتی برائیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ قوانین و شرائع کے دھاردوں کو ہم دردی و محبت سے معمور خوش آئند دادیوں کی جانب موڑا جائے اور تفرقہ امتیاز کے اُن فاصلوں کو کم کیا جائے جن کو اختیار و اقتدار یا سرمایہ و دولت کی فراوانیوں نے خواہ مخواہ بڑھا رکھا تھا۔

اس حقیقت سے قطع نظر اس سلسلے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ماضی میں طرح طرح کے ظلم ہوتے رہے۔ اور زبردستوں نے ہر جانب سے زیر دستوں کا عرصہ حیات تنگ کتے رکھا۔ لوگوں سے زمینیں چھینی گئیں۔ آسائشیں ہتھیلی گئیں۔ مارا پیٹا گیا۔ غلام بنایا گیا ہر طرح ذلیل و خوار کیا گیا، لیکن اس پر نہ تو کوئی دل پیچا، نہ کسی آنکھ سے آنسو پٹکا اور نہ کسی حکیم، دانش ور اور پیغمبر کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت ہی نکلا۔

کیا یہ بات ملنے کے لائق ہے کہ ماضی میں دل احساسات سے یک قلم ہی ہو گئے تھے اور دیدہ بینا نے واقعات کی سنگینی کو دائرۂ ادراک میں لانے سے انکار کر دیا تھا؟ اسے یوں کہنا البتہ قرین عقل و صواب ہے کہ ہر دور میں عدل و انصاف کے پہلے مختلف رہے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ گناہ کو ثواب سمجھا گیا اور نا انصافیوں پر انصاف کی چھاپ لگا دی گئی۔

اختلاف کی یہ نوعیت یکسر تعبیر اور اطلاق کے دائرے میں شمار ہوتی ہے جس کا زیادہ تر تعلق ہر دور کے معاشرتی حالات اور تاریخ کی مجبوریوں اور کرداروں سے ہے، چنانچہ تاریخ انسانی میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ آج جو چیز پر پہلی نظر میں ہیں غیر انسانی، ظالمانہ اور عدل و انصاف کے منافی نظر آتی ہیں اُن کو ماضی کے چوکھٹے میں عین عدل و انصاف جان کر اختیار کیا گیا۔

ارسطو کتنا بڑا حکیم تھا اور عقلی اعتبار سے اُس کا دور کس درجہ روشن اور تاب ناک تھا۔ اس کے باوصف غلام اور عورت کے بارے میں اس کی یہ دو ٹوک رائے تھی کہ یہ کسی ہم دردی کے مستحق نہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ عورت، گھوڑا اور غلام صرف چابک کی زبان سمجھتے ہیں۔ افلاطون نے ”ریپبلک“ میں یہ کوشش کی کہ ایسے مضفانہ اور حکیمانہ معاشرے کی تشکیل کی جائے جس میں کوئی اونچ نیچ نہ پائی جائے، اور جس میں زن، زر اور زمین کی وجہ سے ابھرنے والے تمام مفاسد کا اس طرح قلع قمع کر دیا جائے کہ ان چیزوں سے سرے سے کوئی دل چسپی ہی باقی نہ رہے۔ اور اس کی صورت یہ تجویز کی کہ ان تمام چیزوں کو قومی ملکیت کے دائرے میں داخل کر دیا جائے۔ عورت زمین اور تمام پیداواری عناصر کے حصول و استفادہ میں سب شریک ہوں اور کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ رہے۔ تاکہ اُن کی وجہ سے جو نا انصافیاں ہوتی ہیں وہ آپ سے آپ دُور ہو جائیں۔ معاشرتی انصاف کا یہ غالبانہ تصور اُن حالات و ظروف کا قدرتی ردِ عمل تھا۔ جن میں رشوت، استحصال اور اقر پاردری کا مرض یونانی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص ان جرائم کا عادی بن چکا تھا۔ اس پر ارسطو نے جو کڑی تنقید کی، فلسفہ کا ہر طالب علم اس سے آگاہ ہے۔ بگل برٹ (GILBERT) نے عدل و انصاف کے اس حکیمانہ مرقع میں فرد سے جو نا انصافی رد کر رکھی گئی اُس کی نشان دہی ان الفاظ میں کی کہ جس معاشرے میں کوئی شخص کسی بھی

چیز کا مالک نہیں اُس معاشرے میں گویا کوئی مکمل شخص پایا ہی نہیں جاتا۔

اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) کی اصطلاح کا اول اول استعمال ایک صوفی فلسفی سائمن (SIMON) نے کیا، اور اس سے اُس کی مراد یہ تھی کہ سرمایہ کے ارتکاز نے انسانیت کو جو دو مستقل طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں غریب اور زیادہ غریب اور دولت مند اور زیادہ دولت مند ہوتا جا رہا ہے اس کے ازالے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرے میں ابھرنے والی ناہمواریاں دور ہو جائیں اور ہر شخص اپنی محنت اور ذلت، سعی و کوشش کے ثمر سے براہِ راست استفادہ کر سکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرد زندگی کی ضروری آسائشوں سے محروم نہ رہے اور کوئی گروہ یا فرد اس لائق نہ ہو کہ دوسروں کی محنت و عرق ریزی کا استحصال کر سکے اور محض اپنے جیب و داماں کو بھرنے کی خاطر اُس طبقے کو مفلس اور کنگلا کر دے جو اپنی جان کو جو کھوں میں ڈال کر وطن و قوم کے معیارِ زندگی کو بلند کرتا ہے اور تہذیب و تمدن کے چہرہ زیبا کو تابش و ضو عطا کرتا ہے۔ سائمن نے اس غرض کی تکمیل کے لیے یہ سادہ سا اصول وضع کیا کہ اقتصادیات کو اس طرح سے ترتیب دینا چاہیے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے عمل اور مقدرت کے مطابق معاوضہ وصول کر سکے۔ سائمن کے بعد اُس کے شاگرد لی راکس (LE RAUX) نے اسے سوشل ازم کے قالب میں ڈھال دیا جس کا ترجمہ ازراہِ سہل انگاری اشتراکیت کیا جاتا ہے۔ حال آن کہ اس کا صحیح ترجمہ اشتراکیت نہیں اجتماعیت ہے، لیکن یہ ترجمہ چوں کہ چل نکلا ہے اس لیے ہم آئندہ سطور میں اسی کو استعمال کریں گے۔

اجتماعی عدل کی اصطلاح اگرچہ اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے جس کا احساس ہر دور میں رہا اور ہر زمانے میں غربت و محرومی کی شدتوں کو دور کرنے اور آسائش و کشادگی رزق کے امکانات کو بڑھانے کی تدبیریں بہ رُوئے کار لائی گئیں اور اس کے قیام و فروغ پر خصوصیت سے زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ادیانِ سادی میں عدل و انصاف کی قدروں کی تبلیغ کی گئی اور قرآنِ حکیم کے نزدیک تو اس کا رشتہ روحانیت کے اس مقامِ بلند سے جوڑا گیا جسے لفظِ تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

إِعْدِلُوا هُوَ اقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی معاشرہ اُس وقت تک تقریبِ الہی کی سرحدوں کو نہیں چھو سکتا جب تک وہ اجتماعی رشتوں کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم کرنے کی سعی نہیں کرتا۔

یوں تو عدلِ اجتماعی کا دائرہ وسیع تر ہے اور اس میں خاندان، قبیلہ، گروہ، وطن، قوم اور عالمِ انسانیت سمیت زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں جو باہمی تعلقات میں مربوط ہیں، تاہم خصوصیت سے ایک مسئلہ ایسا ہے جس کے حل و کشود کے سلسلے میں آج ہم چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلامی نقطہ نظر سے وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن کو ملحوظ و مرعی رکھنے سے دولت کی منصفانہ تقسیم کو بہ رُوئے کار لایا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اختصار کے ساتھ ہم اسلام کے اقتصادی نظام کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔

## اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے اقتصادی نظام کے خدوخال کیا ہیں، یہ کس طرح دولت کے ارتکاز کو روکتا ہے اور کیوں کر زندگی کی نشاط آفرینیوں کو معاشرے کے تمام افراد پر پھیلاتا اور عام کرتا ہے، ان تفصیلات کو بیان کرنے سے پہلے ہم اسلام کے چند بنیادی اصولوں کو واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) اسلام چوں کہ زندگی کو ایک وحدت اور ٹکل (WHOLE) تصور کرتا ہے اور کسی بھی اشکال کو اُس کے ٹکل اور اُس کے منطقی لوازم سے علاحدہ کر کے دیکھنے کا عادی نہیں، اس بنا پر وہ اقتصادیات کو محض اقتصادیات قرار دے کر اُس کے حل و کشود کی راہیں متعین نہیں کرتا بلکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور ان تمام روحانی و عقائدی لوازم کو ملحوظ و مرعی رکھ کر اُس کے تسلی بخش حل کی جانب تحقیق و تفتیش کے قدم بڑھاتا ہے جن سے اس سلسلے میں کوئی موثر مدد مل سکتی ہے۔

(۲) اس بنا پر اس کے نزدیک زندگی کے تمام گوشوں کو سنوارنے اور سجانے کے لیے از بس ضروری ہے کہ اس ربِّ کائنات پر ایمان لایا جائے جس نے زندگی کے اس دستان کی تخلیق کی ہے۔ اس رُوحِ کائنات سے محبت و شیفتگی کے رشتوں کو استوار کیا جائے اور اس عقیدے کو حُر زباناں بنایا جائے کہ ہمارا ہر عمل اُس کی نگاہِ احتساب کے رُوبہ رُوبہ



ہے۔

(۳) آخرت کے تصور کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اُس کو اس طرح دل کی گہرائیوں میں اتارنا چاہیے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں ایک موقف، ایک اندازِ سلوک اور ایک متعین اسلوب کی شکل میں ڈھل جائے۔ اس تصور سے یقین و اذعان کی یہ کیفیت قلب و ذہن کی لوح پر ابھرنا چاہیے کہ ایک دن حضرت حق کا سامنا کرنا اور اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

(۴) دین کی جڑ اور رُوح کے بارے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا تعلق ناشر و گداز کے اُن احوال سے ہے جو انسان کے باطن میں درد مندی، احسان اور خدمت ایسے جذبات و احساسات لطیفہ کو بیدار کر دیں کہ یہی بیداری دراصل دین ہے اور یہی سچی نیکی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:-

يَسْأَلُكَ رَبُّكَ عَنْ نَفْسِكَ  
وَلَكِنَّ الْإِنْسَانَ كُنُوسًا  
وَالْكِتَابِ وَالْبَيْنِ وَالْأَمَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ  
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي  
الرَّقَابِ ۝

اس کا ترجمہ یہ ہے:

”نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف مُنہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر، اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر، اور پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کو پھڑانے میں خرچ کریں“

ہم کسی خارجی دباؤ اور ظاہری پابندیوں سے کہیں زیادہ موثر و فعال اس باطنی کیفیت کو قرار دیتے ہیں جو ایمانیات سے عبارت ہے، کیوں کہ یہی وہ شے ہے جو دلوں کو بدلتی ہے، اور عمل و کردار میں اخلاص کی رُوح پھونکتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو احساسِ فرض کے داعیوں کو اُکساتی اور بڑے بڑے مقاصد اور منصوبوں کو پر دان چڑھانے کی ضامن ہے۔ نیز یہی وہ حقیقت ہے جو انسانوں کو مجبور کرتی ہے کہ بغیر کیے

”سنئے یہ آپ سے آپ، اپنے کام اور غم کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اپنی مغفہ خدشات کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیں۔ قوانین انصاف اور بیرونی نظام کی حکمرانی صرف جسم کی حد تک وسعت پذیر ہے، دل کی حد تک نہیں، اور جسم کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ پرلے درجے کا حیلہ جو ہے۔ دل کی دنیا میں قاعدے اور قانون کی حکمرانی نہیں چلتی، اس اقلیم میں صرف اللہ ہی کی حکمرانی کا سکہ رواں ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب تک دلوں میں اللہ کی محبت، انسان دوستی اور اندیشہ عاقبت کا جذبہ کارفرمانہ ہو، ممکن ہے کہ لوگوں میں دیانت، احساس فرض، اور ایثار و محبت ایسے لطیف جذبات کو فروغ دیا جاسکے، جن کے ذریعے سے کام سے لگن اور محنت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر نماں خانہ دل میں ایمان کی مشعلیں روشن ہیں تو پھر بغیر کسی محض مادی (INCENTIVE) کے احساس فرض کا وہ داعیہ دلوں میں بیدار ہو جاتا ہے جسے کانٹ (KANT) اصل نیکی قرار دیتا ہے۔

سماجی کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خوارقِ اِبرار دیکھیں کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کے لیے محض رضائے الہی کے حصول کے خاطر اور کسی لگے بندھے فلسفہ معاشیات کو جانے بوجھنے بنا کیا کچھ نہیں کیا۔ انصار نے کس طرح مہاجرین کو اپنے مال و دولت اور کاروبار میں شریک کیا اور کس طرح اُن کے لیے اپنے گھر وں کے دروازے کھول دیے! پھر کیوں کر باہم مل جل کر انھوں نے مواخات اور بھائی چارے کی خوش گوار فضا پیدا کی۔ اور اُس کے نتیجے میں ماں جائے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے غم گسار اور ہمدرد بن گئے۔ یہ صورتِ حال کسی نظام سے زیادہ اُس کیفیت کی رہیں منت تھی جو ایمانیات اور صرف ایمانیات کی یہ دولت معرضِ ظہور میں آتی ہے۔ اور دلوں میں تاثر و گداز کے حسین و جمیل شگوفوں کی پرورش کا اہتمام کرتی ہے۔

صحابہ کے ایثار و ہمدردی کے اُن خوارق کو دیکھیے اور بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کو ملنے بغیر اور اُس سے محبت کیے بنا انسان دوستی کے یہ لطیف جذبات قلب و باطن کی سطح پر کسی صورت میں اُبھر سکتے ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ اسلام لانے سے پہلے یہ چالیس ہزار درہم کے مالک تھے، لیکن ہجرت کے بعد اُن کے پاس پانچ ہزار درہم سے زیادہ اندوختہ نہ تھا۔ اُن کی تمام آمدنی، جو تجارت سے حاصل ہوئی، کم زور اور حاجت مند مسلمانوں پر خرچ ہوتی رہی۔

حضرت عمرؓ ابتدا ہی سے مالدار تھے۔ خیبر میں البتہ تھوڑی سی زمین تھی جس پر اُن کی گزر بسر کا دار و مدار تھا۔ لیکن اس کی آمدنی کو بھی انھوں نے غلاموں اور کم زور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ بے شک غنی تھے، مسندِ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اُن کے جُود و سخا کا یہ عالم تھا کہ ایک ہزار اونٹ اور اُن پر لدا ہوا کھلانے پینے کا سامان، سب مسلمانوں پر بچھا کر دیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مسلمان سخت قحط سے دوچار تھے۔ ان حالات میں اگر حضرت عثمانؓ چاہتے تو اُن کو اس مال کے منہم مانگے دام مل سکتے تھے۔

اسی طبع حضرت علیؓ اور اہل بیت کے ہاں انسان دوستی اور غربا پروری کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے تغذیہ کے لیے صرف تین روٹیاں پاتے تھے اور بسا اوقات ان تین روٹیوں کو بھی حاجت مندوں اور سائلوں میں بانٹ دیتے تھے۔

فیاضی، ایثار اور نوعِ انسانی سے گہری محبت کے یہ عظیم مظاہر اس بنا پر تھے کہ باطن میں موجِ زن اللہ کی محبت کے جذبے نے اُن کے دلوں میں تاثر و گداز کے اُن سچو چشموں کو رواں دواں اور جاری کر دیا تھا جن کے فیوض سے غریب و نادار مسلمانوں کی کشتِ مراد بھی سرسبز و شاداب رہی۔ کہنا یہ ہے کہ کسی معاشی تنظیم سے پہلے یہ ضمانت ضروری ہے کہ معاشرے میں اللہ پر ایمان، ادو اندیشہ عاقبت کے جذبات و عواطف کی پرورش کی جائے، کہ یہی وہ پہلی اینٹ اور اساس ہے جس پر ہماری زندگی کی پوری عمارت استوار ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اقتصادیات کے دائرہ بحث میں ایک معاکس یاد دہری مشکل (DILEMMA) یہ رونما ہے کہ اگر حصولِ سرمایہ پر کوئی قدغن عائد نہ کی جائے اور کار بار کو حریتِ تصرف (Laissez Faire) کے اصول کے مطابق بغیر کسی روک ٹوک کے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو اُس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار سرمایہ گھوم پھر کر چند ہاتھوں میں مرکز ہو کر رہ جاتا ہے، جس سے طرح طرح کی اجتماعی بُرائیاں اور مفسدے اُبھرتے ہیں اور معاشرہ امیر و غریب کے دو حریفانہ کیمپوں میں بٹ جانے کی وجہ سے مستقل طبقاتی آویزش اور گردہ پی اختلافات کا ہدف بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر

اس کے برعکس سرمائے کو انفرادی ملکیت کی تنگ نائے سے نکال کر قومی ملکیت کے وسیع تر قبضے میں دے دیا جائے تو اس سے نہ صرف وہ ذاتی محض (INCENTIVE) ختم ہو جاتا ہے جو افراد کو ملت کے معاشی مفادات کے پیش نظر محنت اور سخت کوشی پر ابھار سکتا ہے بلکہ اس سے فرد اپنے عمرانی تشخص ہی کو کھو بیٹھتا ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنے معاشرے میں اپنی زمین کا مالک نہیں، اپنے گھر کا مالک نہیں، پیداواری ذرائع سے استفادے کا حجاز نہیں اور اپنے ہی سرمائے کو اپنے مقصد کے ماتحت خرچ نہیں کر سکتا تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں اُس کا سرے سے کوئی ردل ہی نہیں، اور وہ محض جان دار اور ذی شعور گوشت پوست کا ایک کل پُرزہ ہے جو اجتماعی مشین میں فٹ کر دیا گیا ہے! اسے یہ حق نہیں کہ خود اپنے لیے اور اپنے خاندان اور اپنے بال بچوں کے لیے راحت و آسائش کا کوئی بندوبست کر سکے۔

اس ناکسید دہری مصیبت سے بچ نکلنے کی ایک ہی راہ ہے جسے ہم بچ کی راہ کہہ سکتے ہیں، اور وہ راہ وہ ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے، یعنی اقتصادیات میں نہ تو سرمایہ دار کو کھلی چھٹی دی جائے کہ وہ صبح و مساپنی تجوریاں بھرتا رہے اور دولت کے ڈھیر اور انبار جمع کرتا رہے جب کہ ملک کے عوام افلاس اور جمالت ایسے جاں گسل مصائب سے دوچار ہوں اور نہ ذرائع پیداوار کو کلیتاً یور و کریسی اور ہشیت حاکم کو اس طرح سپرد کر دیا جائے کہ وہ حاکم مطلق کے رُودپ میں بنی نوع انسان کے مقدر سے کھیلنے لگیں جو اس کے نتیجے میں مفلس اور بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔

قرآن حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ مارکس اور انقلاب فرانس سے صدیوں پہلے، یہ کتاب ہدیٰ ارتکازِ دولت کے اس خطرے سے یہ کہہ کر نوعِ انسانی کو متنبہ کرتی ہے کہ زرمار کبھی دولت و سرمایہ کو معاشرے کے کسی طبقے میں مرکوز نہ ہونے دینا۔

کَيَّ لَا يَكُونُ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

”تاکہ مال اُن لوگوں کے ہاتھ میں گردش نہ کرتا رہے جو تم میں دولت مند ہیں“

مال و دولت کو خون کی طرح، جسمِ اجتماعی کی ہر رگ و پے میں جاری و ساری رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن جائز تجارت، دیانت دارانہ کاربار، اور اسلام کے حدودِ اخلاق کے اندر رہ کر ازدیادِ سرمایہ کی کوششوں کو سراہتا ہے۔

## وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ

”پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو“

یہ تو اصول ہوا، اسلام نے دونوں نقطہ ہائے نظر میں تطبیق دینے، باہم توازن و توافق پیدا کرنے اور افراط و تفریط کے مابین اُس درمیانی راہ کو اختیار کرنے کی تلقین کی جس پر چلنے سے نہ فرد کی نشاطِ آفرینیوں پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ سرمایہ چند ہاتھوں میں سکڑتا اور سمٹتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں اسلام نے وہ کیا تدابیر اختیار کیں جن کو اپنانے اور معاشرے میں سمونے سے ہم دو گونہ خطرات سے نہ صرف بچ سکیں بلکہ کامیاب ہوتے ہیں بلکہ ایک صحت مند، ترقی یافتہ اور معتدل معاشرے کی تعمیر بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تدابیر یہ ہیں۔

(۱) سود کی حرمت کا دوا لوگ اعلان۔

(۲) احتکار یا ذخیرہ اندوزی کی ممانعت۔

(۳) باطل اور ناجائز ذرائع آمدنی کا سدباب۔

(۴) اصولِ دراشت کی تلقین۔

(۵) ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی۔

(۶) زکوٰۃ اور تبرعات کی تنظیم۔

(۷) عمل اور جدوجہد کی تقدیس و احترام۔

(۸) اقتصادیات کی اس نہج پر تنظیم و تشکیل کہ جس سے فلاحی مملکت کے نقوش معاشرے کے کینوس پر نمایاں اور صاف طور سے نظر آنے لگیں۔

یہاں چند نکتوں کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی سے مقصود یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے فرد کو معاشرے میں اپنا مقام اور تشخص متعین کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اُس کی ملکیت کے دائرے اتنے نہ پھیل جائیں کہ اس سے ملت کے اجتماعی مفادات خطرے میں پڑ جائیں۔

زکوٰۃ و صدقات کا نظام اُس مکمل اقتصادی نظام کے مترادف نہیں جس کے نفاذ سے فوراً فلاحی مملکت معرضِ ظہور میں آجائے۔ اس نظام کے خدوخال کو ابھی اور نکھارنا، اور واضح کرنا ہے اور محمولہ بالا اصولوں کی روشنی میں ابھی ترتیب دینا ہے۔

صدقات، تبرعات اور زکوٰۃ کی حیثیت محض اشارہ نما (POINTER) کی ہے۔ جس سے اسلامی نظام کی جہت اور رخ کا تعین ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے نفاذ سے ہم بہ تدبیر سخا و جود کی اُس منزل تک پہنچ جائیں جہاں کوئی شخص مستحق زکوٰۃ نہ رہے، کوئی سائل اور مانگنے والا نہ رہے اور کوئی ایسا نہ ہو جسے اپنے مستقبل کی فکر و تشویش لاحق ہو۔

فلاحی مملکت سے ہماری مراد ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں ہر شخص کو مناسب ٹھکانا ملے، مناسب غذا ملے، اور جس میں ایسے حالات و ظروف کی کار فرمائی ہو کہ روزگار، صحت اور تعلیم کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوں۔ یہی نہیں ہر شخص کو ایسی فراغت حاصل ہو کہ وہ اپنے علمی اور روحانی افاق کو چمکاسکے اور بہ حیثیت انسان کے اپنے تمام مضمرات ارتقا کو تا بہ حد امکان کمال تک پہنچا سکے۔

عمل کی تقدیس کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے کو شرعاً اس بات کا مکلف گردانے کے اُسے کام کرنا اور ملی دولت میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

”اور انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔“

گویا سچی، محنت اور حتی المقدور لگ دو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی و کام رانی کی راہ پر گام فرما نہیں ہو سکتا۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے نہ صرف کوئی بھی پیشہ بُرا نہیں بلکہ ایک طرح کی تقدیس و احترام کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اکابر اہل علم میں بہت سے قابلِ صدا احترام حضرات ایسے ہیں جو اپنے جہل و فک کی طرف منسوب ہوئے۔ امام ابو حنیفہؒ بڑا بڑا کولائے، احمد بن محمدؒ خداف کے لقب سے ملقب ہوئے جس کے معنی جو تاں گناہ تھے دے کے ہوئے تھے۔ اسی عمر بنی ایک، قتال، جصاص، صفار، الصیدلانی، دقاق، صابونی اور حلوانی ایسے نام اس بات پر دلالت کرتا ہیں کہ اسلامی معاشرے میں ان تمام جہتوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

یہ نفسِ مضمون کا سرسری جائزہ تھا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اگلے اگلے فکر، علمائے کرام اور قانون دان حضرات کمین سر جو کر بیٹھیں اور اقتصادیات اسلامی کو اس طرح نکھار کر تفصیل سے پیش کریں کہ یہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات میسر اقتصادی نظام ثابت ہو۔ آمین

# اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات

جناب محترم قاضی مجیب الرحمن

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هُوَ الَّذِي يَعَثُّ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَهُوَ كَاذِبٌ مَنْ قَبْلُ لَعْنُ ضَلَالٍ مُبِينٍ وَ الْآخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْمُحْكِمُ ه ذلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ه (المع ۲-۴)

ترجمہ ۱ وہی (اللہ تعالیٰ) تو ہے جس نے اُمی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو آیات الہیہ پڑھ کر سنانا ہے، اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ دراصل ایک یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے، اور دوسروں کے لیے بھی ان میں سے آپ کو بھیجا ہوا بھی ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ (اللہ تعالیٰ) بڑا نہ بر دست ہے حکمت والا ہے اور یہ رسالت و فرائض رسالت الہی نہیں بلکہ فضل الہی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ان آیات کریمہ سے بعثت محمدی کے مقاصد اربعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائض منصبی پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام قاصد و مبلغ کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آیات الہیہ کی تلاوت اور کلام الہی کا بلا کم و کاست ٹھیک ٹھیک پہنچانا تھا۔

ب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام مڑکی اور مُصَلِّح کی حیثیت سے لوگوں کے قلوب و اذنان کو غفائید باطلہ اور ان کے نفوس و اجسام کو اخلاقِ ذمیمہ سے پاک کرنا تھا۔

ج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا کام معلم و مدرس کی حیثیت سے کتابِ الہی کی تفسیر، تشریح، ترجمانی اور عملی تفہیم کا فرض ادا کرنا تھا۔

د۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام مرشد و متقین کی حیثیت سے لوگوں کو حکمت و دانائی کی تلقین کرنا تھا۔ احکام و مسائلِ دین کے قاعدے اور آداب، عوام و خواص سب کو سکھانے تھے اور خواص کی رہنمائی، اسرارِ شریعت، آدابِ طریقت اور رموزِ مملکت میں فرمائی تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیائے بشری میں اخلاقی انحطاط، حیوانی ہوس رانی اور بے بسی تعیش کا البیاض بہرہ دست سیلاب آیا تھا جس نے نوعِ انسانی کے جملہ اعلیٰ اقدار و بلند محاسن کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر اجتماع و معاشرت کی عمارت کو متزلزل کر دیا تھا۔ ایرانی، رومی، برہمنی، کلیسائی اور یہودی اور دیگر مروجہ مکتبہ تعلیم و تربیت اور اصولی تمدن و معاشرت میں آسمانی ہدایت و روشنی اور انبیاء کی عملی سیرتوں کے نمونے یا تو کُلّی طور پر مفقود تھے اور یا ان میں کتمان، تحریف اور حق فروشی کی وجہ سے انسانی افکار و خیالات اور حیوانی طرق و تدابیر کا اضافہ کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں دوسرے زمین پر کسی قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام اور نبی و سنت کی عملی سیرت اپنی اصل الہامی شکل و صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس مزورج و مرکب علم پر چند افراد یا خاندانوں اور طبقوں کا قبضہ ہو گیا اور ناقابلِ شکست اجارہ داری تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت جمل و نادانی اور ناخواندگی کی شکار ہو چکیوں کی سہی زندگی بسر کر رہی تھی۔

روم میں عیسائی تسلط کے بعد علم اور اہل علم پر جو تباہی گزری وہ تاریخِ انسانی کا انتہائی بدناما حصہ ہے۔ دین کے نام پر علمی بات کو غیر مسیحی قرار دیکر فنا کر دیا گیا۔ مجالسِ تفتیش و احتساب قائم ہوئیں اور جس شخص پر بھی اہل علم ہونے کا الزام لگتا وہ جو رداستہ دہی ہو چکی میں پس جاتا۔ محکمہ احتساب نے لاکھوں آدمیوں کو سزائیں دیں جن میں سے ۳۲ ہزار صرف وہ بد نصیب تھے جنہیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔



یہودیوں میں اجبار و رہبان (علماء اور مذہبی پیشواؤں) نے علم پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور عوام کو "اُمتی" قرار دیکر تعلیم و تعلم کو ان کے لیے شجرِ منہجہ قرار دیدیا گیا تھا۔

ہندوستان میں علم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔ شہودوں کے لیے علم یہ تھا کہ وہ راستہ چلتے ہوئے لکڑی سے ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتے ہوئے بائیں تاکہ اگر کوئی برہمن دیدی کہ تعلیم میں مصروف ہو تو وہ خاموش ہو جائے ورنہ اگر لکڑی شہود دیدی کہ آواز سن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام سے پہلے علم پر مخصوص طبقوں کی اجارہ داری قائم تھی اور مٹھی بھر لوگ علم کے ذریعے اپنی برتری قائم کر کے اسے عام لوگوں کے استحصال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔

## ۱۔ اسلام دینِ علم

تاریخِ عالم میں اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور جہاں پہنچا وہاں سے جمالت کے اندھیرے بھاگ اٹھے اور علم و حکمت کے قمقمے روشن ہو گئے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی علم اور اسلام کے ربط کو بہت اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝  
اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَكَ بِالنَّقْلِ ۝

ترجمہ : پڑھیے اپنے پروردگار کا نام جس نے تمہیں پیداکیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیداکیا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے تم کو علم کے ذریعے سے تعلیم دی ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا اولین نازل شدہ لفظ "اقْرَأْ" (پڑھیے) ہے۔ اور اسی اولین وحی میں تعلیم بالقلم کو رب کریم کی بہت بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ بات واضح کر دی گئی کہ اس دینِ مبین میں جمالت اور ادبام کی کوئی گنگناش نہیں۔ اس کی بنیاد قرأت اور تعلیم بالقلم (پڑھنے اور لکھنے) پر ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ نے انسانوں کے لیے جو علمی ورثہ محفوظ رکھا ہے

وہ انہی دو بنیادی ذرائع تعلیم کا مہیون منت ہے ۔  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معلم کتاب و حکمت بنا کر بھیجا۔ آپ نے اپنی  
 اولین توجہ اشاعت علم پر دی جس کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کے صومرا میں  
 بکھرے ہوئے ہخامنشیانہ جنگیوں میں مصروف بدو علم و حکمت کے پاسبان اور حصول علم کے  
 لیے مرجع الخلائق بن گئے ۔

غیر مسلم مؤرخین اس بات پر حیران ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو خود اقامتی تھے،  
 کس طرح ایسی اور اتنی زبردست علمی تحریک کے محرک ثابت ہوئے جس کی بدولت دنیا  
 سبھ کا علمی خزانہ ایک صدی سے بھی کم عرصے میں عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر  
 صدیوں تک دنیا اسلام کی پھیلائی ہوئی علمی روشنی سے منور رہی ۔ درحقیقت یہ حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ معجزہ تھا ۔

علم کی اشاعت اور اس پر سے اجارہ داری ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے  
 دنیا کو جن زرتیں اصولوں سے روشناس کیا ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱۔ تعلیم و تعلیم کی ترغیب اور جہالت کی مذمت :۔  
 قرآن پاک کی متعدد آیات علم اور علما کی فضیلت اور جہالت کی مذمت میں وارد  
 ہیں ۔ سورہ زمر میں فرمایا گیا ہے :

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ  
 آپ کہہ دیجیے (یا محمد) کیا اہل علم اور جاہل (بھی) سب برابر ہو سکتے ہیں۔

سورہ مجادلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :  
 يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مَلَكُوهُ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ دَرَجَاتٍ ط  
 ترجمہ : اللہ تم میں ایمان والوں اور ان لوگوں کے جن کو علم ملے ہے ، درجے بلند  
 کرے گا ۔

اسی طرح احادیث نبوی کا ایک بڑا ذخیرہ علم کی ترغیب اور فضائل پر مشتمل ہے یہ ترغیبات  
 لوگوں میں علم کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے کا کامیاب ترین ذریعہ ہیں ۔

## ۲۔ علمی اجارہ داری کا خاتمہ

اسلام میں برہمن ، پادری یا کسی اور شکل میں علمی اور مذہبی اجارہ داری کا کوئی تصور

نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے لیے علم کا راستہ کھلا ہے۔ علم حاصل کر کے وہ خلقِ خدا کی خدمت کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے مال و دولت کی طرح علمی ذخیرہ اندوزی پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اور فرمایا:

إِنَّا الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ  
بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكُتُبِ ۚ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ  
وَيَلْعَنُهُمُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ ۝

ترجمہ: بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اس پیڑ کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں نام ل کر چکے ہیں۔ بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتاب (الہی) میں واضح کر چکے ہیں۔ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے۔ اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ عَنْ عِلْمٍ عَلَيْهِ ثُمَّ كَتَمَهُ أُجِمَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ  
بِإِجَامٍ مِّنْ نَّاسٍ

ترجمہ: جس شخص سے کسی ایسی بات کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہو، اور پھر وہ نہ بتائے۔ قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

گویا اسلام نے علم حاصل کرنے والوں پر یہ بھی لازم کر دیا کہ وہ علم کو مخلوق خدا کی امانت سمجھتے ہوئے اسے دوسروں کو پہنچائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ:

بُذِّخُوا عَنِّي ذِكْوَايَةَ -

ترجمہ: میری طرف سے پہنچا دو خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

اس طرح علم کے معاملے میں رنگ و نسل، عمر اور جنس کی قیود کو بھی ختم کر دیا۔ اور غلام، آزاد، گورے، کالے، مرد و عورت سب کے لئے علم ضروری قرار دیا۔

## ۱۔ غلاموں کی تعلیم

اسلام نے اولین کوشش تو یہ کی کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا

غلام نہ رہے۔ یہ ایں ہمہ جو لوگ اس زمانے میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے انہیں بھی زیرِ علم سے محروم نہیں رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ گورنر مکہ سے پوچھا کہ تم نے جنگلات کا افسر کسے مقرر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا ابن ابزری کو جو ایک غلام تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غلام کو امیر اور افسر مقرر کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ ”وہ کتاب اللہ کا عالم ہے۔“ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام اور خادم عکرمہؓ کی ایسی تعلیم و تربیت فرمائی کہ وہ بعد میں ”سبر الامۃ“ (امت کا عالم) کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

## ب۔ بچوں کی تعلیم

اسلام نے ماں باپ پر اولاد کے جو حقوق عائد کیے ہیں ان میں بہترین تعلیم و تربیت کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ جنگ بدر میں کفار کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے جبراً نہ یا بیگناہ لینے کے بجائے انھیں دس دس بچوں کو کتابت سکھانے پر مامور کر دیا گیا۔ مساجد میں بچوں کی تعلیم کا انتظام ایک لازمی چیز تھی۔ علامہ ذہبی طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ کے حلقہٴ درس میں سینکڑوں طلبہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ حاضری لی تو سولہ سو کے قریب تھے۔ آپ دس دس طلبہ کی جماعتیں بنا کر ایک ایک استاد کے سپرد کر دیتے اور خود مسجد میں بیٹھتے ہوئے ان کی آوازوں پر کان لگائے رکھتے۔ قرأت و کتابت کے علاوہ بچوں کو شمشواری اور پیراکی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بعد میں اموی اور عباسی خلفاء کے عہد میں عصری تقاضوں کے تحت حساب، جغرافیہ اور دیگر علوم بھی نصاب میں شامل کر دیے گئے۔

## ج۔ تعلیم نسواں

چھوٹی بچیوں کے بے گھر یا بے گھر سے قائم کیے گئے۔ حضرت عائشہؓ کا گھر انہی مدارس میں سے ایک تھا۔

بڑی عمر کی عورتوں کی تعلیم و تربیت گھر کے مردوں کے ذمہ تھی۔ قرآن کریم نے عورتوں کو اپنے گھر کے مردوں سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ

باری تعالیٰ ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (الاحزاب)  
ترجمہ: ”اور تم اللہ کی ان آیتوں اور حکمت کی باتوں کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں  
میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔“

مردوں کے ذمے اپنے گھر کی عورتوں بلکہ خادماؤں اور کنیزوں تک کی تعلیم و  
تربیت کا کام لگایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے لوگوں کے لیے دوسرے  
اہل کی خوشخبری دی ہے۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو اپنی کنیز کی تعلیم و تربیت  
کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَمَا جُلُّكَانَتْ عِنْدَ أُمَةٍ فَأَدَّبَهَا حَسَنًا تَأْدِيبَهَا وَ  
عَلَّمَهَا حَسَنًا تَعْلِيمَهَا ثُمَّ رَأَتْهَا فَتَزَوَّجَهَا فَهُوَ  
أَجْرَانِ - (صحیح بخاری کتاب العلم)

ترجمہ: (اور ان میں سے) ایک شخص وہ ہے جس کے پاس کنیز ہو پھر اسے  
اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے اور پھر اسے آزاد کر کے اپنے  
نکاح میں لے آئے۔ اس کے لیے بھی (دوسرا) اجر ہے۔

اس کے علاوہ بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تعلیم کے لیے  
خاص دن مقرر فرمایا کرتے تھے۔

## د۔ تعلیم بالغان

جو لوگ بچپن میں تعلیم و تعلم سے بے بہرہ رہ جائیں ان کو بھی اسلام نے علم سے  
محروم رہنے نہیں دیا۔ حضور کا ارشاد ہے:

أَطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ إِلَى التَّحَدُّ -

ترجمہ: پنگھوڑے (بچپن) سے لے کر لحد (موت) تک علم طلب کرتے رہو۔

ہجرت کے بعد حضور نے مسجد نبوی میں ایک مکتب قائم کر دیا تھا۔ جسے ”صفہ“  
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جہاں اطراف ملک سے مشتاقانِ علم آکر  
مقیم ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معلم تھے۔ یہ لوگ محنت و مزدوری  
کر کے روزی کماتے اور پھر زیادہ وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارتے۔

ان میں ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ یہ گویا اسلام کی پہلی اتامتی یونیورسٹی تھی۔ جو لوگ روزمرہ کی ضروریات یا دور رہائش کے سبب زیادہ دقت حضورؐ کی خدمت میں نہیں رہ سکتے تھے وہ بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو مدینہ منورہ سے باہر ایک گاؤں میں رہتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے ایک انصاری ساتھی سے علی کہہ باری مقرر کر دی تھی۔ ایک دن ایک ساتھی حاضر ہوتا اور جو کچھ سیکھتا جا کر اپنے ساتھی کے ساتھ گاؤں میں مذاکرہ کر لیتا، دوسرے دن دوسرا ساتھی اسی طرح کرتا۔ (بخاری کتاب العلم)

اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیرونی قبائل کی درخواست پر اساتذہ اور مبلغین روانہ فرمایا کرتے تھے جو کھیتوں، جھروں اور بازاروں میں جا کر لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے۔

### ۳۔ مفت تعلیم

اسلام نے تعلیم و تعلم کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹوں کو ختم کرنے پر زور دیا، خاص طور پر مالی مشکلات کو اس راستے میں آڑے آنے نہیں دیا اور تعلیم کو مفت قرار دیا تاکہ علم صرف اصحاب ثروت میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے اس علیٰ تیج کی سخت مذمت کی ہے کہ انہوں نے علم دین کو کسب زر کا ذریعہ بنالیا تھا۔ قرآن مجید نے اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ -

ترجمہ: میں اس (تعلیم و ارشاد) کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے سے سختی سے منع فرمایا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کو قرآن مجید کا کچھ حصہ سکھایا۔ اس نے خوش ہو کر انھیں ایک کمان دیدی۔ جب حضرت عبادہؓ نے اس بارے میں حضورؐ سے پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا:

”اگر تو یہ پسند کرتا ہے کہ تیرے گلے میں آگ کی ایک کمان ڈال دی جائے تو تو یہ قبول کر لے۔“

پس انھوں نے کمان واپس کر دی۔

یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ اور بعد کی اسلامی حکومتوں میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی اساتذہ کا تنخواہیں اور طلباء کی حوصلہ افزائی اور مالی امداد کے لیے وظائف بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام سرکاری حکام کو یہ حکم دیا تھا کہ جو لوگ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں ان کے لیے وظائف مقرر کر دیے جائیں اساتذہ کی اعلا تنخواہیں، تحقیقی اور علمی کام کرنے والے علماء کے لیے انعامات اور مدارس کے جملہ اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔

## ۴۔ لازمی تعلیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :  
لَا تَخَيَّرُ فِي مَنْ كَانَ مِنْ أُمَّتِي لَيْسَ بِعَالِمٍ وَلَا مُتَعَلِّمٍ  
ترجمہ: میری امت کے اس شخص سے خیر (کی کوئی توقع) نہیں جو عالم یا طالب علم نہ ہو۔ یعنی یا تو خود سیکھے یا اوروں کو سکھائے۔

یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ ہی کے دور میں ہر شخص کو کسی نہ کسی طرح تعلیمی نظام سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ عام شہروں اور قریبی قبائل میں تعلیم و تعلم کا پورا پورا چل چلا تھا۔ البتہ خانہ بدوش بدو تعلیم سے احتراز کرتے تھے۔ چنانچہ خلافت فاروقی میں ایک کبیٹی البوسفیانی نامی ایک شخص کی سربراہی میں اس غرض سے قائم کی گئی کہ وہ مختلف علاقوں کا دورہ کر کے تعلیمی معیار کا جائزہ لے تاکہ لوگ تعلیم سے احتراز کریں تو انہیں سزا دی جائے۔ اسی طرح عام شہریوں کے لیے ضروری تھا کہ ہر شخص کم از کم سورۃ بقرہ، سورۃ مائدہ اور سورۃ نور لازمی طور پر سیکھے اس لیے کہ ان سورتوں میں بد مذمہ زندگی کے لیے احکام و فرائض مذکور ہیں۔ اس طرح اسلام نے ہر شہری کی لازمی تعلیم کا بندوبست حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کر دیا۔

## ۵۔ سعادت دارین پر مشتمل جامع تعلیم

اسلام میں دین و دنیا کی تفریق کا کوئی تصور نہیں اگر اس دنیا کو آخرت کی کھیتی

اور آخرت کو دنیا کا متمتع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان علوم و فنون کی طرف بھی رہنمائی کی ہے جو انسان کی ارتقاء اور معاشرے کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔  
قرآن مجید نے زمین و آسمان اور اس میں موجودہ مخلوقات کا انداز و پائوں پائوں اور بارش کے نظام میں غور و فکر کی دعوت دے کر فکر و نظر اور بحث و تحقیق کے دروازے کھول دیے۔ اور واضح کر دیا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عبادت یا سرگھکانے کے لائق نہیں، بلکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے استعمال و استفادے کے لیے مسخر کر دی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

مَسْخَرٌ لَّكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ زمین کی پیداوار کے بارے میں فرمایا:  
فَاَنْزَلْنٰهَا مِنْهَا حَيٰٓةً ۙ وَغَنَبًا ۙ وَزَيْتٰوْنَ ۙ وَنَخْلًا ۙ  
وَّرَحًا ۙ اَلَيْسَ غُلْبًا ۙ وَفَاكِهَةً ۙ وَآبًا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ  
فَلَا تَعْمٰكُمْ ۝ (عبس)

ترجمہ: اور ہم نے اگایا اس (زمین) میں اناج اور انگور اور تڑکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور میوے اور چارے تمہارے اور تمہارے موشیوں کے فائدہ کے لیے۔

جانوروں اور چوپایوں کے بارے میں فرمایا:  
وَالْاَنْعَامَ خَلَقْنٰكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ مِّنْهَا  
تَاْكُلُوْنَ ۝ ٥

ترجمہ: اور چوپائے بھی (اسی اللہ نے) بنائے، ان میں تمہارے لیے گرم لباس ہے۔ اور اور بھی فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی اہو۔  
سمندروں میں جہاز رانی، مچھلیوں اور معاون کے حصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِيَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا ۚ وَتَسْتَخْرِجُوْا  
مِنْهُ حَبْلًا ۙ تَبْسُوْتُوهَا ۚ وَتَمْرِيْ الْفُلُكُ مَوَازِيْنًا ۚ  
وَلِيَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (يٰٓسٰٓ)

ترجمہ: اور وہی اللہ ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے زبور لکالوجی سے تم پہنچتے ہو اور تو



کشتیاں دیکھتا ہے کہ اس میں پانی پیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرتے رہو۔

زمین کے اندر چھپے ہوئے معدنیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

وَأَنْزَلْنَا الْحَبْدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ترجمہ : اور ہم نے لوہے کو نازل کیا کہ اس کے اندر شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے (اور بھی) فائدے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک سے ہدایت و روشنی پا کر اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو انسانی معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کیا، اور ہر شعبہ سیات میں نہایت آزادی کے ساتھ نئے تجربات کیے اور نئے نئے علوم و فنون کی بنیادیں رکھیں جن کی بدولت ایک زبردست اور عظیم الشان تمدن وجود میں آیا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کے پاس موجود علم و حکمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا :

الْحِكْمَةُ ضَالَّةٌ الْمُؤْمِنُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا حَيْثُ وَجَدَهَا

ترجمہ : دانائی کی بات مومن کی گمشدہ چیز ہے وہ اسے جہاں بھی پائے اس کا زیادہ مستحق ہے۔

نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیگر اقوام کی زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضور کے حکم پر سریانی زبان سیکھی تھی۔

اسی بنا پر مسلمانوں نے سابقہ اقوام کے علمی ذخیروں کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور ان تہذیبوں کے تمام اچھے اجزاء کو بچوڑ کر اپنی عملی زندگی میں ان سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کو ترقی دیکر کمال تک پہنچا دیا۔ مسلمانوں نے یونانیوں سے فلسفہ و طب اور ہندوستان سے ریاضی و ہندسہ کے مبادی حاصل کیے اور پھر ان میں اتنے اضافے کیے کہ ہر علم کی کئی شاخوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شاخ میں لاتعداد تصانیف اور انکشافات کیے۔ یہاں تک کہ بغداد اور قرطبہ دنیا کے علمی مراکز کی شکل اختیار کر گئے۔ اسلامی دین نے تھوڑے عرصے میں طب، کیمیا، جغرافیہ، فلسفہ، ہیئت، فلکیات اور دیگر

علوم میں عالمی شہرت کے فائزاد سائنسدان اور محقق پیدا کیے۔ جن میں سے ہر ایک کے کاغذیہ ایجادات اور تصانیف آج بھی تاریخ انسانی کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔

## بامقصد علم

اسلام کے نزدیک علم معرفتِ خداوندی اور انسانی اخلاق و اعمال کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ ایسا علم جو ان فوائد سے خالی ہو اسلام کی نظر میں جہالت کے برابر ہے۔ قرآن کریم میں علم بلا عمل کی مثال یوں دی گئی ہے :

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ لَا يَتْلَوْنَهَا إِلَّا نَجْمًا مُجْتَمِعًا وَمَا يَفْقَهُونَ إِلَّا الْحَبَاثَةَ يُحْمِلُ مِنْهُ أَمْعَافًا (سورة جمعہ)

ترجمہ: جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو۔ واضح ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بے فائدہ علم سے پناہ مانگتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے :

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ

ترجمہ: جو علم فائدہ نہ دے اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر دلوں کو خشیتِ الہی اور تقویٰ کے جذبات سے معمور کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً پہاڑوں کی مختلف اقسام اور جانداروں کے بعض عجائبات بیان کرنے کے فوراً بعد فرمایا :

إِنَّمَا يُخَشِّئُ اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءَ

ترجمہ: خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

اسی طرح لوہے کے فوائد کا ذکر کرنے کے بعد بتایا کہ اس نعمت کو حق کی سرمدی کے لیے استعمال کرنا چاہیے :

وَأَرْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنِ يَنْصُرُ وَلَا دُرُسُكَ بِالْغَيْبِ (حدید ۲۵)

ترجمہ: اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے۔ اور لوگوں کے لیے اور بھی طرح طرح کے فوائد ہیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ بغیر دیکھ کون اللہ اور

اس کے رسولوں (رکے دین) کی مدد کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی علمی تحریک ہمیشہ دین کے پُر رحمت سائے تلے پروان پر ہوتی رہی اور اسے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے تحت علم حاصل کرنے والے شخص کے ذہن میں یہ بات ہر وقت مستحضر رہتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ذہنی اور مادی قوتوں کو اس کی رضا جوئی اور آخرت کی کامیابی کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ایسے شخص کی کوشش و کادش یقیناً نفعِ نوعِ انسان کے لیے خیر و برکت کا باعث بنے گی۔

بعثتِ نبوی کے بعد دنیا دوسرائی دوروں سے متعارف ہوئی۔ پہلا دور عباسی خلافت سے وابستہ تھا جبکہ دوسرے دور کا تعلق یورپ کے عروج سے ہے۔ تاہم جب ہم مجموعی طور پر پہلے دور کے علمی کارناموں اور سائنسی ایجادات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مثبت اور افادہ پسند کا واضح غلبہ نظر آتا ہے جبکہ دوسرے دور کی تحقیقات و انکشافات زندگی کی بے شمار سہولیات کے ساتھ ساتھ لاتعداد مسائل اور پیچیدگیوں کا سبب بھی بنی ہیں۔

وجہ صاف ظاہر ہے کہ دوسرے دور کی باگیں ان ہاتھوں میں تھیں جو شاہراہِ حیات پر دوڑتا تو جلتے تھے لیکن منزلی سے بے خبر تھے۔ ان کے ہاں تعلیم و تعلم کے اغراض و مقاصد متعین نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی اداروں کی دن رات کی محنت اور انسانوں کی دماغ سوزی کا نتیجہ خود غرضی، خطرناک سازشوں، نہریلے پروپیگنڈوں، مسلک ہتھیاروں اور انسانی اقدار کی رسوائی کی شکل میں برآمد ہو رہا ہے۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ انسانوں کے لیے وہی تعلیمِ نجات و فلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے جس کی بنیاد ظن و تخمین اور ناقص انسانی افکار کے بجائے وحی الہی کے یقینی اور روشن ماخذ پر ہو۔ اور جو شک و اوہام اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔

اس میدان میں آپ اسلامی نظامِ تعلیم ہی کو کمیتا و منفرد پائیں گے۔ جس کی بنیاد قرآن و کرم ہے اور جس کی تعریف یہ ہے کہ :

كَأَيُّ نَبِيٍّ أَلْبَسَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ ذِكْرًا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ  
مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ( ۱۲۲ )

ترجمہ : اس میں باطل نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ دیکھو، نازل ہوا ہے خدائے حکیم و قابلِ ستائش کی طرف سے۔

# آنحضرتؐ اور مسلمانوں کا طرز زندگی

جناب محترم ڈاکٹر جان۔ ایل ایسپوزیٹو

مذہب کے تاریخ نگار کی حیثیت سے میرے خیال میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا سب سے واضح اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے خود کو قرآنی تعلیمات کے عملی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ ایک ایسے مثالی نمونہ کے طور پر جس کی پیروی امت مسلمہ کا ہر فرد کر سکے۔ سنت نبویؐ کی اہمیت خود قرآن سے واضح ہے جس میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی....."

پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو" (النساء - ۵۹)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو" (الاحزاب - ۲۱)

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ مکہ اور مدینہ کے مسلمان بالکل ابتدائی دور سے ہی آپؐ کے عمل کا غور سے مشاہدہ کرتے رہے اور آپؐ کے اسوہ کی پیروی کرتے رہے اور آپؐ کے قول اور عمل کی زبانی روایت کے ذریعہ اور تحریروں کے ذریعہ حفاظت کرتے رہے۔ اس طرح آپؐ کا عمل امت کے لیے سنت بن گیا جسے ہم آج حدیث رسول کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپؐ کا کوئی قول یا عمل ایسا نہیں تھا جس کا آپؐ کے پیروں نے ذوق و شوق سے تحفظ نہ کیا ہو۔ تاریخ اسلام کا ہر باب علم جاتا ہے کہ مسلمان بالکل ابتدائی دور ہی سے اپنی رہنمائی کے لیے قرآن اور سنت رسولؐ کی طرف دیکھتے تھے۔

علاوہ ازیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اخلاقی زندگی میں آنحضرتؐ کے اس اسوہ کی اہمیت کے نتیجے میں ہزاروں احادیث محفوظ کر لی گئیں جن کی روایات بڑھتے بڑھتے لاکھوں تک پہنچ گئیں۔ اس کے بعد ابتدائی دور کے علمائے حدیث نے ان روایات کو جمع کیا اور ان کے اسناد اور متن کے باہمی تعلق کو جانچنے کے طریقے متعین کیے اور اس کے بعد ان کی روشنی میں ان روایات کی صحت کو پرکھنے کا مشکل اور محنت طلب فرض انجام دیا۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور اس قسم کے احادیث کے

دوسرے مجموعے اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

اس پس منظر میں اس اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اسلامی طرز زندگی یعنی شریعت میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حاصل ہے۔ چنانچہ ابتدائی دور کے فقہانے جب شریعت اسلامی کے خطوط مرتب کرنے کی کوشش کی تو ان کے اولین مآخذ قرآن اور سنت رسول قرار پائے۔

جب ہم مسلمانوں کے طرز زندگی، ان کے مقاصد اور اصولوں کو دیکھتے ہیں تو ان پر آنحضرتؐ کی زندگی اور اسوہ کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اسلام میں پہلا اور سب سے اہم تصور توحید کا ہے یعنی اللہ ایک ہے اور خالق اور رب کی حیثیت سے وہ ساری کائنات اور مخلوق پر حکمراں ہے۔ یہ اس عقیدہ کی بنیاد ہے کہ اسلام، دین اور ریاست دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ دنیا انسان کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے اور مسلمان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ خدا کے حکم کو زندگی کے ہر پہلو پر نافذ کرے۔ مذہب کا سیاسیات اور معاشرے سے ایسا تعلق ہے جسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرتؐ نے اس عقیدہ کی بہترین مثال اس طرح پیش کی کہ وہ رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی، حج بھی تھے اور امیر المومنین بھی۔ ابتدائی دور کے فقہانے شرعی قوانین کی جودین کی ہے اس میں اسلام کی یہ جامعیت پوری طرح نظر آتی ہے۔ یہ شریعت اپنے عظیم المرتبہ اماموں کے ناموں کی نسبت سے حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور جعفری مکاتب فقہ سے موسوم ہے۔

شریعت کی وسعت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سنت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) سنت قولی: یعنی آنحضرتؐ کے اقوال (۲) سنت فعلی: یعنی آپؐ کا عمل اور (۳) سنت تقریری: یعنی بعض ایسے کاموں پر آپؐ کا اظہار پسندیدگی یا سکوت جس کا آپؐ کو علم تھا۔

اگر ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کو کا حقہ سمجھنا چاہتے ہیں اور ایک مسلمان کی زندگی پر ان کے اثرات اور ایک مسلمان کی نظر میں ان کے مرتبہ کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے قرآن اور سنت رسولؐ کی طرف مراجعت لازمی ہے جو اسلام کے مآخذ ہیں۔ قرآن میں آپؐ کے اسوہ حسنہ کو واضح طور پر اس طرح پیش کیا گیا ہے:

اے اہل کتاب! ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمہیں دے رہا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت

سے بند تھا تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ (المائدہ - ۱۹)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“ (الفتح - ۲۸)

آپ کے اخلاق اور آپ کی شخصیت سے متعلق جو احادیث موجود ہیں ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہی مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گفتگو میں اعتدال سے نہیں بڑھتے تھے۔ آپ مسکوں پر بلند آواز سے بات نہیں کرتے تھے اور نہ برائی کا جواب بُرائی سے دیتے تھے۔“

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جوتے کا ٹکڑا لیتے تھے اور اپنے کپڑے سی لیتے تھے اور ہر کام بالکل اسی طرح کیا کرتے تھے جیسا تم لوگ کرتے ہو۔ وہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔“ (مشکوٰۃ المصابیح)

یہ نمونہ تھا ایسی شخصیت کا جس کی ہر وہی تمام مسلمانوں پر لازم تھی۔ سیدوطی نے الجامع الصغیر میں یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آنحضرتؐ کی مثال کو بہت واضح طور پر پیش کیا ہے؟

”بابرکت ہیں وہ لوگ جو اللہ کی پیروی میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، جب ان کو کوئی جائز چیز دی جاتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور جب ان سے کسی جائز چیز کو طلب کیا جاتا ہے تو وہ اس کو دے دیتے ہیں اور جو اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔“

نیکی اور اچھائی کی ترغیب دینے والی ان احادیث میں بشارت دینے کے ساتھ ساتھ انتباہ بھی ہے:

”بدبخت ہے وہ شخص جو مقدمہ کے دوران رشوت دیتا ہے اور رشوت قبول کرتا ہے۔“

ایک مغربی مصنف ایف۔ شون (F. SCHUON) نے، جنہوں نے آنحضرتؐ کی سیرت اور مسلمانوں کی زندگی میں آپؐ کے کردار کا مطالعہ کیا تھا، ایک اخلاقی رہبر کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”رسول اللہؐ کی پیروی میں یہ سبق مضمر ہے کہ خود طاقت و رہنمائی، دوسروں کے ساتھ نیا معنی سے پیش آؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو“

(UNDERSTANDING ISLAM P. 93)

ایک مسلمان کی زندگی کی تشکیل میں آنحضرتؐ کا جو کردار ہے اس کا مشاہدہ صرف احادیث کی ابتدائی تدوین کے مراحل میں ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قانون شریعت کی تدوین میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ قرآن اور سنت ہیں جو اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ماحذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریعت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں ایک واسطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدر اسلام کے مسلم معاشرے میں آپؐ کو رہنما اور حج کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا وہ تو ان کی تشکیل کے سلسلے میں سنت رسول کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس معاملے میں بھی مثالی نمونہ اور رہبر قرار پائے۔ جب بعض مسلمان اس حقیقت کو فراموش کر گئے تو بخاری نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی : ”حضورؐ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کے لیے اس کو جائز قرار دیا، لیکن کچھ لوگ ہیں کہ اب تک اس کام سے احتراز کرتے ہیں .... آپؐ نے فرمایا ”ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسے کام سے اجتناب کرتے ہیں جسے میں نے کیا ؟ خدا کی قسم میں خدا کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور میں ان سے زیادہ خدا کو ناراض کرنے سے ڈرتا ہوں۔“

ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا :

”جو کوئی میری سنت سے انحراف کرتا ہے وہ میرا کوئی نہیں۔“

جب ہم فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عبادت اور معاملات دونوں میں ائمہ فقہاء سنت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ابن حنبل جب دھوکا بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو نیت کے بعد ہی جائز ہو سکتا ہے تو اپنے بیان کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ : تمام اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو۔

اس طرح صلوٰۃ کے بیان میں ابن قدامہ کتاب العمده میں عبادہ بن صامت سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں : ”پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو خدا نے دن اور رات میں اپنے بندوں کو

پڑھنے کا حکم دیا ہے .... جو شخص نماز یا بندہ سے پڑھتا ہے اس سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا،

احادیث کے ایک اور مجموعہ، موطا میں جسے مالک بن انس نے مرتب کیا ہے میں اسی طرح حدیث پر اعتماد ملتا ہے۔

قانون کے دوسرے بڑے شعبے معاملات میں بھی اسوہ رسول کو نمونہ بنایا گیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں فقہ حنفی کے ان ضوابط میں جو اسلامی عائلی قوانین سے متعلق ہیں ملتی ہیں۔ ایک نابالغ بڑکے اور لڑکی کا نکاح والدین یا سرپرست کی اجازت سے جائز ہے کیوں کہ آنحضرتؐ نے اس کی اجازت دی ہے۔ فقہاء کا فیصلہ ہے کہ ایک آدمی جس کی دو یا زیادہ بیویاں ہوں اور سب آزاد ہوں (یعنی نوذبی نہ ہوں) تو اس کو چاہیے کہ ازواجِ حقوق و ذرائع کے معاملے میں ان کے درمیان مساوات قائم رکھے کیوں کہ رسولؐ نے کہا ہے کہ "جس آدمی کے دو بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو گا تو اس شخص کا ایک پہلو قیامت کے دن مفلوج کر دیا جائے گا"

آخر میں اُمت کی قیادت یعنی خلیفہ یا امام کے معاملے کو لیجیے۔ اس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو۔ اللہ کی اور اطاعت کرو۔ رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں" (انصار - ۵۹)

اس طرح ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ: "میرے بعد تمہارے اوپر دوسرے حکمران حکومت کریں گے، نیک حکمران نیکی کے ساتھ حکومت کریں گے اور بدکردار حکمران بدکرداری کے ساتھ۔ تم ان دونوں کو سنو اور ان کی ہر اُس کام میں اطاعت کرو جو حق ہو....."

ایک غیر مسلم کی حیثیت سے — جس نے ساہا سال تک اسلام کا مطالعہ کیا ہو، پہلے مسلمان اساتذہ کی زیر نگرانی اور پھر ذاتی طور پر اور جس شخص نے مصر سے انڈونیشیا تک اسلامی ملکوں کا سفر کیا ہو اور تحقیقی کام انجام دیا ہو خاص طور پر یہاں پاکستان میں — مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اُمت کی زندگی میں اللہ کے رسولؐ کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی بے مثل حیثیت حاصل ہے۔ مذہب کے مورخ کی حیثیت سے میں کسی دوسری مثال کا تصور نہیں کر سکتا جن میں ایک رسولؐ نے ایک انسان نے اتنی بڑی اُمت کی زندگی اور اس کے طور طریقوں کو متاثر کیا ہو۔ لفظ اگر یہ سیرت کا نفرنس منعقد کر کے عید میلاد النبیؐ کی خوشی منائی جا رہی ہے تو وہ ہر لحاظ سے بجا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)



# حضور اکرم کا عطا کردہ نظام تعلیم و تربیت

جناب محترم محمد صلاح الدین

ہر انسانی معاشرے نے بلا امتیاز مذہب و عقیدہ علم کی اہمیت و فضیلت کو تسلیم کیا ہے اور دنیا میں غرور و فخر اور ترقی و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے فروغِ علم کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ہر متمدن اور مذہب معاشرے نے اپنے مخصوص افکار و نظریات اور مقاصد زندگی کے مطابق کوئی نہ کوئی نظام تعلیم و تربیت بھی وضع کیا ہے اور پھر اسی نظام تعلیم کے اثرات و نتائج کی بنیاد پر اُس نے دنیا میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔

کسی نظام تعلیم کے مزاج و کردار اور اس کے ثمرات کا انحصار اُس نصب العین پر ہے جس کے حصول کے لیے اُس کی صورت گری اور منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ مقصد اگر عیش و عشرت کی زندگی ہے تو نظام تعلیم کا پورا زور اسبابِ عیش کی تیاری و فراوانی نت نئے سامانِ نشاط کی ایجاد اس کے حصول کے لیے ہر نوعیت کی جہد و جہد، کمزوری و پست درازی، مزاحم قوتوں سے لڑنے کے لیے احمق بنی، اپنے غلبے اور تسلط کے لئے ہمارے اقدارات اور افراد معاشرہ میں مادہ پرستانہ رجحانات کی آبیاری پر ہوگا۔ اور زندگی کا اخلاقی اور روحانی پہلو یا تو قطعی نظر انداز کر دیا جائے گا، یا اسے ثانوی حیثیت دی جائے گی۔ اس طرح اگر مقاصدِ حیات محض رُوح کی بالیدگی اور ترکِ دنیا ہوگا، تو پھر نظام تعلیم بودھ جھکشو اور عیسائی بُراہمیت پر تیار کرے گا۔ اور اس کی تیار کردہ کھوپ دُنیا کے معاملات چلانے کی اہلیت سے عاری ہوگی۔

اس سلسلے میں جب ہم اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا جائزہ دیتے ہیں اور اس کا موازنہ دوسرے نظامِ ملئے تعلیم سے کرتے ہیں تو پہلی چیز جو سب سے نمایاں اور ممتاز و منفرد ہے وہ اسلام کا مخصوص تصورِ علم ہے اور پھر حصولِ علم کی ضرورت و اہمیت پر جس قدر زور قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں ملتا ہے اس کی بھی کوئیِ تذکرہ دینا کے کسی فلسفہ تعلیم میں نہیں ملتی۔

علم کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ انسان نے اس کو ارض پر اپنی زندگی کا آغاز بہل کی تاریکیوں سے کیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کے ذریعہ سے علم کی طرف

پیش رفت کرنا گیا۔ یہ بات مادی وسائل کی تحقیق، ان کی صفات کے تعارف، طبعی قوانین کی دریافت اور ان کے سہارے منت نئی ایجادات کی سہولت کی ضرورت ہے لیکن خود انسان کے مابعد الطبیعیات مسائل کے سلسلے میں قرآن اس تصور علم کو جہل قرار دیتا ہے۔ انسان کا اور اس کائنات کا خالق کون ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے، وہ اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، اُسے یہاں کیا کام انجام دینا ہے، \_\_\_\_\_ اور پھر یہاں سے اپنی متعین عمر پوری کر لینے کے بعد کہاں جانا ہے، وہاں اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔ اور احساب کے بعد جزا و سزا کی منزلوں سے گزر کر اُس کا آخری ٹھکانا کہاں بننا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا واضح ترین جواب اس دنیا میں ملنے والے اولین انسان کو بخوبی معلوم تھا۔ اس نے جہل کے اندھیرے میں نہیں علم کی روشنی میں اپنی زندگی کا آخری سفر کیا تھا اور اس علم ہی کی بنا پر وہ فرشتوں سے بلند مقام پر فائز ہوا اور اشرف المخلوقات قرار پایا تھا۔

انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لیے ہوا، پانی، خوردگ، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب ہتیا کئے تھے، اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مابعد طبیعت بھی آغا زندگی کے ساتھ ہی عطا کر دیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (البقرہ - ۳۱) اور اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ یہاں لفظ کُلُّهَا پر غور کیجیے۔ یہ علم ادھورا اور ناقص نہیں، کامل تھا۔ نام سکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ محض اشیاء کو گنوا دیا ہو، بلکہ ان کے آثار و خواص، نافع اور مضر پہلو، ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیا گیا۔ اسی بنیادی علم اور تحقیق و تجسس کی جبلت کے سہارے انسان علم الاشیا کا دائرہ وسیع کرنا گیا اور ارتقا کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قرآن کے پیش کردہ تصور علم کے مطابق علم کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، ہواس، عقل اور تجربہ ذرائع علم ہیں منبع علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بڑھی ہوئی پیچیدگیوں اور مزدوروں کے مطابق انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے نزولِ کتاب اور بعثتِ انبیاء کے سلسلے کا اہتمام کیا اور انسانیت جب لغویت اور بلوغت کے مراحل طے کرتی ہوئی پختگی و شعور و ادراک کی سطح پر پہنچی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت یعنی تکمیل تعلیم و تربیت کا اعلان کر کے سلسلہ وحی بند کر دیا گیا اور قیامت تک کے لئے اس آخری معلم اور اس کی تعلیم کو سرچشمہ ہدایت و رہنمائی قرار دیدیا گیا۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ اولین انسان اور سلسلہ نبوت کے بانی حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان کی فضیلت و خلافت کا ذکر علم کے ساتھ ہوا۔ اور سلسلہ نبوت

کے مختتم حضرت محمد پر آئیں وحی نازل ہوئی تو وہ بھی علم اور قلم ہی سے متعلق تھی۔ سورہٴ علق میں یہ ارشاد ہوا:

”پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جسے ہوئے خون کے ایک قطرے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔ (ترجمہ آیت ۵)

یہ درحقیقت پڑھنے کا حکم نہ تھا بلکہ منبع علم کی جانب سے ایک امی لقب کو معلّم انسانیت بنانے کے لیے براہ راست اس کی تعلیم کا آغاز تھا۔ اس نے اب تک قلم کو ذریعہ علم بنایا تھا۔ اب وہ واسطہ قلم کے بغیر علم پہنچا رہا تھا اور ایسا کامل علم جو اس سے قبل انسان کو کبھی میسر نہ آسکا تھا۔ اس علم کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ اول روز سے بے مقصد اور کسی سمت و منزل کے شعور سے عاری نہ تھا۔ اس کا مقصد انسان کو خلافت کے اس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کا اہل بنانا تھا جس پر اسے فائز کیا گیا تھا۔ انسان جس عظیم و کبیرہستی کی نیابت پر مامور کیا گیا تھا اس کی صفات کا ایک ادنا سا مشابہہ اس کے کردار و اعمال میں جھلک ضروری تھا۔ اسے العلیم سے محض علم ہی کی روشنی درکار نہ تھی صفت رحم، عدل، احسان، عفو و درگزر، سلم، صداقت، سخاوت، تخلیق، حکمت، تدبیر اور دوسری صفات کا پرتو بھی مطلوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور بالخصوص شیخ الاسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسان کی تعلیم و تربیت کا جو اہتمام فرمایا اس میں سیرت و کردار کو انہی صفات سے ہمکنار کیا گیا۔ اور اس طرح انسان کو اعلیٰ ترین اخلاقی وجود بنوایا گیا۔

اس نظام تعلیم کی روح اور اس کے مزاج و کردار کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مقصد اس دنیا میں عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرے کا قیام، اس مقصد کی تکمیل کے لیے اعلیٰ ترین انسانی کردار کی تشکیل اور اس تشکیل کی کردار کے لیے اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار پر مبنی نظام تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ اب دیکھیے قرآن کریم میں اس کی وضاحت کس طرح ہوتی ہے۔

سورہ الحدید میں ارشاد ہوتا ہے :

”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔“ (الحدید - ۲۵)

گویا تمام معجزات، نشانوں، ہدایات، کتابوں اور میزان خیر و شر کے نزدیکی اور انبیاء کی بخت کا اصل مقصد اس دنیا میں انسانی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔ یہی بات دوسرے نفلوں میں یوں بیان کی گئی ہے :

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔“ (الحج - ۴۱)  
ایک اور جگہ یہی بات یوں فرمائی گئی:

”تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“ (آل عمران - ۱۱۰)

معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا درحقیقت ایک عادلانہ معاشرے ہی کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے جس معیار کا کردار مطلوب ہے اس کی تعمیر و تشکیل کا کام انبیاء کو سونپا گیا اور انہیں اس مطلوبہ معیار کا بہترین نمونہ بنایا گیا۔ ہر نبی درحقیقت معلم انسانیت تھا۔ خود بخود اگر ہم اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

انما بعثت معلما یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی تھی کہ: **اے رب! ان لوگوں میں خود ان ہی کی قوم سے ایک رسول اٹھاؤ جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔** تو براہِ اقتدار اور حکیم ہے۔ (البقرہ ۱۲۹)

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا:

”ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہمارے آیات سناتا ہے تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“ (البقرہ - ۱۲۹)

اب تخلیقِ آدمؑ، تعلیمِ آدمؑ، منصبِ خلافت، مقصدِ خلافت، نزولِ کتاب، بعثتِ انبیاء اور کارِ نبوت کا یہ پورا سلسلہ ذہن میں رکھ کر اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت کے ڈھانچے اور اس کی روح کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سبب ذیل خاکہ ذہن میں اُبھرتا ہے۔

۱۔ اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کسی فلسفی یا اہلِ تعلیم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کتابوں کی صورت میں نصابِ تعلیم مہیا کیا، انبیاء کی صورت میں معلمین بھیجے اور ان کے ذریعے خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے انسان کو ہدایت و رہنمائی مہیا کی۔

۲۔ حضور اکرمؐ کے ذریعے سے ہمیں جو نظامِ تعلیم دیا گیا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے نظامِ تعلیم و تربیت

کا ایک پر تو ہے۔ سورہ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں حضور کے کام کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے

اس سے اسلامی نظام تعلیم کے چار بنیادی عناصر ترکیبی واضح ہوتے ہیں :

(ا) اللہ کی آیات سنانا یعنی قرآن کی تعلیم اس طرح دینا کہ اس کا متن پوری صحت کے ساتھ اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔

(ب) تزکیہ نفس یعنی اعلیٰ ترین اخلاقی تربیت جس کے ذریعے نفس انسانی خیر کی طرف مائل اور شر سے متنفر ہو، نیکیوں کا صدور آسان اور برائیوں کا ارتکاب مشکل ہو جائے۔ اور انسانی سیرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن جائے۔

(ج) کتاب کی تعلیم جو اس کا متن پہنچا دینے کے بعد ایک اضافی ذمہ داری ہے اس کے تحت قرآن کے منشا : مفہوم اور مطالب کو اس طرح کھول کر بیان کرنا اور عملی صورت میں ڈھال کر دکھانا ہے کہ کوئی بھی الجھن باقی نہ رہے۔

(د) حکمت کی تعلیم یعنی اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور اور فہم و ادراک کی جو عظیم قوتیں انسانی ذہن کو عطا کی ہیں انھیں صیقل کرنا، اور جو جسمانی توانائیاں اور مادی وسائل انسان کو بخشے ہیں ان کے بہترین استعمال کی استعداد پیدا کرنا، گویا اعلیٰ ترین علم کے ساتھ انسان کو حسن عمل اور حسن تدبیر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا۔

(ه) ایسی باتوں کی تعلیم جو پہلے سے علم میں نہ ہوں یعنی عمل میں مسلسل اضافہ، تحقیق و انکشافات کے میدان میں مسلسل پیش رفت اور جمود کی جگہ پیہم تحرک۔

۳۔ حضور اکرمؐ نے اپنی امت کے علما کو وارثِ انبیاء قرار دیا ہے، گویا اب علماء صرف نبی و آخر الزماں کے چھوٹے ہوئے ورثہ ہی کے امین نہیں بلکہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک تمام انبیاء کرامؑ نے انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے مجموعی طور پر جو کچھ کیا ہے اس کے ثمرات کی حفاظت کرنا اور اس سلسلہ تعلیم و تربیت کو جاری رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کے اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو ان آیات اور احادیث کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جن میں حصولِ علم پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم کو روشنی اور جہل کو تاریکی قرار دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا :

جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانا ہے۔ اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے

ہیں۔ (البقرہ - ۲۵۰)

اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب کو نور قرار دیا۔ اس نور کے بغیر اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر خلیفۃ اللہ اپنے منصب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اسی لئے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے طلب علم کے لیے سفر کو عبادت، اس راہ میں موت کو شہادت، علمی تحقیق میں بحث و کلام کو جہاد، پڑھنے کو صدقہ، یاد کرنے کو تبیغ، علم کو جنت کے راستوں کا نشان، دلی کی روشنی، آنکھوں کا نور، تقرب الہی کا ذریعہ، مومن کا سچا دوست، مومن کی گمشدہ میراث اور بزرگی اور فضیلت کی علامت قرار دیا، مدرسے کی تک علم حاصل کرنے پر زور دیا اور اس مقصد کے لیے چین جیسے دور دراز ملک تک کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو دیاں جانے کی تلقین فرمائی۔

اب یہ دیکھیے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے عہد مسعود میں مسجد نبوی کے بلند چبوترے پر ہو سہلا باقاعدہ مدرسہ قائم کیا اس کی خصوصیات کیا تھیں۔ خلافت راشدہ میں اسی نمونے کی بنیاد پر پورے عرب اور مغربہ علاقوں میں جو نظام رائج کیا گیا اس کے خدو و خال کیا تھے۔

۱۔ صفحہ کا مدرسہ اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ تھی اور اس کا خود مسجد نبوی کی حدود میں واقع ہونا یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اسلام کے نظام تعلیم و تربیت میں مسجد اور مدرسہ دو جدا گانہ ادارے نہیں بلکہ دونوں مل کر ایک مربوط ادارہ بنتے ہیں جو علم و عمل کی وحدت و یکپائی کا منظر ہے۔ ہمارے دینی مدارس آج بھی اسی روایت پر قائم ہیں۔ ہر دینی مدرسہ کی حدود میں ایک مسجد یا ہر مسجد کے احاطہ میں ایک مدرسہ کی موجودگی مسجد نبوی اور صفحہ پر قائم مدرسہ نبوی کے باہمی رشتے کی روایت کا تسلسل ہے۔

۲۔ اس مدرسہ کی دوسری خصوصیت معلم اور متعلم کے درمیان ہم گھسنے کی رفاقت تھی شکر اللہ کو زندگی کے اعلیٰ اصول سکھائے جلتے تھے۔ جن اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی تھی اور سیرت و کردار کے جس سانچے میں ڈھلنے کی تلقین کی جاتی تھی ان کا عملی نمونہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ معلم اعظمؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ اوراقِ قرآن کی طرح اس کی زندگی بھی کھلی کتاب کی صورت ان کے سامنے تھی۔ اس کی کجی اور اجتہادی زندگی کے درمیان دیر پر دے سائل نہ تھے۔ وہ قرآن میں جو کچھ پڑھتے اسے اسوۂ حسنہ کی صورت میں رو بہ عمل پاتے۔ کتاب کے مجرد اصول انھیں معلم کتاب کی اپنی زندگی میں ایسی کھوس، واضح اور موثر صورت میں نظر آتے کہ الفاظ اور معنی کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہ رہتا۔ قرآن اور معلم قرآن کے اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ام المومنین

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن کی بہترین تفسیر متوراکرمؓ کی سیرت طیبہ ہے۔  
۳۔ صفحہ کے مدرسے کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہوا اور پانی کی طرح علم کو  
سبھی ذمہ بنیادی ضروریات میں شامل کیا بلکہ انہی کی طرح بلا قیمت سہل الحصول بنا دیا۔ مسجد  
کا طرح مدرسہ میں بھی کامل مساوات قائم کی علم پر کسی مخصوص گروہ یا طبقے کا اجارہ نہ رہا۔ اس  
مدرسے کے قیام سے قبل عرب میں علم عام نہ تھا، چند اونچے گھرانوں کی میراث تھا۔ نادار لوگ  
اور غلام تو اس کا تصور تک نہ کر سکتے تھے، لیکن مسجد نبویؐ میں صفحہ کا چشمہ علم جاری ہوا تو  
اس سے فیضیاب ہونے والوں میں نادار، بے سہارا اور غلام طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد  
ہی پیش پیش تھے۔ اصحاب صفحہ بن کی تعداد ۶۰، ۷۰ کے قریب تھی معاشی طور پر سب سے  
پسماندہ لوگ تھے لیکن علم کے معاملے میں وہ بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے اور ان کے ذریعے  
علم عربا کی میراث بن گیا۔ اس غیر طبقاتی نظام کی بدولت مورخین، فقہاء، ریاضی دان،  
سائنسدان، حکماء اور دیگر علوم کے ماہرین پسماندہ اور متوسط طبقے سے اُبھرے اور آسمان  
علم پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ اسلام نے علم اور اس کے مقصود عدل کا رشتہ الی، عمدے  
منصب اور ہر دوسرے امتیاز سے یکسر منقطع کر دیا اور ان کی بلا قیمت فراہمی یقینی بنا کر محمود  
آیا نہ کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔

۴۔ صفحہ کے مدرسے نے ایک اور شاندار روایت یہ قائم کی کہ علم حاصل کرنے والوں کو نہ صرف  
ہر قسم کے مالی بارے سے نجات دلائی بلکہ خود ریاست اور خوشحال افراد معاشرہ کے اجتماعی وسائل  
سے کفالت کا ایسا انتظام کیا کہ غربت کسی صورت میں بھی حصول علم کی راہ میں مانع نہ ہو۔ مدرسہ  
غریبوں کی پناہ گاہ اور معاشرے میں انھیں با عزت مقام دلانے کا ذریعہ بنا۔ صفحہ کے ناظم ہدایت  
حضرت معاذ بن جبلؓ تھے جو عطیات کے ذریعے سے اس کے مصارف پورے کرتے اور خود حضور اکرمؐ  
اس کی کفالت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ صفحہ کے علاوہ ایک اور اقامتی درس گاہ دارالقرآن تھی۔  
عمر نبویؐ میں ان دو اقامتی درس گاہوں کے ساتھ ہی مدینہ متورہ میں ۹ مساجد اور تھیں  
جو درس گاہوں کا کام دیتی تھیں۔ اس پڑوس کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے، ان تمام  
مساجد اور درس گاہوں کی نگرانی حضورؐ خود فرماتے۔ آپؐ ہی اساتذہ کا فقرہ کرتے۔ مسجد نبویؐ  
میں آپؐ صدر معلم کے فرائض انجام دیتے۔ آپؐ کی نگرانی میں متعدد کبار صحابہؓ وہاں درس و  
تدریس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ مفت، مساوی اور یکساں نصاب کے تحت تعلیم کی  
یہ روایت اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ خلافت عثمانیہ اور برصغیر ہند

میں مغلیہ عہد حکومت تک پوری مسلم دنیا میں کہیں تعلیم کی فیس نہ تھی اور اعلیٰ القیاس بھی انصاف کے لئے کسی گورنٹ فیس وغیرہ کے تصور سے بالکل نا آشنا تھیں۔ مفت اور کفالتی تعلیم کی وہ روایت جو صفہ سے شروع ہوئی آج بھی ہمارے دینی مدارس میں جاری ہے۔ مدرسہ قائم کرنا اور معلم و متعلم دونوں کو مالی وسائل سے بے نیاز کر دینا مسلم معاشرہ کا ایک عالمی رواج بن گیا تھا۔ اس کا یہ خیر میں بادشاہ، امراء، رؤساء ہی نہیں مسلمان مزدور تک حسب حیثیت حصہ لیتے اور اسے عبادت سمجھتے تھے۔ کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ مدرسہ کے لئے وقف کرتا، جو لانا اس کے لیے پڑھے کا ایک تھان فراہم کرتا، تیلی اس کے چراغوں کے لیے تیل مہیا کرتا، بڑھی رتل اور الماریاں بنا کر دیتے پٹائی بننے والے پٹائی لا کر دیتے، راج مزدور خالتوت میں اس کی تعمیر اور رنگ و روغن کا کام مفت انجام دیتے اور مسلمانوں کا ہر گھرانا طلبہ کے لیے اپنے کھانے کا ایک حصہ مزدور وقف کرتا۔ غرض معاشرے کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو عطیات، صدقات، ہدیہ، فطرے اور دوسری صورتوں میں مدارس کی خدمت کو ایک نیکی اور سعادت سمجھ کر انجام نہ دیتا ہو۔ خلافت راشدہ میں جب بیت المال کی آمدنی بڑھی تو فوری مصارف میں زیر تعلیم طلبہ کا حق سب پر مقدم رکھا گیا۔ اس نظام کے تحت بچوں اور بڑوں کی تعلیم ان کے سرپرستوں کی ذمہ داری نہ رہی بلکہ ریاست اور افراد معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بن گئی۔

۵۔ کفالت عامہ کے تحت کام کرنے والے نظام تعلیم کو حریت فکر، آزادانہ علمی تحقیق اور بے خوف و خطر اظہار رائے کی روح بھی میسر آگئی۔ استاد کسی کا طائفہ نہ تھا سب اس کے خادم تھے، شاگرد کسی کے ذلیفہ خواہ نہ تھے ایک اجتماعی فنڈ سے اپنا حق حاصل کرتے تھے۔ مدرسہ عوام کی عقیدت و محبت اور ان کی قیادت و رہنمائی کا مرکز تھا۔ دربار کی مجال نہ تھی کہ اہل مدرسہ پر اپنا تسلط قائم کرے۔ ان پر کسی کو بالا دستی حاصل تھی تو وہ صرف مدرسہ تھا جو دونوں پر راج کرتا۔ علماء بادشاہوں سے زیادہ قابل احترام تھے۔ ان پر کبھی دربار کی دست درازا ہوتی تو لپڑا معاشرہ ان کی پشت پر ہوتا۔ علماء کی برائیت کردار، حریت فکر اور حق گوئی و بیباکی کی داستانوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہ صفات درحقیقت اس خود کفیل نظام تعلیم کا جو ہر تھیں جس میں مدرسہ اپنے وجود کے لیے دربار کی سرپرستی کا محتاج نہ تھا۔

۶۔ اس نظام تعلیم کا ایک اور بنیادی وصف یہ تھا کہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ حضور اکرمؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ:



”میں صرف اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“ (موطا - امام مالک)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

میں تو ہی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکالمہ اخلاق کی تکمیل کروں (مسند احمد - بیہقی، ابن سعد)۔  
 آپ کے قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت کی روح اخلاقی حسنہ تھی۔ اس نظام نے سیرت و کردار کے اعتبار سے جیسی پاکیزہ اور بلند و بالا ہستیاں اپنی آغوش تربیت میں ڈھالیں ان کا مشاہدہ انسانی تاریخ نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ اسلام نے اسی نظام تعلیم و تربیت کے ذریعے نصف صدی کے اندر اندر الیہ عظیم اخلاقی انقلاب برپا کیا کہ دنیا جنت کا نمونہ بن گئی۔ عدل، احسان، اخوت، مساوات، ایثار، ہمدردی، ننگساری، تعاون، افتاد، سچائی اور نیکی کی ایک ایسی عمومی فضا نصف کرہ ارض پر چھا گئی جس میں انسان کو پہلی بار حقیقی امن، سکون اور اطمینان کی لذت نصیب ہوئی۔

۷۔ اسلامی نظام تعلیم کو صرف مساجد اور مدارس تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کا دائرہ خاندان، معاشرے اور اس کے ہر ادارے تک وسیع کیا گیا۔ مدرسے اور معاشرے کے درمیان تضادات اور منافقت کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی، جو کچھ مدرسے میں پڑھایا جاتا، پورا معاشرہ اس کی عملی تصویر پیش کرتا۔ جو چیز مدرسے میں معروف کے طور پر پڑھائی جاتی وہی معاشرے میں معروف نظر آتی اور جن چیزوں کی نشاندہی بطور نکرہائی جاتی وہ گھر سے لے کر ایوان حکومت تک نکرہ ہی کی صورت میں قابل نفرت پائی جاتی۔ گویا مدرسہ ایک مکمل معاشرے کا چھوٹا سا نمونہ اور اس کا حقیقی آئینہ دار تھا۔

۸۔ حضور اکرمؐ کے عطا کردہ نظام تعلیم نے علم کو ایک وحدت قرار دیا اور اسے گرد ہی، لسانی، نسلی اور قومی تفصیلات سے پاک کیا۔ اس انداز فکر نے دنیا بھر کے علوم کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیئے۔ انھوں نے یونانی، رومی، فارسی، فرانسیسی، اسپینی اور افریقی زبانیں سیکھیں، ان کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا اور خود ان زبانوں کو اپنے علوم کے خزانوں سے مالا مال کیا۔ اس نظام تعلیم میں دینی اور دنیوی علوم کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ تمام مرتبہ علوم جن میں ادب، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، فلکیات، طب، کیمیا، طبعیات، فن سپرگری اور دوسرے علوم شامل تھے، اسلامی نظام تعلیم کا حصہ بنے اور خود مسلمانوں نے سینکڑوں نئے علوم کی داغ بیل ڈالی۔ اس نظام تعلیم نے مسلمانوں کو دنیا میں بھی عزت و عظمت و وقار و افتخار اور قوت و شوکت عطا کی اور انھیں آخرت میں

اپنے رب کے حضور سرخروئی کے قابل بھی بنایا، اس نے امت کے کسی خاص طبقہ اور گروہ کو نہیں پوری امت کو بحیثیت مجموعی اوپر اٹھایا اور علوم و فنون کو سب سے دھکیلے پانی کی طرح سب کے لیے قابل حصول بنا دیا۔

حضور اکرمؐ کے معجزات بے شمار ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ اتنی ہونے کے باوجود انھوں نے اس دنیا کو علوم کے خزانوں سے بھر دیا اور یہ علوم بھی محض فلسفیوں کے افکار و نظریات کی طرح نہ تھے کہ سن کا انسان کی سیرت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ علم اور کردار کو اس طرح یکساں کیا کہ یہ آپس میں مل کر ایک وحدت بن گئے۔ کردار کے بغیر اسلامی معاشرے میں علم کی کوئی وقعت نہ رہی اور علم کے بغیر کردار بقدر حسن عمل معتبر تو تھا مگر مگر مقبول نہ بن سکا، قیادت و رہنمائی کا تاج صرف اسی کے سر پہ رکھا گیا جسے ابتداً خلائی کردار اور علم کی قابل اعتماد مقلد نصیب ہوئی۔

یہ نظام نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتوں کے ماتحتوں تباہ ہوا۔ مدرسے کی وحدت اور اس کی مساوات ختم ہوئی دین اور دنیا کی علاحدگی کے تصور نے مدرسے کو بھی دینی اور دنیوی بنیاد پر تقسیم کیا۔ پھر دنیوی بنیاد پر تمام ہونے والے مدارس بھی طبقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوئے۔ اعلیٰ متوسط طبقات اور غریبوں کے لئے الگ ذریعہ تعلیم، الگ نصاب اور الگ معیار کے مدارس تمام ہوئے اور یوں ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ تعلیم کی اونچی اور نیچی جنس نے علم کو صلاحیت و اہلیت کے بجائے معاشی حیثیت سے منسلک کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہی قوم کے اندر اپنی تہذیب، ثقافت، زبان، انداز فکر، لباس، بود و باش، ذہنی رجحانات و میلانات، مقاصد زندگی اور اقدار و روایات کے لحاظ سے درجنوں طبقات وجود میں آ گئے جن کی زندگی علاحدہ علاحدہ طبقوں کے جزیروں میں بند ہو کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئی۔ باہمی تعاون کے بجائے ان کے درمیان مفادات کے تقادم کا سلسلہ اُبھر آیا۔ یوں پوری قوم متحد ہونے اور بصیرت اللہ کے رنگ میں رنگنے کے بجائے تعلیم و تربیت کے جداگانہ اور رنگ برنگ نظام کی وجہ سے شدید انتشار فکر کا شکار ہو گئی۔ ایک گروہ اسے اپنے افکار کی سمت کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے اور دوسرا اس کی مخالف سمت۔

یہ الٹا صورت حال اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ہم پوری قوم کے لیے مفت اور یکساں نصاب و ذریعہ تعلیم پر مشتمل ایک غیر طبقاتی اور قومی نظام تعلیم دہود میں نہیں لاتے، طبقاتی مفادات کی زنجیروں کو توڑ کر پوری قوم کے بچوں کو کم از کم درس گاہ کی حدود میں مساوی

حیثیت کا نہیں بناتے۔ صفحہ کی روایت کے مطابق امیر اور غریب کے بچوں کو ایک ہی چھت کے نیچے نہیں بٹھاتے، ہمارا نظام تعلیم کبھی اسلامی نہیں بن سکتا۔

خدا کا بچہ منہ رام اخلاق کی تکمیل اور قیام عدل کے لئے دُنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس نے مدرسے کی مسادات کے ذریعے سے پورے اسلامی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کیا تھا۔ اب یہ بات اخلاق اور عدل دونوں کے منافی ہے کہ ہم امت کے نو بہانوں کو امیر اور غریب کے گروہی طبقات میں تقسیم کر کے ان کی مالی حیثیت کے مطابق درس گاہیں قائم کریں۔ اور ان کے لیے حسب حیثیت علاحدہ علاحدہ نصاب اور سہولتیں ہتیا کریں۔ تقسیم ملت کی یہ روایت غیر ملکی آقاؤں نے قائم کی تھی۔ ہم نے اس کی کافی سزا بھگتی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں شرح خواندگی ۸۵ فیصد تھی آج پاکستان میں صرف دستخط کی اہلیت اور ناظرہ قرآن کی سطح تک علمیت رکھنے والوں کو شامل کر کے یہ شرح ۲۲ فیصد ہے۔ گویا نو آبادیاتی اور طبقاتی بنیادوں پر قائم نظام تعلیم نے جمل کی تار بکلی پھیلائی، علم کے دریئے بجھائے اور قوم کے ٹکڑے اُڑائے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر محترم حکیم محمد سعید صاحب نے آوازِ اخلاق بلند کی ہے۔ خدا کرے یہ ہر پاکستانی کی آواز بن جائے۔ اسے اگر ہوا میں جمیل ہو کر رائیگاں نہیں جانے دینا تو میری گزارش ہے کہ اخلاق کی اس آواز کو کیاں قومی نظام تعلیم کی تحریک کا ذریعہ بنائیے۔ مدرسہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات پر قائم ہو گیا تو میں خدا کو گواہ بنا کر اس امر کی ضمانت دیتا ہوں کہ پورا معاشرہ عدل و مساوات کی بنیادوں پر استوار ہو کر رہے گا۔ اور اخلاق کا پرچم بلند ہوگا۔ خدا ہم سب کو اپنی اپنی قوت، صلاحیت اور وسائل کے مطابق اسلامی نظام تعلیم کے لیے جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

# اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب

جناب محترم مولانا غلام مصطفیٰ تاسمی

حضرت امیر اوسین عاتقہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مشہور حدیث کے مطابق سنہ ۱۸۴۱ء میں علیہ واکر و سلم کے اخلاقی حزن کی کامل کتاب قرآن معرہ میں ہے۔ وہ آپ حکیم کی ایک مختصر سورت ”واللہ اعلم“ میں ان اخلاق کا ایک اجمالی خاکہ کیوں پیش کیا گیا ہے۔

”انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ گھٹے اور نقصان میں رہا ہے سوائے اُن کے جو اللہ پر ایمان لائے، انھوں نے نیک کام کیے۔ ایک دوسرے کو نیک کام کی صلاح دی اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انھیں برداشت کیا“

ایمان باللہ اعمالِ صالحہ، تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر۔ انسانی تاریخ اور اخلاق کی یہ چار صدائیں ہیں جنھوں نے اس پر عمل کیا وہ فائز و کامران ہوئے اور جنھوں نے ان سے بے پروائی برتی وہ ناکام و خاسر رہے۔ یہ بنیادی صدائیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانیت۔

اخلاقی حزن جن سے تہذیبِ نفس ہوتی ہے اور انسانیت کا ایک مہذب اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان کے چار اصول بتائے ہیں اور ان کے الفاظ میں ہر مہذب اور شریعت اُن کو کور کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی ہے۔ ان اخلاق کی ہر مہذب میں اگرچہ صورتیں مختلف رہیں، لیکن روح سب کی ایک تھی۔ شاہ صاحبؒ اپنی فارسی تالیف ”مہمات“ میں فرماتے ہیں: (ترجمہ) فقیہ رب ربات روشن کی گئی ہے کہ تہذیبِ نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کے لیے بھیجا تھا تمام مثل حق میں انھی چار اخلاق کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب موجود ہے۔ اور برتر یا نیکی انھی چار اخلاق اور خصلتوں کا نام ہے اور برتر کے بالقابل اُنہی آگاہ سے مراد وہ عقائد اعمال اور اخلاق ہیں جو انھی چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار اخلاق میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت رکھا گیا ہے اور طہارت صرف ظاہری صفائی کا نام نہیں ہے، لیکن شریعت نے جو اس کے اقسام بتائے ہیں اُن پر صحیح طور پر عمل پیرا ہونے سے جو وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ طہارت کا حاصل ہے جس

کو اُٹس اور ٹور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

دوم اخبات یا خداوند قدّوس کے لیے انتہائی درجہ کی عجز و نیاز مندی ہے جس کی تفصیل میرے استاذ مکرم علامہ عبید اللہ سندھیؒ نے اس طرح فرمائی ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبی اور خارجی تشویش سے فراغت کے بعد، اُس کے جلال اور اُس کی کہانی میں غور کرتا ہے تو اُس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں تمام عبادات آ جاتی ہیں۔

سوم سماحت اور فیاضی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نفس بُرے خصائل اور بُرے اخلاق سے مغلوب نہ ہو مثلاً طلب لذت، حب انتقام، حسد، غیبت، بخل اور حرص و غیرہ سے اپنے آپ کو بچائے رکھے اس میں عفت و پاک دامنی، ہمد و حمد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آ جاتے ہیں۔ شکم اور فردّ کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام عفت اور پاک دامنی ہے۔ آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام ہمد و حمد ہے۔ جزع و فزع اور بے صبری کو روکنا صبر ہے۔ انتقام اور بدلہ لینے کی خواہش کو دبانا عفو ہے۔ خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت ہے اور حرص و ہوا کو قبول نہ کرنے کا نام قناعت ہے۔ شریعت کی بتائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چہارم عدالت ہے۔ سیاسی اور معاشرتی نظاموں کی رُوں رواں یہی خصلت اور صُلق ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدنیہ اور حُسن معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجّہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرج، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبّر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بہ خوبی انجام دینا حریت ہے اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاستِ مدنیہ ہے۔ بھائیوں اور دوستوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچانتا اور ان سے الفت و لُشاشت سے پیش آنا حُسن معاشرت ہے۔

یہی چار اخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور اُن کو چھوڑنے سے انسان قعرِ مذلت اور خواری میں گرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کی نظر میں تمام انبیاء علیہم السلام ان چار اخلاق کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہ ایسے اصول ہیں کہ ان میں شریعت کے عقائد اور اعمال سب آ جاتے ہیں۔ اور سورۃ العصر میں انسانیت کی کامیابی اور ترقی کے جو اعمال بتائے گئے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اخلاق اور خصائل انسانی کے سلسلے میں یہ تحقیق گویا اُن کے لیے تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاقِ حسنہ کے مختصر تذکرے کے بعد اب ہم اخلاقی انعطاط کے اسباب کی طرف آتے ہیں:-  
دیے تو اخلاقی انعطاط کے فلسفہ اخلاقی میں کئی اسباب بتائے گئے ہیں، لیکن قرآنِ حکیم کی تعلیمات،

قصص الانبیاء کے مطالعہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کسر کی اور قیصر کے در حکومت سے متعلق بتاتی ہوئی تحقیق سے جس کی تفصیل ازالۃ الخفا اور جہۃ اللہ۔ انہ میں موجود ہے، برہات ملتی ہے کہ اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب انسانیت میں اجتماعی شرک کا رائج ہونا ہے۔ اور یہ ہے چار ہزار دہائی اور رفاہیت بالغہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعدائوں سے بولسب کا نام لایا گیا اور ابوجہل کو چھوڑ دیا گیا، کیوں کہ ابولسب مکہ کا بڑا سرمایہ دار تھا، مال اور دولت کے نشے میں اس کی اخلاقی گراؤٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ کھل کر اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آزار پہنچانے کے لیے تھا، حضورؐ کے راستے میں کانٹے پھٹاتے جاتے تھے۔ چوں کہ وہ حضورؐ کا چچا تھا اور مکان بھی قریب تھا تو پڑوس کا خیال بھی چھوڑ کر غلاظت پھینکتا تھا یہاں اہل مکہ کی بُری معاشرت اور بُری اقتصادی حالت کا ایک بُرا نمونہ دکھا کر اخلاقی انحطاط کی طرف اشارہ کیا اور اُس پر بددعا کی گئی۔ اس کا اصلی مطلب اصلاح سب سے کہ اہل مکہ کی یہ حالت نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہو کر یہ معاشرہ قرآن حکیم کی تعلیم پر آجائے۔

قرآن حکیم میں نوح علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی طرح دعوت دیتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ایک معاشرتی مسئلہ نکاح میں زیادتی کرتی تھی اور شعیب علیہ السلام کی قوم بھی اسی طرح معاشرتی مسئلہ ماپ تول میں کمی کرتی تھی۔ قرآن کریم کی سورۃ ہود میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے افراد میں دو ناجائز خصلتیں پائی جاتی تھیں: ایک تو وہ خدا کے لیے شرک بناتے تھے اور دوسرے ماپ تول میں ظلم کرتے تھے۔ چوں کہ انھوں نے اپنے نبی کی دعوت کو رد کر دیا تھا، اس لیے انھیں ہر باد کر دیا گیا۔ کچھ اہل علم یہاں شرک کا ذکر دیکھ کر عذاب کا مدار صرف اسی بات پر رکھتے ہیں کہ وہ شرک کرنے کے باعث ہر باد کر دیے گئے، لیکن قرآن حکیم کے واضح الفاظ کی رُو سے اُن کی تباہی کے دونوں ہی اسباب ہیں۔

اس سلسلے میں تحقیق یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کے حکما ہوتے رہے ہیں: ایک وہ جو الہیات کی تعلیم دیتے رہے، جنہیں حکمائے الہی کہا جاتا ہے۔ دوسرے اجتماعی حکماء ہیں یعنی فقہاء و فیرہم، اور یہ انسان اجتماع کو چلانے والے ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کا حقیقی چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس میں دنیا کا کوئی بادشاہ، حاکم اور حکم حقدار نہیں ہے۔ اجتماعی حکیم کی نظر میں جو شرک ہے اسی شرک کو قرآن حکیم میں جابر جامنوع قرار دیا گیا ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں ہی بتایا گیا ہے کہ وہ اجتماعی شرک میں مبتلا تھے، جیسے ماپ تول میں کمی کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے اُن کو ہر باد کیا گیا۔ عدل

اور ظلم حقیقت میں اجتماعی حکمت کے الفاظ ہیں، قرآن مجید نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قرآن مجید کا لفظ شرک عام ہے۔ سورۃ ہود میں آتا ہے ”وَمَا اِنَّا بِظَالَمٍ لِّلْعَالَمِينَ“ یعنی میں بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ اصل میں جو شخص ظلم کو قانونی شکل دے گا ضرور ہے کہ اُسے خدا کے سوا قانون کا مالک کسی اور طاقت ہی کو مانتا پڑے گا۔ اب جب وہ قانون کا مالک کسی دوسری طاقت کو مانتے گا تو وہ اجتماعی حکمت میں دوسرا خدا مان لے گا اور یہ اجتماعی حکمت میں شرک ہے۔ اس میں سب سے پہلے بادشاہ اور حاکم آجاتے ہیں جیسے فرعون جو اپنے آپ کو قانون کا مالک سمجھتا تھا اور ایسے علمائے سو اور فقرہ بھی اس میں آجائیں گے جو فقہ تیس کے نام پر قانون کے مالک بن جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک، امام الامام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں:

وما افسد الدين الا الملوحة واصبار سوء والترصيان

قریش مکہ اس اجتماعی شرک میں مبتلا تھے۔ اس وجہ سے اُن کے اخلاق میں انحطاط آگیا تھا۔ وہ فی الجملہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ سورۃ عبس میں آتا ہے کہ قریش مکہ اس بات کو مانتے تھے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے، مگر اس کے باوجود وہ اللہ سے دُور تھے اور اُن میں اخلاقی گراؤ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اجتماعی شرک میں مبتلا تھے جو ایک گونہ اخلاقی انسانی سے عاری ہونے کا نام ہے۔ جیسے لوط علیہ السلام کی قوم نکاح کے معاملے میں اور شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول کے معاملے میں تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکمت کی بات کی مخاطب سب انسانیت ہوتی ہے اور اسے (توحید کو) ہر ایک آدمی اپنی فطرت کے مطابق سمجھ لیتا ہے مگر اس کے نیچے قانونی درجہ ہے اور قانون کے لیے ضروری ہے کہ کوئی قانون داں ہمیں اس قانون سے آگاہ کرے۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ غیر اللہ کے نام پر رقم نہ کھائی جائے اور اللہ کے شعائر یعنی بیت اللہ کے سوا کسی اور طرف سجدہ نہ کیا جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنا گویا قانونی شرک ہے۔ اس قانونی شرک کے ارتکاب کے باعث وہ مجرم بن جائے گا اور قانونی سزا کا مستحق۔ جس طرح اور قانون کی خلاف ورزی مجرم قرار دی گئی ہے اسی طرح اس شرک کو مجرم قرار دے کر اس کی بھی سزا عطا کر دی گئی ہے۔ جو شخص توحید کو چھو کر شرک حقیقی کی طرف جاتا ہے اُس کی سزا غیر مجہود ہے۔ قانون شرک کی جزا دوسرے جرائم کی طرح محدود ہے۔

محدود اور غیر محدود میں یہ فرق ہے کہ دوسرے جرائم بخشے جاتے ہیں گے۔ وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتے، اُن کو سزا ضرور دی جائے گی، لیکن اُن پر کفر کے فتویٰ میں احتیاط برتنا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں مسلمان مشرکوں پر جو قانونی شرک میں مبتلا ہیں بہت غصہ کرتے ہیں مگر انہیں کافر نہیں کہتے۔ اسی طرح ”تقویۃ الایمان“ میں حضرت شاہ شہیدؒ کا بھی یہی رویہ ہے۔ مولانا محمد کھوی ”زینت“

الاسلام“ میں اس کی بڑی داد دیتے ہیں۔ توحید کا شرک کفر ہے، دوسرا قانونی شرک جس میں قریش مکہ کا تھے اس کی سزا فردِ ملٹی چاہیے۔ تیسرا درجہ عام جرائم کا ہے جو پھٹے جاسکتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اُس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو اُن کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ جاتا ہے زندگی کے اُن شعبوں کی ترقی اور ترقی کی سبب کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں، لیکن ان کی اگر اقتصادی ضروریات بھی فراہم نہ ہوں اور ان کو وہ سب سے انسان کی جدوجہد اس کی حیوانی ضرورتوں تک محدود ہو جائے تو انسانیت کے اعلا مقامات کا کسے ہوش رہے گا! اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ دنیوی میں انسانیت کے اخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

شیراز کے حکیم شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس سلسلے میں کیا خوب فرمایا ہے:

شب چوں عقد نمازی بندم

چہ خورد بامداد فرزندم

۱۱۱۶۱





نیشنل بک ٹرسٹ پاکستان